اشفاق احمد

سفر در سفر



زوول کوفن سے ایک بڈھا سوئس اور اس کی جوان لڑکی گاڑی میں سوار ہوئے اور میرے سامنے کی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ بڈھے نے بڑا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی ——— لڑکی نے گہرے نیلے رنگ کا کوٹ اور سیاہ رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے ہونٹ بند تھے۔ وہ سیٹ پر بہت آگے ہو کر بیٹھی تھی اور اس کے گھٹنے میرے گھٹنوں کے درمیان آگئے تھے۔ اگر میں اپنی رانیں بند کر لیتا تو اس کے گھٹنے ان کے درمیان آجاتے اور اس کو اپنے باپ کے سامنے اور مولی استانی کے روبرو شرمندہ ہونا پڑتا۔ اس لڑکی کے کالے سویٹر کے نیچے اس کا سینہ یہ بتا رہا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا چپٹے جیسا پیٹ یہ غمازی کر رہا تھا کہ شادی کے آٹھ دس ماہ بعد ہی اس کو طلاق بھی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس پر گہرے غم کا اطمینان تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے بازو سینے پر باندھے بیٹھی تھی۔ بڈھا سوئس اونگھ رہا تھا اور اس کی موٹی ناک پر شریانوں اور وریدوں کے الیکٹرون اور پروٹون کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی اور دائیں بائیں گھاس کے میدان ساتھ ساتھ بھاگے جا رہے تھے۔ دور پہاڑوں پر سرخ چھتوں والے لکڑی کے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے اور مٹیالے آسمان پر اندھیرا لیپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندر کی روشنی حاصل کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور کرنٹ حاصل کرنے کے لیے لڑکی کے زانو سے اپنا گوڈا لگا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کالے سویٹر کا دامن ذرا نیچے کھینچا اور اپنی کمر کو ذرا سا ہلا کر گرڈ اسٹیشن آن کر دیا۔ اندر باہر چکا چوند ہو گئی اور رنگ برنگے

اشتہار جلنے بجھنے لگے۔

بابا سوئس کوئی کُتب فروش دکھائی دیتا تھا جو برن سے نئی کتابیں خرید کر اپنے شہر لیے جا رہا تھا اور جس نے کمیشن میں کافی فرانک بچا لیے تھے۔ اس کے چہرے پر کُتب فروشوں کی سی سیکنڈ ہینڈ ذہانت تھی اور اس کے جسم سے لائبریری کی مخصوص خوشبو آ رہی تھی۔ اس کی لڑکی کی پنڈلیاں بڑی سڈول اور اس کے کندھے کافی کشادہ تھے۔ اگر میں اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیتا تو بھی اس کے کندھے اسی طرح دکھائی دیتے رہتے اور اس کی ٹھوڑی میرے اُلجھے ہوئے بالوں کے باوجود صاف نظر آتی۔ لڑکی کا زانو ٹیلی فون کے کھمبے پر لگی چینی کی گُگّل ایسا تھا۔ سفید اور چکنا اور ملائم اور اس کے اندر سے ٹِک ٹِک کر آواز آ رہی تھی:

"WHEN YOU HEAR THE TONE THE TIME WILL BE SIXTEEN HOURS FORTY ONE MINUTES AND THIRTY SECONDS."

میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔ سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے زانو کا کٹ آؤٹ میرے گھٹنے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً جیب سے سیزن ٹکٹ نکالا اور گلابی رنگ کی پرچی پر نگاہیں جما کر انگلیوں پر دن گننے لگا۔

مجھے فرانس سے چلے آٹھواں دن تھا اور میں نے یہ سارا وقت جنیوا ایسے بیہودہ شہر میں فضول ضائع کر دیا تھا۔ جب میں نے ٹکٹ واپس جیب میں ڈالا تو لڑکی میرے اس بچپنے کو دیکھ کر ذرا اور شدت سے مسکرائی اور اپنی انگلی کا ساٹ بنا کر رخسار پر کھجلی کرنے لگی۔ اس کا قد کاٹھ اور حرکتیں لڑکوں جیسی تھیں، لیکن اس کا جسم گوگوبار کے باہر آئس کریم کھانے والی لڑکیوں جیسا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ، ماتھا فراخ اور ناک ستواں تھا اور کولہے بہت چوڑے تھے۔ وہ جزیرہ سسلی میں بسے بوڑھے عربوں کی نسل سے معلوم ہوتی تھی جنہوں نے وقت گزرنے پر بپتسمہ لے لیا تھا اور گلے میں چاندی کے ہلالوں کے بجائے سنہری صلیبیں لٹکا لی تھیں۔ میں اس کی طنزیہ مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا اور اپنی سیٹ سے اُٹھ کر باہر گیلری میں آ گیا۔ دو کھڑکیاں لکڑی پھول جانے کی وجہ سے جام ہو گئی تھیں اور کھلتی نہیں تھیں۔ میں تیسری کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور سرسبز گھاس کے میدان دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ گاڑی کو بریکیں لگنے لگیں اور تھوڑی دیر میں گاڑی ایک نہایت ہی

مشکل نام کے اسٹیشن پر رک گئی۔ نہ کوئی پلیٹ فارم نہ اسٹیشن کی آن بان نہ پورٹر نہ بابو۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن، ایک خوبصورت سا اسٹیشن ماسٹر، چند سواریاں اور گھاس کا میلوں دُور پھیلا ہوا میدان۔ میں نے بلا وجہ ایک سگریٹ نکالی اور سلگا کر کش لگانے لگا۔ ایک سواری میرے قریب سے گزری اور ہمارا خانہ چھوڑ کر گیلری میں آگے چلی گئی۔ پھر ایک لڑکا اندر آیا اور ہمارے والے خانے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے فریم پر ایک زنگ آلود پیچ باہر نکل آیا تھا۔ میں نے اپنے ناخن سے اس کو گھمایا، تو وہ گھومنے لگا۔ میں نے اس کو اس کی جگہ بٹھانا چاہا، تو وہ ٹائٹ نہ تھا۔ اس کا سوراخ کھوکھلا ہو گیا تھا اور اب وہ زنگ کے سہارے اس میں پھنسا ہوا تھا۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔ میں نے پیچ کو پکڑ کر زور سے کھینچا، تو وہ اپنے سوراخ سے باہر آ گیا۔ اس پر کتھئی رنگ کا زنگ چڑھا تھا اور کسی کسی بل پر نارنجی رنگ کا تازہ زنگ بھی چھٹنے لگا تھا۔ میں نے سوئٹزرلینڈ کے سووینئر کے طور پر وہ پیچ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اگر کسی خوبصورت لڑکی کا وجود آپ کے ذہن پر سوار نہ ہو تو سوئٹزرلینڈ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ باہر کچھ کچھ خُنکی بڑھنے لگی تھی اور دُور دُور تک چیزیں اب صاف بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ گھما کر پھر اندر کی طرف بدل لیا۔ وہی لڑکی مجھ سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

"پارلے وو فرانسے؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"وی۔" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"ڈا کیل پائی ایت وو؟" اس نے پوچھا۔

"پاکستان!" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"پاکستان!" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے ایک منجھے ہوئے گائیڈ کی طرح پاکستان کے بارے میں تمام کوائف بہم کر دیے اور اس کی طرح مسکرانے لگا۔ پھر میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا جسے اس نے کمال محبت اور چاہت کے ساتھ رد کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہلے بہت سگریٹ پیا کرتی تھی لیکن جب سے اس کی طلاق ہوئی ہے اس نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔

مَیں نے کہا: "وہ کون احمق تھا جس نے تمہیں طلاق دے دی؟"

"تھا ایک۔" اُس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سر جُھکا کر کہا۔ "تار کے محکمے میں ملازم ہے، فٹ بال بہت اچھا کھیلتا ہے اور ماؤتھ آرگن بجاتا ہے۔"

"کوئی اور لڑکی؟" ـــ مَیں نے پُوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

"فٹ بال؟"

"شاید نہیں۔"

"ماؤتھ آرگن؟"

"پتہ نہیں ـــ بس ایسے ہی ہم میں طلاق ہوگئی ـــ اس بات کو تو اب چھ مہینے سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔"

"تمہیں یاد آتا ہے؟"

"کبھی کبھی۔"

"اس کے ساتھ گزارے ہُوئے کون سے لمحے سب سے زیادہ یاد آتے ہیں؟"

"جب میں اس کو ٹب میں بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔"

"اس طرح سے تو تمہارے سارے کپڑے بھیگ جاتے ہوں گے؟"

"لو، مَیں اسے کپڑے پہن کر تھوڑی نہلایا کرتی تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا اور مَیں نے سر نیچے جھکا لیا۔

"تمہارے ماں باپ ہیں؟" اُس نے پُوچھا۔

"دونوں ہیں۔"

"ان دونوں میں سے تم کس سے زیادہ پیار کرتے ہو؟"

مَیں نے کہا: "پیار تو مجھے اپنے باپ سے زیادہ ہے، لیکن ہمارے مُلک میں ماں سے محبت کرنے والے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میں اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" اُس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"اس لیے کہ ہماری ماؤں کے پاؤں تلے جنّت ہوتی ہے۔"

"تم لوگ جنّت میں جانے کے اتنے ہی شوقین ہو؟" ـــ اُس نے پُوچھا۔

"ہر کوئی ہے۔" مَیں نے ایک شریف بچّے کی طرح کہا۔ "تم جنّت نہیں جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور ذرا اُداس سی ہو گئی۔

"یہ تمہارے والد ہیں؟" مَیں نے موضوع بدلتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"لینز برگ میں فوک لور میوزیم کے نگران ہیں۔ ہم لینز برگ میں رہتے ہیں۔ دریائے آر کے کنارے۔ تم نے یہ شہر دیکھا ہے؟"

مَیں نے کہا: "دیکھا تو نہیں، لیکن اس کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔"

"بھلا کیوں مشہور ہے یہ شہر؟"

"اس لیے کہ سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر ہے اور سوئٹزرلینڈ دُنیا کا سب سے خوبصورت مُلک ہے۔"

"جھوٹے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "بگڑی گئی ناچوری۔ لینز برگ میں ٹن فوڈ تیار ہوتا ہے۔ اچار، مُربّے، سُوپ، گوشت ... تمہارے مُلک میں سُوپ کے ٹن آتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" مَیں نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہم سب وہی سُوپ پیتے ہیں۔"

اتنے میں فانوس کی اور گیلری کی بتیاں جل گئیں اور ہمارے ہیولے واضح ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا:

"ادھر کونے میں آجاؤ دروازے کے پاس۔"

جب ہم کونے میں دروازے کے پاس پہنچے، تو ٹائیلٹ کا دروازہ کُھلا تھا اور اندر واش بیسن کے اُوپر آئینہ جگمگا رہا تھا۔

مَیں نے کہا: "دیکھو آئینے میں تمہاری صُورت کیسی خُوبصورت نظر آرہی ہے۔"

"میں ویسے خوبصورت نہیں ہُوں؟" اس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"ویسے بھی ہو۔ ویسے کیوں نہیں ہو۔۔۔" میں نے شرمندگی کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو تم بہت ہی خوبصورت ہو، لیکن میرا مطلب تھا۔۔۔ سٹ آ دیر۔۔۔ گریائم۔۔۔" پھر میں رُک گیا اور اس کی کمر پہ ہاتھ کا دباؤ ڈال کر بولا۔ "یہ پلاسٹک کا بنا ہے؟"

"ہاں!" اُس نے ہولے سے کہا۔

"اور یہ الاسٹک ہے؟"

"ہاں الاسٹک ہی ہوتا ہے! تمہارے مُلک میں الاسٹک نہیں ہوتا؟"

میں نے کہا: "وہاں عورتیں اپنے ہاتھ سے سی کر پہنتی ہیں۔ الاسٹک کے بجائے ڈوریاں پہنتی ہیں۔"

اسے ان ڈوریوں سے ذرا اُلجھن سی آئی اور اس نے ناخوشی کے انداز میں سر کو دو مرتبہ جھٹکا۔ میں نے اس کے دونوں رُخسار اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔ اُس نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دانت صاف کیے تھے اور اُس کے مُنہ سے دہان کی خوشبو آ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اس کی جلد بڑی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھی۔ میں نے روم آنے سے پہلے داتا صاحب کے ایک ستون کو چُوما تھا۔ وہ بھی ایسا ہی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھا۔ اس نے میرے کوٹ کے بٹن کھول کر اپنے بازو اندر ڈال دیئے اور رونے لگی۔ داتا دربار بڑی عمر کا ایک آدمی اسی طرح رو رہا تھا۔ نہ اس کی آواز آتی تھی نہ اس کا بدن ہلتا تھا، پھر بھی وہ رو رہا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور آہستہ سے کہا: "دیکھو!"

اور جیپ کے پیچھے سے ممتاز مفتی کی کڑکدار آواز آئی: "دیکھو شاہ جی دیکھو!"

میں نے کہا: "ہاں جی دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ کوائی ہے اور یہ کوائی کے پہاڑ ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

عمر نے میرے کندھے پر دو ہتڑ مار کر کہا: "سر اُوپر اُٹھا کر پہاڑوں کا نظارہ کر۔ کاغان کی وادی شروع ہو گئی ہے۔"

میں نے اسی طرح سر جھکائے کہا: "اچھا — جی!"

مسعود نے کہا: "یہ سالا یہاں بھی اپنے لاہور کو ساتھ اُٹھائے پھرتا ہے۔ او یے کیا سوچ رہا ہے؟"

میں نے کہا: "لاہور نہیں یار، میں سوئٹزرلینڈ کو یاد کر رہا ہوں۔"

"لعنت سوئٹزرلینڈ پر۔" عمر جل کر بولا۔ "اُن پہاڑوں میں اور اُن سڑکوں پر ایسا خوف ملتا ہے؟ ایسی دہشت ملتی ہے؟"

"میں نے کہا خوف تو نہیں ملتا لیکن خوفناک لڑکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔"

"آپ کو ملی تھی شاہ جی؟" عماد نے پوچھا۔

مفتی زور سے ہنسا اور اپنے ہاتھ پر تالی بجا کر کہنے لگا

مکے گئے، مدینے گئے، کربلا گئے!

جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے

میں نے کہا: "یارو میں ایسا گیا گزرا بھی نہیں، اگر مجھے سوئٹزرلینڈ میں گاڑی میں سفر کرنے کا چانس ملتا، تو ضرور کوئی نہ کوئی لڑکی مجھ کو ملتی۔"

"تو پھر آپ نے گاڑی کو پسند کیوں نہ فرمایا؟" اعظمی نے پوچھا۔

"اس کی ایک وجہ تو یہ ہے اعظمی کہ میرے پاس کرایہ کم تھا اور مجھے ہچ ہائکنگ کرنی پڑتی تھی اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں یورپ کی لڑکیاں اس قدر ایڈوانس نہیں تھیں۔"

اس پر پانچوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جیپ کا ڈرائیور شیر باز بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

عمر نے کہا: "دیکھو، یہ سڑک شوگران کو جاتی ہے۔ بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔ سرسبز گھاس کے تختے، چیڑ کے خوشبودار درخت اور کچی مٹی کا پہاڑ، پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ واپسی پر تمہیں دکھائیں گے۔"

"واپسی پر تو انہیں جب نظر آ سکے گا جب یہ اپنے لاہور کا ساتھ چھوڑیں گے۔" عماد نے کہا۔ "شاہ جی لاہور کو چھوڑ دو۔ کنہار کا نظارہ کرو۔ دیکھو دریا کی تندی۔"

"اِدھر اس سڑک پر صیب ہمارا ہی کام ہے جیپ چلانا۔ کوئی دُوسرا شخص ایک منٹ کو نہیں چلا سکتا۔ بالکل ڈینجرس ہے۔"

میں نے کہا: "شیرباز، تم آگے نظر رکھو، میری طرف مُڑ کر بات نہ کرو۔"

"کوئی بات نہیں صیب، ہم کو پریکٹس ہے۔"

بالاکوٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مزار جسے ہم شام کے وقت دیکھنے گئے تھے اور پتھروں پر چلتے چلتے میرے بُوٹ کی ایڑی ٹوٹ گئی تھی۔ مٹی کوٹ کا نالا کافی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جابجا چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے اور قدِ آدم چٹانیں اِدھر اُدھر ایستادہ تھیں۔ اسی مقام پر سید احمد شہیدؒ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ کیا خبر وہ پہاڑی اِس جانب سے اُترے ہوں یا شاید اُس پگڈنڈی پر سے اُترے ہوں۔ ممکن ہے سکھوں نے اس ٹیلے کے عقب سے حملہ کیا ہو اور ان کی دُوسری ٹکڑی سامنے سے آگئی ہو۔ کچھ دیر لڑائی ترازو کے تول تھی، پھر کانٹا بدلنے لگا۔ امیرالمؤمنین سید احمد شہیدؒ خود ایک مورچے پر لڑ رہے تھے۔ اب یہ جنگ کا میدان نہیں رہا تھا، بلکہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر چھوٹی چھوٹی رزم گاہیں بن گیا تھا۔

رحیم بخش بنارسی حضور کے جانثاروں میں سے تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارے آگے سوا سو قدم پر سکھوں اور غازیوں کا ہجوم تھا اور اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ حضرت امیرالمؤمنین اس ہجوم کے اندر ہیں۔ پھر ہم تینوں نے یعنی میں نے، اللہ بخش باغپتی نے اور رسول خاں جلالہ والا نے صلاح کی کہ آؤ ہم بھی وہاں چلیں جہاں حضرت امیرالمؤمنین ہیں۔ اس وقت گولیوں کا مینہ برس رہا تھا اور کارتوسوں کے کاغذ ساری فضا میں تیر رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم اُدھر کو بھاگے، لیکن اس عرصے میں لڑائی شکست ہوگئی۔ اس آخری معرکے میں میاں لکھیرا، رحیم بخش بنارسی سے ذرا آگے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین سکھوں کو مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے داہنے طرف نالا تھا۔ چھ آدمی ہمارے اس نالے سے ہو کر حضرت امیرالمؤمنین کے پاس چلے گئے۔ اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہو کر نامرخان بہت گرام کے آئے۔ اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ حضور اُس ہجوم میں تشریف رکھتے ہیں۔

جیپ جبرید کی طرف جا رہی تھی اور راستے میں جگہ جگہ گوجر، گوجرانیاں، ان کے بچے اور بھیڑوں

کے گلّے ملتے تھے۔ شیرباز کہہ رہا تھا:

"یار جی بہت غریب لوک ہیں اس علاقے کے۔ خُدا کی شان ہے۔ اُس کے آگے بولا نہیں جاتا۔ وہ دیکھتا ہے ہم اپنا فرض کس طرح سے پورا کرتے ہیں۔"

مسعود کہہ رہا تھا: "واہ واخان بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے بھی بہت سے فرض ہیں۔ ہم پر بھی بڑے کڑے حکم ہیں۔"

دریائے کنہار دیوانوں کی طرح پتھروں اور چٹانوں سے سر پھوڑ رہا تھا۔ ہم بلند ہو رہے تھے۔ دریا کئی ہزار فٹ نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا: "یار، یہ علاقہ ازل ہی سے اسی طرح کا ہوگا یا مختلف ہوگا؟"

عُمر نے کہا: "تُو بھی بڑا گھگھو آدمی ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ روزِ ازل سے یہ پہاڑ اسی طرح کھڑے ہیں۔ نالے اسی طرح بہہ رہے ہیں۔ برف ایسے ہی گرتی ہے۔ گلیشیر اسی طرح راستے روکتے ہیں۔ تو سمجھتا ہے یہ علاقہ تیرے پٹھانوں نے بنایا ہے؟"

میں نے کہا: "یار میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا، میں نے اس کا اعلان کر دیا۔"

مُفتی نے کہا: "بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اس وقت ہم آزاد ہیں۔ یہ پندرہ دن بالکل ہمارے ہیں۔ اس میں ہر طرح کا اظہار اور ہر طرح کے اعلان کی اجازت ہے۔"

"لیکن احمقانہ خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں۔ پہاڑوں کو دیکھو، ہائے ہائے وہ دُور کنچن جنگا کی برف پوش چوٹیاں ہیں۔"

مجھے جب بھی عمر کی طرف سے جھڑکی ملتی ہے تو مسعود بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "لیڈر کے حکم کے بغیر تُو کسی بات کا برملا اظہار نہیں کر سکتا۔ دل میں البتہ سوچ سکتا ہے۔"

"دل میں سوچنے لگا، تو یہ پھر گیا۔" مُفتی نے کہا۔ "یہ پہاڑوں میں بھی اپنی دُنیا ساتھ لے آتا ہے۔"

"بس اسی لیے ہم اس کو سفر پر لانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سالا کھونڈ بے پروا نہیں ہے۔ ادیب نہیں ہے سکرپٹ رائٹر ہے۔"

عماد جو ہم سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور فرزانہ شخص ہے، اپنے وجود میں دیوانگی کی ایک جھریٹ بھی رکھتا ہے۔ اس کا پیشہ الیکٹرانکس ہے! اس کی تعلیم مغربی ہے۔ اس کا دماغ تجزیہ پسند ہے، لیکن اس کے دل پر ابھی تک اس کے ان پڑھ باپ دادے کا قبضہ ہے۔ کبھی کبھی ان کا ہاتھ اس کے دل پر سے چھوٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی پھر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی چھڑی سے ماتھا اُٹھا کر کہا:

"یارو، شاہ صاحب نے ایک معمولی سی بات پوچھی کہ علاقے روزِ ازل سے اسی طرح کے ہیں یا بدلتے رہتے ہیں۔ تم لوگ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔"

اعظمی نے کہا: "شاباش، لڑاؤ شاہ جی کو مولوں سے۔"

عماد بولا: "ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے زمانے میں وقت کے بادشاہ سے حضرت خواجہ خضر کی ملاقات ہوئی — بادشاہ نے فرمایا: "یا حضرت جو کچھ عجائبات آپ نے اپنی عمر میں دیکھے ہوں، میرے روبرو بیان کرو۔"

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: "میں نے بہت کچھ عجائبات دیکھے ہیں، مگر اس وقت جو کچھ حاضر ہے اُس کا بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں ایک شہر میں وارد ہوا جہاں خلقِ عظیم تھی اور عماراتِ بلند سے آبادی تھی۔ پس میں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ یہ تعمیرات کس زمانے میں ہوئیں۔ اس نے کہا یہ شہر قدیم ہے اور مجھے نہ میرے باپ کو نہ میرے دادا کو اس کے آغاز اور اس کی بنا کا حال معلوم ہے۔ شروع سے ایسا ہی آباد اور قائم و دائم ہے۔ پس پانچ سو برس بعد میرا پھر گزر اس شہر سے ہوا، تو وہ شہر ویران نظر آیا۔ یہاں تک کہ ایک اثر بھی آثارِ عمارت میں سے باقی نہ تھا۔ وہاں ویرانے میں ایک مرد گھاس کھود رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا یہ شہر کب خراب ہوا۔ اُس نے کہا: میں نے یہ شہر ہمیشہ ہی خراب دیکھا ہے۔ میں نے کہا: یہ شہر کبھی آباد بھی تھا؟ اُس نے کہا ہرگز نہیں۔ یہاں کی آبادی کا حال نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نہ میرے باپ نے یا میرے دادا نے یا اُس کے دادا نے اس کا تذکرہ کیا۔ پس میرا گزر پانچ سو برس کے بعد دوبارہ ہوا تو دیکھنے میں آیا کہ وہ سرزمین ساری عالمِ آب ہو گئی تھی اور ماہی گیر اس میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اُن سے دریافت کیا کہ کب یہ زمین دریا برد ہو گئی؟ اُنہوں نے جواب دیا افسوس

تم بہت ہی بے خبر ہو جو ایسے کلام کرتے ہو۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے عالمِ آب ہی رہی ہے۔ کبھی یہاں کی خشکی کا حال اپنے باپ دادا سے نہیں سُنا۔ پانچ سو سال بعد پھر میرا اُدھر سے گزر ہوا تو دریا خشک ہو کر زمین برآمد ہوئی۔ کاشت کار اس میں کھیتی باڑی کر رہے تھے اور عورتیں گھاس کے پولے باندھ رہی تھیں۔ میں نے دریافت کیا کہ کب سے یہ زمین پانی سے نکل ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمیشہ سے ہی زمین رہی ہے۔ پس پوچھا یہاں کوئی دریا نہ تھا۔ اُنہوں نے کہا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ اپنے باپ دادا اور بزرگوں سے سُنا۔ الغرض اس کے بعد بھی جب پانچ سو سال بعد میرا جانا ہوا، تو ایک عظیم الشان شہر وہاں نظر آیا۔ بڑے بڑے مکان عمدہ سرائیں، تاجروں کے قافلے اور خوش پوشاک لوگ۔ پس وہاں کے لوگوں سے میں نے اس شہر کے آغاز و بنیاد کا حال دریافت کیا، تو اُنہوں نے جواب دیا کہ بھائی یہ شہر تو ایسا ہی آباد تھا۔ ہمیں اس کے بنا کی تاریخ معلوم نہیں۔"

عماد کی بات سُن کر تھوڑی دیر حبیب میں خاموشی رہی، پھر عمر کہنے لگا: "یہ سب داستانیں ہیں۔ میں خواجہ خضر وغیرہ کو نہیں مانتا۔"

مفتی نے کہا: "نہ مانو عمر جی، بات پر غور کرو۔ بات ماننے والی ہے۔"

اعظمی نے کہا: "یار مفتی! اب تو پنڈی سے باہر کے لوگوں کو بھی علم ہو گیا ہے کہ تو نہایت ضعیف الاعتقاد ادیب ہے۔"

مفتی نے ہنس کر کہا: "میں ادیب بالکل نہیں، صرف ضعیف الاعتقاد شخص ہوں۔"

"اور وہ جو تیرا والد فرائیڈ تھا جس کی تو حرامی اولاد ہے وہ؟" عمر نے پوچھا۔

"وہ تو" مفتی نے سر کھجا کر کہا: "اس سے تو میں نے علم حاصل کیا ہے۔ دراصل میں ایک HIGHLY EDUCATED SUPERSTITIOUS MAN ہوں۔"

مسعود نے قہقہہ مار کر کہا: "لو بٹ لو کیا پٹتے ہو۔"

تیسر باز نے کہا: "یار جی! اس علاقے کے لوگ بڑے ہی غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔ سامنے ایک بچہ اور اُس کی ماں جا رہے تھے۔ بچے کی گود میں ایک چتلی مرغی تھی اور عورت کے سر پر میلے جھکڑ جزدان میں لپٹا ہوا قرآن تھا۔ جب ہم اُن کے قریب سے گزرے تو تیر باز نے

سنیر نگ سے دایاں ہاتھ چھوڑ کر اپنی انگلیوں کو چوما اور باری باری دونوں آنکھوں سے لگایا۔ میں نے سگریٹ کا ٹوٹا لڑکے کے پاؤں کے پاس پھینک دیا۔

شیرباز نے کہا: "اس بچے کی ساری دولت یہ مرغی ہے۔ یارا جی بہت غریب لوگ ہیں اس علاقے کے۔"

عمر نے کہا: "اس سے مرغی خرید لیں، ناران چل کر روسٹ کریں گے۔"

مسعود نے کہا: "نہیں یار! اس کی پالتو معلوم ہوتی ہے۔"

لیڈر بولا: "اسی لیے تو خرید رہے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد ہو جائے گی۔"

شیرباز نے کہا: "یارا جی پوچھ لیتے ہیں ناں — اوہ الاکا،" لڑکا سہم گیا اور اس کی ماں نے قرآن شریف سر سے اتار کر اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ "اوئے مرغی بیچے گا؟" لڑکے نے نفی میں سر ہلایا تو عماد نے پوچھا:

"کیوں نہیں بیچتا؟"

لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا: "جی یہ میری مرغی ہے۔ میں اس کو انڈوں پہ بٹھاؤں گا۔"

"تو اب اس کو کدھر اٹھائے پھرتا ہے؟" شیرباز نے دریافت کیا۔

"جی یہ بیمار ہے اس کو دم کروا کے لا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" مفتی نے کہا، پھر اپنی جیب سے تمباکو والا پان نکالا، ساتھ ہی ایک روپیہ بھی۔ روپیہ لڑکے کو دے کر مفتی نے پان منہ میں رکھ لیا اور ڈرائیور سے غڑغوں آواز میں کہا:

"چلو جی۔"

اعظمی نے سر ہلا کر کہا: "یار یہ مفتی بڑا نیک آدمی ہے۔ روپیہ روپیہ خیرات کرتا ہے کم نہیں۔"

مفتی کے منہ میں پان تھا اور پیک سے اس کے گلے پھول گئے تھے، نہیں تو وہ کوئی جواب ضرور دیتا۔

جریدہ میں ہم تھوڑی دیر کے لیے رکے — شیرباز نے کہا: "یہاں اخروٹ کی لکڑی سیزن کرنے کا کارخانہ ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنتا ہے۔ آؤ آپ کو دکھلاؤں۔"

ہم نے کہا: "چائے کہاں سے پئیں؟"

"چائے ادھر نہیں جی۔" شیرباز بولا: "چائے کاغان میں چل کر پئیں گے۔ ادھر میرے گرائیں کا ایک ہوٹل ہے۔ بہت فسٹ کلاس چائے بناتا ہے۔"

ہم اس کی فرمائش پر فرنیچر کا کارخانہ دیکھنے چلے۔ ایک اونچی پہاڑی پر ٹین کی چھت والے بڑے بڑے ہینگروں میں لکڑی کا کام ہو رہا تھا۔ کچھ تختے سوکھ رہے تھے۔ کچھ کو آگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ ایک بڑھئی پھٹے رندہ رہا تھا اور آٹھ آٹھ آدمی چھریوں اور ہتھوڑی سے اخروٹ کی لکڑی پر پھول پتیاں کھود رہے تھے۔ شوروم میں تیار مال پڑا تھا۔ پلنگ کے چھپرکٹ کی قیمت تین سو روپے تھی۔ اس کی پشت کے تختے پر انگوری بیل کھدی ہوئی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹا سا خوبصورت دائرہ تھا۔ دونوں پٹیوں پر نازک سی بیل کھدی تھی اور چولیں بڑی صفائی کے ساتھ بٹھائی ہوئی تھیں۔

عمر نے شوروم انچارج سے پوچھا: "ڈبل بیڈ نہیں بناتے؟"

عماد نے اپنی سوٹی عمر کے گلے میں ڈال کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور کہا: "اوئے شرم کر! اس عمر میں ڈبل بیڈ؟"

مفتی نے کہا: "اس عمر میں تو ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔"

شوروم انچارج ہماری کھلی باتوں کو سن کر کچھ محجوب سا ہو گیا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

مسعود نے کہا: "یار، یہ فرائی فروٹ ٹرے بڑی سستی ہے۔ بڑی چودہ روپے کی اور چھوٹی چھ روپے کی۔"

"ایک ایک سب کے لیے لے لو۔" مفتی نے مشورہ دیا، تو شیرباز نے کہا: "واپسی پر لینا یارا جی۔ اس وقت کہاں اٹھائے پھرو گے؟"

ڈریسنگ ٹیبل سب کو پسند آیا۔ چھ درازیں، ملائم سطح، آئینے کے لیے بیل دار فریم قیمت کل پانچ سو روپے۔ اس میں آئینہ نہیں لگا تھا، لیکن ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی محبوبہ کا چہرہ اس میں صاف نظر آیا۔ کبھی وہ محبوبہ بیوی بن جاتی۔ کبھی پھر محبوبہ کا روپ دھار لیتی۔ اس کے

کندھوں پر ہمارے ہاتھوں کا دباؤ تھا۔ آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ کنپٹیوں پر عُمر رسیدگی کے آثار تھے۔ جیب میں پچھلی تنخواہ کے بچے ہوئے کچھ نوٹ تھے۔ دل میں ریٹائرمنٹ کا کمپیوٹر چل رہا تھا۔ محبوبہ کے بال لمبے تھے اور چہرے پر کریم مل رہی تھی۔ عُمر کے آثار اس کی آنکھوں کے نیچے نمایاں ہو رہے تھے، لیکن اس کی مسکراہٹ بڑی فرشی تھی ـــ ہم وہاں سے کچھ خریدے بغیر باہر نکل آئے۔ پہاڑی سے اُترتے ہوئے عُمر نے شوروم انچارج سے پھر پوچھا کہ اگر ڈبل بیڈ کا آرڈر دیا جائے، تو کیا بنا سکو گے؟

انچارج نے کہا: "بنا تو دیں گے، لیکن آپ کو لے جانے میں بڑی دِقت ہوگی۔ جیپ پر اتنا بڑا بیڈ کسا جا نہیں سکے گا۔"

"جائے گا کیسے نہیں یارا" شیرباز نے کہا: "ہم کھول کر لے جائیں گے۔"

جریدے کے بعد پھاگل آیا یا اس سے پہلے، مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔ میری آنکھوں میں ابھی تک آئینے کے اندر دیکھی ہوئی صورت گھوم رہی تھی۔ دائیں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ تھے۔ بائیں جانب لپکتے ہوئے نشیب اور گہری کھڈیں۔ میری نگاہیں سامنے دو بالشت چوڑے راستے پر تھیں، لیکن گوشۂ چشم سے مجھے اردگرد کے نظارے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ترائی میں ایک بھولا سا بچّہ بکریوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر دُھوپ کی ایک رُوپہلی کرن ناچ رہی تھی۔ میں جس کا دل جریدے سے چلتے وقت پانی سے بھرے ہوئے اسفنج کی طرح بے قابو ہوگیا تھا، اس لڑکے کو دیکھ کر اور بھی آزردہ ہوگیا۔ وہ بڑا معصوم اور بھولا بھالا تھا اور اُس کو اپنی یا اپنے والدین کی یا میرے غم کی کوئی خبر نہ تھی۔ مجھے اس پر پیار آیا۔ بکریاں اس کے اردگرد چر رہی تھیں اور اسے کسی بات کا بھی علم نہ تھا۔

اُچے اُچے تِکھے تِکھے کالے شاہ پہاڑ
سوگ وچ ڈُبی ہوئی بھردی کہن بارا جھاڑ
جیپ جان دی گھوکر اندر
ٹانویں ٹانویں جھُگے
بدلے وڑے گھر

ٹیڈھی راہ تے بیٹھاں تکدیاں ربّ وی جائے ڈر
پتھر اُتے تیڑ ولی ننگا اِک کا کا کا کا
بکریاں واڑا کیا
بے خبرا انجان
اپنی گل نہ سمجھے
اپناں وی نہ جانے
رات نوں سوون لگی
تُوں جدوں دوپٹہ لاہویں
کیہڑے پاسے رکھیں
کیہڑے پاسے سوویں

عُمر نے نعرہ مار کر کہا: "او شاہ جی سو گئے او۔"

میں نے آہستہ سے کہا: "نہیں جی جاگ رہا ہوں۔"

مسعود نے کہا: "پھر واپس لاہور پہنچ گئے ہو؟"

میں نے کہا: "نہیں یارا تمہارے ساتھ ہوں۔ وادی میں۔"

"تو پھر اس وقت کہاں تھے؟" اعظمی نے پوچھا۔

میں نے کہا: "بکریاں چرا رہا تھا اُس بچے کے ساتھ۔"

"ہیں؟ بچہ؟" اعظمی نے تڑپ کر پوچھا۔ "کون بچہ؟"

"سوُر کا بچہ" عُمر نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "نہیں یار، وہ بیٹھا ہے۔"

سب نے پلٹ کر دیکھا۔ بھولا بچہ ابھی تک پتھر پر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر ابھی تک وہی روپہلی کرن ناچ رہی تھی۔

گوجروں کے قافلے میدانوں سے واپس پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی گرمی نہیں دیکھی۔ یہ حدت اور دُھوپ اور اس سے ناآشنا ہیں پہاڑ یا

پھر دُور دُور اپنی بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ اسی گلہ بانی کے سہارے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب اُونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پہ پہلی برف باری ہوتی ہے تو یہ اپنے ریوڑ ہانک کر نیچے اُترنے لگتے ہیں۔ سردی ان کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں سفید بلی کی طرح لپکتی آتی ہے اور یہ آگے آگے نچائیوں اور ڈھلوانوں پر اُترتے جاتے ہیں۔ نومبر دسمبر تک پاپیادہ چلتے یہ مانسہرہ، نوشہرہ، بالاکوٹ اور حویلیاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ گوجر راولپنڈی تک بھی آتے ہیں، لیکن اس سے آگے نہیں۔ یہاں پہنچتے پہنچتے مارچ کا مہینہ آ جاتا ہے، پھر گرمیوں کا تپا ہوا سُرخ بھاگ کر اپنے روند پر لپکتا ہے۔ گوجر اپنا مال مویشی جمع کر کے اُوپر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیچھے پیچھے گرمی۔ آگے آگے گوجروں کے قافلے اور ریوڑ۔ گرمی اور ان کے درمیان آٹھ دس میل کا فاصلہ رہتا ہے۔ کاغان پہنچنے پر گرمی کا گجیلا تھک ہار کر چٹانوں کے اندر سو جاتا ہے اور یہ گھاس پُوٹی کی تلاش میں آگے نکل جاتے ہیں۔

ان کی ساری دولت ان کے گلّے ہیں۔ ان کا سارا حُسن ان کی عورتیں ہیں۔ ان کی ساری کاہلی ان کے مرد ہیں اور ان کی ساری چوکسی ان کے کتّے ہیں۔ یہ لوگ پتھر اور دھات کے زمانے سے ذرا بعد کے ہیں اور کاشت کاری اور کھیتی باڑی کے عہد سے پہلے کے ہیں۔ جہاں خُود رو سبزہ ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں، جہاں گھاس کے میدان ہوتے ہیں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ دُنیا کے اور کسی مُلک میں اس قدر قدیم اطوار کی اور کوئی قوم آباد نہیں۔ انتھروپولوجی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان میں گہری دلچسپی ہے، لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے مجھے ایسے معاشرتی گروہ اچھے نہیں لگتے۔ کہانیاں لکھنے والوں، داستانیں سُنانے والوں اور فلم سازوں نے خانہ بدوشوں کی زندگیوں پر ایسی ایسی کہانیاں وضع کی ہیں کہ مجھے زہر لگتی ہیں۔ ایک خانہ بدوش دوشیزہ اور ایک شہری بابو کے درمیان جب محبت کا ڈول ڈالا جاتا ہے، تو مجھے ابکائی آنے لگتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کبھی بھی COMMUNICATION نہیں ہو سکتی اور جہاں کمیونی کیشن نہ ہو، وہاں محبت کس طرح ہو سکتی ہے؟ بھیڑ بکریاں چرانے والی یاغستانی لڑکی یا اُونٹ چرانے والی بلوچی دوشیزہ سے تھرٹین ہنڈرڈ ڈاٹسن چلانے والا اور اکائی پر ہائی فائی میوزک سُننے والا کس طرح سے محبت کر سکتا ہے یا اس کے حُسن سے کس طرح

متاثر ہو سکتا ہے؟ جو نوجوان ٹیلیویژن کے ذریعے اشتہاروں کا ہیرو ہو، وہ بُو بُو با کرنے والی ان پڑھ چرواہی سے کیسے متکلم ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ وہ کس زبان میں گفتگو کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کس طرح ڈوئٹ گا سکتا ہے؟

"پہاڑی کوّے شاہ جی،" مسعود نے جیپ کا پردہ اُٹھا کر باہر دیکھتے ہوئے کہا: "ڈوئٹ گا رہے ہیں۔"

مُفتی نے کہا: "یہ ڈوئٹ نہیں چن جی، یہ ان کا سوان سانگ ہے۔ اس سے آگے نہیں ملیں گے۔"

عمّاد نے کہا: "کوّوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ اس پر کینیڈا کے زوولوجیکل سنٹر میں بڑی ریسرچ ہوئی ہے اور ماہرین نے اس سلسلے میں تین تھیوریاں قائم کی ہیں۔"

عمر نے چیخ کر کہا: "لعنت لعنت۔"

مسعود بولا: "تو علموں بس کریں او ئے یار!"

لیکن مُفتی نے کہا: "یار اس کو بات کرنے دو، کالا علم تو آیا نہیں، شاید کالے کوّے کا علم ہی نصیب ہو جائے۔" اس پر سب نے احتجاج کیا، اور عماد کو اپنے علم کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔

اب کاغان کی بستی قریب آ رہی تھی اور پہاڑ کے دامن میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر گھروندوں اور جھونپڑوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ شیرباز نے جیپ روک کر کہا:

"یا راجی وہ پُل دیکھو، اُدھر دریا کے اُوپر۔"

ہم نے ترپال سے گردنیں نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کوئی پُل نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر ترپال کی ایک سائیڈ اُٹھا دی اور کہا:

"وہ جی وہ... وہ دیکھو اُدھر پہاڑ کے پاس ایک آدمی پُل پر سے گزرنے لگا ہے۔"

ہم نے دیکھا۔ دریا کے اُوپر سٹیل کا رسّہ تنا ہوا اور اس پر ایک پھرکی دار پیڑھی چلتی تھی۔ اس آدمی کے ساتھ ایک لڑکا تھا جس نے ایک پوٹلی اُٹھا رکھی تھی۔ آدمی کی گود میں سفید رنگ کا ایک لیلا تھا۔ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے ملے۔ پھر وہ آدمی لیلا لے کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

بیٹے نے پوٹلی اُس کی گود میں دے دی اور پھر کی دار بیڑی جی کف اڑاتے، شور مچاتے، دریا کو عبور کرنے لگی۔ آدھی راہ تک بیڑی اپنے زور میں پھسلتی گئی، لیکن دریا کے عین بیچ LOOP پر اٹک کر رک گئی۔ اُس آدمی نے ایک ہاتھ لیلے پر رکھا اور دُوسرا ہاتھ بڑھا کر اُوپر اسٹیل کے رستے کے پاس لٹکتی ہوئی ایک رسّی پکڑ لی۔ وہ آہستہ آہستہ اس رسّی کو کھینچتا تھا اور اس کی بیڑی میں ایک ایک فٹ دو دو فٹ ہو کر آگے کو بڑھتی تھی۔

شیرباز نے کہا: "یارا جی! یہاں کے لوگ بڑے غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے ان کے لیے کوئی پل بھی نہیں بنا۔ بس جو چیز انگریز بنا کر چھوڑ گیا تھا وہی باقی ہے"۔

مسعود نے کہا: "انگریز بڑا حرامی تھا خان! تم انگریز کو نہیں جانتے"۔

"کیوں نہیں جانتا جی، جانتا ہوں" شیرباز نے یقین کے ساتھ کہا: "میں نے خود انگریزوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ بڑا بدبخت حرامی تھا"۔

پھر ہم نے جیپ کے اندر گردنیں کر لیں اور شیرباز بسم اللہ پڑھ کر موٹر چلانے لگا۔ میں نے کہا: "ہم ناران کس وقت پہنچ جائیں گے؟"

"یس جی کوئی انشاء اللہ جمعہ کی نماز تک پہنچ جائیں گے، خدا کے فضل کے ساتھ"۔

"اوہو، آج تو جمعہ ہے مسعود!" عماد نے گردن گھما کر کہا۔

"بسم اللہ" مسعود سر ہلا کر بولا: "جمعہ پڑھیں گے انشاء اللہ۔ ناران کی مسجد میں پڑھیں گے"۔

"شاباش جی یارا، خدا خوش رکھے" شیرباز نے خوش ہو کر کہا: "جمعہ ضرور پڑھنا جی۔ ادھر کے لوگ بہت راضی ہوں گے سمجھیں گے آپ ان کے بھائی ہیں، ان کے عزیز رشتے دار ہیں۔ کسی کا دل رکھنا بڑی نیکی کا کام ہے جی"۔

مفتی نے کہا: "یارا میں نے کبھی جمعہ نہیں پڑھا۔ میں تو آپ سے معافی چاہوں گا"۔

"ہاں جی ہاں" شیرباز نے کہا: "ایسا نہ کرنا۔ خدا کا آپ پر بڑا فضل ہے۔ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے کہ شہر سے ہمارے بھائی آئے ہیں۔ ہمارے پنجاب کے بھائی"۔

میں نے کہا: "بھائی تو ہم اُن کے ہیں، شیرباز! نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے!"

"تو جی فرق پڑتا ہے ناں" شیرباز نے آہستہ سے کہا: "بھائی کی شکل بھی بھائی سے ملتی ہو اس کی عادت ملتی ہو، بات چیت ملتی ہو، پھر ہی بھائی ہو سکتا ہے۔ اُدھر بہت ٹورسٹ لوگ آتا ہے یارا۔ وہ بڑا ٹھاٹ پھرتا ہے۔ گھڑ سواری کرتا ہے۔ بڑا خوبصورت رنگ دار پوشاک پہنتا ہے، پر اس کی شکل ناران کے لوگوں سے نہیں ملتی۔ سلاما لیکم بولتا ہے، پر اس کا ڈیزائن دُوسرا ہوتا ہے۔ اس لیے اِدھر کے لوگ اس کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے"۔

"تو پھر کس کا بھائی سمجھتے ہیں؟" عماد نے پوچھا۔

"وہ یارا جی" شیرباز نے ہنستے ہوئے کہا، "اس کو دوسرے ٹورسٹ کا بھائی سمجھتے ہیں جو ولیت سے آتا ہے۔ امریکیوں سے آتا ہے۔ آپ جمعہ پڑھنے ضرور جانا۔ ان لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ پنجاب کے بھائیوں کی یہ عادت ہمارے جیسی ہے"۔

"پنجاب کے بارے میں تمہارے خیالات کچھ اچھے نہیں شیرباز" اعظمی نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی ہاں۔ خدا کی قسم۔ ہم سرحد کے لوگ تو پنجاب سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑا خوشی کرتے ہیں پنجاب پر۔ لاہور نے بڑا زبردست مقابلہ کیا ہندو کا... وہ کیا بولتا ہے تھا اس توپ کو..."

"رانی"۔ مجھے فوراً یاد آ گیا۔

"ہاں جی! رانی رانی۔ بڑا زبردست جان ماری کیا رانی نے۔ ہم اِدھر قصہ خوانی میں روز شام کو رانی کی بات کیا کرتے تھے"۔

مسعود نے منہ بنا کر کہا:

"خان یہ رانی کو چلا تا رہا ہے"۔

"خا یارا زندہ باد جی" جیپ کو ایک دم بریک لگی۔ "آپ ملٹری کا آدمی ہے؟"

"نہیں بھائی ہم ہیں ملٹری کا کوئی آدمی نہیں۔ ہم سب ریڈیو کے آدمی ہیں" اعظمی نے منہ بنا کر کہا۔ "رانی ایک کیفردل آرٹسٹ تھی، اس کا ذکر ہو رہا ہے"۔

اس پر سب ہنسنے لگے تو شیرباز [illegible] سا ہو گیا، تو عماد نے سنجیدگی سے کہا: یارا اپنی

انسٹی ٹیوشن کو اس طرح بدنام نہیں کرتے۔"

ذرا سی دیر کو جیپ میں خاموشی رہی اور پھر ہم بدنامی کا داغ لے کر کاغان کے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اس گاؤں میں کچھ کچے پکے چھوٹے چھوٹے گھروندے ہیں جو چٹانوں کی اوٹ سے نظر نہیں آتے۔ کچھ کوٹھیاں ہیں جو اپنی لمبی چھتوں اور رنگین دیواروں کی وجہ سے صاف نظر آتی ہیں۔ یہ جدونوں اور سیدوں کی کوٹھیاں ہیں جو اس علاقے کے، ان پہاڑوں کے اور ان مرغزاروں کے مالک ہیں۔ کاغان میں داخل ہونے والی سڑک کے نالے کے پل پر سیدوں کا منشی بیٹھا تھا جو ایک روپیہ فی مہاجر اور دو روپے فی گائے کے حساب سے گوجروں سے چرائی کی اجرت لے رہا تھا۔ جو ریوڑ چرائی کے لیے کاغان کی وادی میں داخل ہوتے ہیں انہیں یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ بے چارے سیدوں کے لیے آمدنی کا ایک یہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے اسی وجہ سے وہ کاغان چھوڑ کر لاہور اور اسلام آباد میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور انہوں نے ڈیفنس سوسائٹی، گلبرگ اور رمنا میں اپنی کوٹھیاں بنالی ہیں۔

شیراز نے کہا:

"اب چلئے پیرجی۔ چاہے بنچ پر بیٹھ کر پیو، چاہے وہ سامنے اخروٹ کے نیچے ٹھنڈی گھاس پر۔ یہ میرے گرائیں کی دکان ہے۔"

ہم سب نے اخروٹ کے درخت تلے بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا۔ درخت کے پتے دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے اور اس کی ڈالیوں میں کچے کچے اخروٹ لگے تھے۔ نیچے گہرے سبز رنگ کی گھاس تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دریا کے شور کی وجہ سے ہمیں ذرا اونچا بولنا پڑتا تھا اور ڈھلان کی وجہ سے ٹانگیں پھیلا کر اور ایڑیاں جما کر بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ عمر بہت اداس تھا اور اپنی چھڑی کی مٹھ پر ٹھوڑی لگا کر پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہا تھا۔ ہم سب کو اس کی اداسی کی وجہ معلوم تھی اور ہم سب خاموش تھے۔ گو اس واقعے کو چودہ پندرہ سال ہو چکے ہیں لیکن اس کی اداسی کا عالم اب بھی وہی ہے۔ پہاڑوں میں کھوئی ہوئی محبتیں اور بھولی ہوئی یادیں پھر لوٹ آتی ہیں، جس طرح بارش کے دنوں میں باہر بوندیں پڑتی ہیں، تو انسان کے اندر بھی بارش ہونے لگتی ہے۔ اوپر سے تو ٹھیک رہتا ہے، لیکن اندر سے

بالکل بھیگ جاتا ہے۔ اس قدر شرابور کہ آرام سے بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہی کیفیت پہاڑوں میں جا کر ہوتی ہے۔ کیسا بھی اچھا ساتھ کیوں نہ ہو انسان تنہا رہ جاتا ہے اور اداسی کی دھند اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیتی ہے۔ اندر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا ہے اور باہر کیسی بھی دھوپ کیوں نہ کھلی ہو، کیسی بھی ٹھنڈی ہوا کیوں نہ چل رہی ہو، اندر ٹپا ٹپ بوندیں گرنے لگتی ہیں اور شدید بارش ہو جاتی ہے اور اندر سے بھیگا ہوا انسان باہر کے آدمیوں کے کام کا نہیں رہتا۔ ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ یہی حالت عمر کی تھی!

اخروٹ کے تناور درخت تلے، ٹھنڈی ہوا میں ہم نے گرم چائے پی اور کسی نے کسی سے بات نہ کی۔ کھلے ہوئے مناظر میں ہم کچی برف کے قاش بن کر گھل گئے تھے اور اس ٹھنڈی ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے جس میں چیڑ کی خوشبو، گھاس کی مہک اور دریا کی باس شامل تھی۔ شیراز اپنی سلیٹی رنگ کی چادر سے چیونٹیاں جھاڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا ایک لڑکا تھا جو چائے کے برتن لینے آیا تھا۔ شیراز کے آواز دینے سے پہلے ہی ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور جیپ کی طرف چل دیے۔ یہاں سے ناران کوئی بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور راستے میں ہمیں ایک بہت بڑے گلیشیئر پر سے گزرنا تھا۔ جیپ میں بیٹھتے ہی ہم پر سے اداسی کے بادل چھٹ گئے اور پٹرول کی بو اور ترپال کی گندھ ہمیں پھر اس دنیا میں واپس لے آئی۔ پہاڑ کا ایک تیکھا موڑ کاٹنے کے بعد مسعود نے ہم سب کی توجہ ٹین کی چھتوں والی ایک بستی کی طرف کرائی اور بولا:

"یہ کوئی فیکٹری معلوم ہوتی ہے۔"

"فیکٹری یہاں کہاں؟" عماد نے کہا۔ "یہاں تو بس یا گوجر ہیں یا بکریاں یا خود رو سبزہ ہے یا چیڑ۔ فیکٹری کا یہاں کیا کام؟"

"فیکٹری ہے۔" عمر نے کہا۔

"بالکل فیکٹری ہے۔" مفتی نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "کاٹیج انڈسٹری سے کوئی بڑی چیز۔"

میں نے بھی اپنے علم کے زور پر کہا:

"فیکٹری ہی معلوم ہوتی ہے۔"

اس وقت شیرباز اپنے خیالوں میں گم جیپ چلا رہا تھا۔ اُس نے ہماری بحث میں حصہ نہیں لیا۔ شاید اس نے ہماری باتیں سُنی نہیں، ورنہ وہ ضرور دخل دیتا۔ جب ہم اس علاقے کے قریب سے گزرے، تو وہ ایک اچھا سا گاؤں تھا اور اس کے درمیان تیڈن کے گھر تھے۔ عماد نے سر اونچا کر کے کہا:

"اوئے گدھو! یہ فیکٹری ہے۔"

ہم سب اپنی اپنی جگہ کھسیانے ہو گئے۔ اعظم نے جیپ کا پردہ ذرا سا اُوپر اٹھا کر کہا:

"فیکٹری ہی ہے فیکٹری نہیں تو اور کیا ہے؟"

"یہ گاؤں ہے گدھے!" عماد نے جل کر کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں،" اعظم نے کہا۔ "بچے بنانے کی فیکٹری ہے۔"

ہماری ہنسی مسعود اور مُفتی کے قہقہے میں دب کر رہ گئی۔

عُمر نے کہا:

"یار مُفتی! یہ بچے بنانے کی نئی ترکیب پر تو میں حیران رہ گیا۔ خُدا کی قسم مجھے نہیں علم تھا کہ مچھلیاں اس طرح سے بچے پیدا کرتی ہیں۔"

"لو بھائی صاحب ابھی تک وہیں گھوم رہے ہیں۔" عماد نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "پہلے ہم شادی سے تنگ تھے کہ وہ اپنا لاہور ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ اب یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔"

کاغان سے پہلے راستے میں (مجھے جگہ کا نام یاد نہیں رہا) ہم نے گورنمنٹ ہیچری دیکھی تھی۔ یہاں سیمنٹ کے چھتے ہوئے چوبچوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی پرورش تیار کی جا رہی تھی۔ ایک تالاب میں لاروے تھے۔ دُوسرے میں ایک ایک آدھا آدھا انچ چھوٹی مچھلیاں۔ اس سے اگلے میں اس سے بڑی مچھلیاں۔ دو تالابوں میں سیاہ اور رنگین پر ٹراؤٹ کے نر اور مادہ مچھلیاں۔ صحت مند جوان مست مچھلیاں۔ جوانی میں اندھے زور سے تڑپتے۔ ہم سب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹراؤٹ مچھلی کی شکل دیکھی۔ مسعود اس سے پہلے یہ مچھلی کھا چکا تھا۔ لیکن اسے اس کی شباہت کا علم نہ تھا۔ ہیچری کا نگران ایک بزرگ عُمر کا پٹھان تھا جس

کے ہاتھ بڑے بڑے، چہرہ کرخت اور داڑھی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں محبت اور اس کے باتیں کرنے کے انداز میں شفقت تھی۔

عُمر نے کہا:

"خان صاحب! یہ مچھلیاں نہیں بچے دیتی ہیں؟"

"بچے نہیں جی انڈے دیتی ہیں۔" خان نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے انڈے کہیں دیتی ہیں، تالابوں میں؟"

"دیتی نہیں جی۔" خان بولا۔ "ان سے انڈے دلواتے ہیں۔ پھر ان سے بچے نکلواتے ہیں۔ پھر ان کو تالابوں میں منتقل کرتے ہیں۔ بڑا مشکل کام ہے صیب! لیکن خدا کا فضل ساتھ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے۔"

ہم میں سے کوئی بھی اس کی بات نہ سمجھا۔ اس نے ہمارے سوالیہ چہرے دیکھے، تو ہاتھ کے اشارے سے بولا:

"اندر آؤ صیب اِکوار میں۔ آپ کو ٹراؤٹ کے انڈے دکھائیں۔"

ہم اس کے ساتھ اندر کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اس نے ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح کہنا شروع کیا:

"یہ تو آپ کو معلوم ہے صیب کہ مچھلی اور مچھلا دُوسرے جانوروں کی طرح کبھی کچھ اس نہیں کرتے۔"

"بالکل ٹھیک!" مفتی نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو ہم سب اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یار پہلے ہمیں تو سمجھ لینے دے۔"

خان نے کہا:

"دریا میں جب مچھلی انڈے دیتی ہے تو اپنی پُوری مستی اور جوانی پر آ کر دیتی ہے۔ انڈے دینے سے پہلے اس کو بڑے بڑے صحت مند اونچے نر چاروں طرف سے گھیرے رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ بس نر مچھلے مچھلی سے ایک ایک گز ایک ایک فٹ کے پاس گھومتے رہتے ہیں۔"

جی؛ خان بولا۔ "دریا کا تیز پانی اس مادّے کو انڈوں پر سے دھو دیتا ہے۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا مادّہ۔ بس پانچ سات منٹ میں انڈے دُھل جاتے ہیں"۔

"وہ کیوں؟" عماد نے پوچھا۔

"بڑا زہریلا مادّہ ہوتا ہے صیب! تیزاب۔ پانچ منٹ سے پہلے پہلے انڈوں کی باریک جھلی میں اُتر جاتا ہے۔ زیادہ دیر پڑا رہے، تو سارے کے سارے انڈے سڑ جائیں، تباہ ہو جائیں"۔

"مچھل مچھلے کی ملاقات نہیں ہوتی خان؟" عمر نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اس کو کیا پتہ کون سی مچھل کے انڈے ہیں اور مچھل کو کیا پتہ کہ کون مچھلا انڈوں پر اپنا مادّہ ڈال گیا۔ یہ دیکھئے یہ ہمارا ٹرے ہے۔ اس میں ہم انڈے لیتے ہیں"۔

لکڑی کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا اور تین انچ لمبا ڈبا تھا۔ اس کے چاروں طرف مچھر جالی لگی تھی۔ ڈھکنے کے فریم میں بھی یہی جالی تھی۔ صرف پیندا لکڑی کا تھا۔ ایسے دو تین ٹرے دیوار کے ساتھ لٹک رہے تھے اور اُن سے مچھلی کی بساند آ رہی تھی۔

خان نے کہا:

"ہم انڈوں پر آئی ہوئی مچھل تالاب سے پکڑتے ہیں اور اُس کے پیٹ پر سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کا دباؤ ڈال کر سارے انڈے اس ٹرے میں دلوا لیتے ہیں"۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔ ایک منٹ، ایک منٹ" عمر نے بے چین ہو کر کہا۔ "آپ مچھل تالاب سے باہر نکال لیتے ہیں کھلی ہوا میں؟"

"ہاں جی بالکل کھلی ہوا میں، لیکن ہم تالاب کے کنارے بیٹھ کر یہ عمل کرتے ہیں، اتنی جلدی مچھل مرتی نہیں صیب۔ پھر صیب یہ ٹرے سارا انڈوں سے بھر جاتا ہے"۔

"تیزی سے گرتے ہیں انڈے؟" مسعود نے پوچھا۔

"بالکل فسٹ کلاس۔ بڑی تیزی کے ساتھ" خان نے جواب دیا۔

"جب یہ ٹرے انڈوں سے بھر جاتا ہے۔ تو پھر ہم ایک مچھلا تالاب سے نکالتے ہیں اور

"وہی نر؟" عماد نے پوچھا۔

"نر جی بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی اس مچھل کے گرد گھومتے رہے، کوئی دوسری مچھل کے گرد جا کر گھومنے لگے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے صیب کہ مچھل پتھروں کے اندر، یہ جو چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے ہیں ناں کنکریوں جیسے، ان میں اپنی دُم چھل مار مار کر ایک ٹویا سا بنا لیتی ہے اور اس میں انڈے دیتی ہے۔ کوئی آٹھ دس ہزار کے قریب"۔

"کیا؟ کتنے؟" عمر نے چیخ کر کہا۔

"یہی صیب کوئی دس ہزار کے قریب اور پھر اُدھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اپنے مزے سے تیرتی ہے۔ کوئی اُوپر نکل گئی۔ کوئی دو میل نیچے چلی گئی"۔

"انڈے دے کر چلی گئی؟" اعظمی نے کہا۔

"ہاں جی!"

"اور پھر نہیں آتی؟"

"نر جی پھر اس کو آ کر کیا لینا ہے؟ بس اپنا کام کیا اور ختم"۔

"پھر ان میں سے بچے کتنے دن بعد نکلتے ہیں؟" مسعود نے پوچھا۔

"ابھی ٹھہرو صیب ابھی بچے کدھر سے نکلیں گے؟ ابھی تو خالی ہوائی انڈے ہیں۔ ان سے بچے کس طرح سے نکل سکتے ہیں" خان نے قدرے خفگی کے ساتھ کہا۔ "ابھی تو مچھلا آئے گا"۔

"اچھا! ابھی موصوف کو تشریف لانا ہے" اعظمی نے کہا۔ "لیکن اب کیا فائدہ؟"

وقت پر قطرہ بہت ہے ابرِ جوشش ہنگام کا
جل گیا جب کھیت تب برسا تو پھر کس کام کا

"نر جی، ابھی تو اس کو برسنا ہے" خان نے کہا۔ "جب مچھل انڈے دے کر چل گئی ناں صیب، تو مست مچھلا اِدھر آیا، ان انڈوں کے ساتھ اپنا بدن ملایا۔ اس کے بعد بس اللہ کی حکمت ہے صیب! اس نے اپنا خاص مادّہ ان انڈوں پر پھیلا دیا"۔

"ہیں؟" عمر نے چیخ کر کہا۔

"ہاں صیب بس وہ مادّہ سارے انڈوں پر پھیل گیا اور مچھلا چلا گیا۔۔۔ اس کے بعد

اس کی پُوچھل ان انڈوں پر کر کے اس کے سر سے پُوچھل کی طرف دو انگلیوں کا دباؤ اسی طرح ڈال کر نیچے تک جاتے ہیں۔"

اس نے بتایا کہ ہم مچھلے کا سر اپنی ٹھوڑی اور ہنسلی کی ہڈی کے درمیان دبا لیتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس کا بدن پکڑتے ہیں اور سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کا دباؤ اس کے پھسلتے پیٹ پر ڈالتے ہوئے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ مطلوبہ مادے کی ایک پچکاری چلتی ہے اور ٹرے میں رکھے ہوئے سارے انڈے لتھڑ جاتے ہیں۔

جیب خان یہ بات بتا رہا تھا، تو اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور وہ جنگل کا ایک بوڑھا وائلینسٹ لگ رہا تھا جو اپنی جوانی کے زمانے میں بڑے بڑے اوپرا میں وائلن بجاتا رہا ہو۔ ہم سب خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوٹھڑی میں سناٹا تھا اور وہ ابھی تک اپنے خیالی مچھلے کو اسی طرح گلے لگائے کھڑا تھا، حالانکہ سارے انڈے کبھی کے لتھڑ چکے تھے۔

"پھر جیسے ہم مچھلے کو واپس چوبچے میں چھوڑ کر پانچ سات منٹ تک اس مادے کو انڈوں پر رہنے دیتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ ٹرے گیارہ نمبر چوبچے میں ڈال دیتے ہیں جہاں دریا کا ٹھنڈا پانی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل رہا ہے۔ پانی جالی میں سے گزر کر سارا مادہ دھو دیتا ہے اور انڈے بچے پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"

اعظمی نے کہا:

"سمجھ گئے مسعود یہ ہے اصل فیکٹری بچے پیدا کرنے کی۔"

عمر نے چڑ کر کہا:

"یار تم بیچ میں بکواس نہ کیا کرو . . . اچھا خان صاحب پھر؟"

"پھر کیا جی۔ پھر جب ان سے لاروا نکل آتا ہے تو اس کو نمبر ایک چوبچے میں سے نکال کر نمبر دو میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر آگے، پھر آگے۔ بس اس طرح سے کام چلتا رہتا ہے۔ اللہ کی حکمت ہے بے عیب۔"

شہباز نے جیپ روک کر کہا:

"کلمہ پڑھو یار! ہم گلیشیئر پر سے گزرنے لگے ہیں۔"

ہم سب اپنے اپنے خیال سے چونکے۔ میں نے جیپ سے اُترنے کی کوشش کی، لیکن اس خیال سے چپکا بیٹھا رہا کہ ساتھی بزدل کہیں گے۔ اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے انسان کو بڑے رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ ان سب میں سے بڑا اور آخری رنگ یہ ہے جب آدمی خوف کے مارے مستقل طور پر بہادر بن جاتا ہے اور بہادری کے کارنامے سرانجام دے کر اس جہان سے چلا جاتا ہے۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک طوفان سا اُٹھا۔ ہمارے کپڑے اُڑنے لگے۔ جیپ گلیشیئر پر سے غاؤں غاؤں کرتی گزر رہی تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ گلیشیئر جہاں سے سیاہ رنگ کا ہو اُس پر نہیں جانا چاہیے۔ جیپ جہاں چل رہی تھی وہ برف بالکل سفید تھی۔ میرے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر عماد نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا:

"شاہ جی! یہ گلیشیئر نہیں، یہ تو پہاڑوں کے درمیان جمی ہوئی برف کے تودے ہیں جو پھسل کر سڑک پر آ گئے ہیں۔"

میں نے نگاہیں اُوپر اُٹھا کر دیکھا، اُونچے پہاڑ کی گول گول رانوں کے درمیان سفید برف جمی ہوئی تھی اور دُور دُور تک زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں نے کہا:

"مفتی جی! یہ پہاڑ کس قدر قریب ہے۔"

"نہ نہ نہ!" عماد نے تڑپ کر کہا۔ "گلیشیئر اور گلیشیئر کا علاقہ قریب نہیں ہوتا، بڑا سخت اور وزنی ہوتا ہے۔ برف جب بھی پہاڑوں پر پڑتی ہے پگھل جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے لیکن گلیشیئر کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ایک گلیشیئر دن میں چھ انچ سے لے کر ایک فٹ تک پھسلتا ہے۔"

عماد نے کہا:

"مفتی جی! میں بھی گلیشیالوجی کے بارے میں کوئی زیادہ علم نہیں رکھتا۔ میرا مطالعہ بھی عام ڈائجسٹوں تک محدود ہے، لیکن یہ ہے حقیقت اور سائنٹیفک بات کہ جب تک برف کے

دو وسیع اور عریض تودے نہ ملیں، برف کی تحلیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور جب یہ دو مل جائیں، تو ان میں ابدیت آجاتی ہے۔ پاکستان کا سیاچن گلیشئر کوئی چھتیس میل لمبا ہے اور یوں سمجھ لیجیے کہ مشرقی قراقرم سے لے کر وسطی قراقرم تک چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہسپار اور بیافو کے گلیشئر ہیں۔"

مفتی نے کہا:

"اور یہ کب سے ہیں؟"

"ان کی عمر کا تعین نہیں کیا جا سکتا" عماد نے کہا "جب سے قراقرم کا یہ سلسلہ موجود ہے۔ ہزاروں، لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سال گزر چکے ہوں گے نر اور مادہ برف ایک دُوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لیٹے ہیں اور ہزاروں آدمی یہاں سے نروان حاصل کر چکے ہیں۔"

عمر نے کہا:

"یار مفتی! میں نہیں کہتا تھا پہاڑ عظیم ہوتے ہیں، عاشق ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں محبوب ہوتے ہیں تم لوگ میری بات نہیں مانتے تھے؛"

"یار تیری بات تو ہم پچھلے چودہ برس سے مان رہے ہیں۔" عماد نے جلس کر کہا۔

شیر باز ہماری اس گفتگو سے بالکل کٹ کر اب جیپ چلا رہا تھا اور اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں۔ ایک مرتبہ اس نے کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن ہم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ چارسدہ کا رہنے والا تھا اور ہم کو سیاسی گفتگو میں اُلجھانا چاہتا تھا، لیکن اب ہم اس کی گرفت اور سطح سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس کے ساتھ جو محبت اور یگانگت سفر کے شروع میں پیدا ہوئی تھی وہ اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ بہت شاید اس وجہ سے کہ ہماری منزل قریب آ رہی تھی اور منزل قریب آجانے پر مسافر ایک دُوسرے سے اور ساربان سے دُور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا معیوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دُوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

میں نے رقیبوں کو محبت کی آگ میں جلتے اور بھسم ہوتے دیکھا ہے۔ پھر ان کی راکھ کو کئی کئی دن اور کئی کئی مہینے ویرانوں میں اُڑتے دیکھا ہے۔ ان لوگوں سے بھی ملا ہوں جو محبت کی آگ میں سُلگتے رہتے ہیں اور جن پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکھ کی ہلکی سی تہہ جم جاتی ہے، پھر اور وقت گزرنے پر دُور پار سے ہوا کا کوئی جھونکا گزرتا ہے، تو ان کی یہ راکھ جھڑ جاتی ہے اور انگارے پھر دہکنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی میری زندگی سے گزرے ہیں جو چُپ چاپ محبت کے سمندر میں اُتر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ لوگ بھی ہیں جو کاروبار کرتے ہیں، دفتروں میں بیٹھتے ہیں، دریا روکتے ہیں، ڈیم بناتے ہیں، ٹینک چلاتے ہیں اور محبت کی ایک بند ڈبیا ہر وقت اپنے سینے کے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔ مسافر، سیاح، کوہ پیما، دشت نورد آپ کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ قاہرہ کے ایئرپورٹ پر جاما لین اپنا بریف کیس گود میں ڈال کر بیٹھا تھا۔ سیاسیات کا ایک معمر پروفیسر تھا جو ٹوکیو یونیورسٹی میں لیکچر دینے جا رہا تھا۔ اس کے عمر رسیدہ دل پر اس چھریرے بدن کی لڑکی کا بوجھ تھا جو حال ہی میں تھیسس اس کی نگرانی میں مکمل کر کے فارغ ہوئی تھی اور جس کا سکوٹر اسے ہر روز یونیورسٹی سے لینے آتا تھا اور وہ سکوٹر پر اس کے پیچھے اس کے شانے سے گال لگا کر بیٹھتی تھی۔ ان دونوں کے روانہ ہونے سے پہلے پروفیسر ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا کرتا تھا۔

دراصل محبت کے لیے ایک خاص فضا، ایک خاص علاقے، ایک مخصوص ECOLOGY کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو دلوں کی یاد، دو دلوں کے ملنے کی احتیاج نہیں ہوتی، ایک خاص پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل پس منظر بھی مناسب لفظ نہیں۔ یہ تو آدمی کی سوچ محدود کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ابھی تک نام تجویز نہیں کیا جا سکا۔ الفاظ بھی کیا بڑھئی کے اوزار ہیں کہ خیال کو چھیل چھال کر کاٹ کر رندہ سا لگا دیتے ہیں۔ اور اس کا قد گھٹا دیتے ہیں ہم بھی کیا لوگ ہیں کہ ان بونوں کے سہارے تصور کی فصیلوں پر یلغار کرتے ہیں اور اپنے جانے قلعے فتح کر لیتے ہیں۔

آپ نے سبزی منڈی دیکھی ہو گی جہاں سبزی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہے۔ باہر سے ریڑھے اور گڈیں اور ٹرک بھر بھر کر سبزی آتی ہے۔ کھلے صحن میں انبار لگ جاتے ہیں۔ تاجر، آڑھتی، کسان، زمیندار، کنجڑے ان انباروں کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سہ پہر تک یہ انبار نہیں رہتے۔ سارے صحن میں گوبھی کے بڑے بڑے پتے، موٹے موٹے ڈنٹھل، ٹُرٹڑے ساگ اور پیاز کے چھلکے پھیل جاتے ہیں۔ گند بھی ہوتا ہے۔ بُو بھی، لیکن تازگی بھی ہوتی ہے اور کلوروفل کی خوشبو بھی۔ پھر یہاں بھنڈر لگتے ہیں۔ گائیں بکریاں اور اصیل مرغیاں آ جاتی ہیں۔ پتے سمٹنے لگتے ہیں۔ ڈنٹھل ختم ہونے لگتے ہیں۔ بیج چُگے جاتے ہیں۔ کچھ پیٹ بھرنے کی، کچھ شکر کرنے کی، کچھ اُبکائی کرنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن باسی اور تازہ سبزے کی خوشبو ضرور باقی رہتی ہے۔ یہی حال ہیرا منڈی کا ہے۔ یہاں بھی باسی، تازہ، سڑی ہوئی اور پژمردہ محبت کی بُو باقی رہتی ہے۔ ان کوٹھوں پر چونکہ محبت کا کاروبار ہوتا ہے، اس لیے یہاں آنے والا شخص محبت کی لو میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ چاہے اپنی بند ڈبیا اپنے ساتھ لائے یا اس جگہ کا ڈنٹھل اٹھا کر منہ میں ڈال لے، اُسے ڈبیا کھولنی ہوتی ہے اور ڈنٹھل کا نمکین پانی چکھنا ہوتا ہے۔ ان گندے کمروں میں، موٹے موٹے گدّوں، میلے کچیلے قالینوں اور دیواروں پر لگے پیلے پیلے آئینوں پر محبت کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ محبت کا جھول ہوتا ہے، محبت کی باس ہوتی ہے۔ یہاں کی عبادت میں لاکھ کوشش کے باوجود اور کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا۔ کوئی اور بھگوان اس مندر میں نہیں اُترتا۔

جب میں ٹیلیویژن کے ایک پروگرام کے سلسلے میں پہلی بار یہاں گیا۔ تو تنگ تاریک چوبارے کی کھڑکی سے ذرا پرے ہٹ کر قالین کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ بڑی بی آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں:

"ہائے شاہ جی آپ ادھر بیٹھیں کُرسی پر۔"

میں نے سہاگن کی طرح جھکا سا ہاتھ اٹھا کر کہا:

"جی نہیں، میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں:"

پھر میں نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور ہم پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے بھرے بھرے بدن کی ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں کوکا کولا کی آدھی پی ہوئی بوتل تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی۔ ایک تکیہ اٹھایا اور میرے پاس آ کر بولی:

"یہ لے لیں۔"

میں نے چُپ چاپ وہ تکیہ لے کر اپنے زانو تلے دبا لیا اور میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام لڑکیاں گھوم گئیں جنہوں نے میری زندگی میں اپنے اپنے مقام پر مجھے تکیے دیے تھے۔ عورت کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مرد کو تکیہ دینا ہے۔ وہ کیسے بھی آرام سے کیوں نہ بیٹھا ہو عورت اُسے سہارا ضرور دے گی، چاہے وہ سہارا کتنا ہی وقتی کیوں نہ ہو، چاہے وہ عورت کیسی بھی کاروباری کیوں نہ ہو، چاہے وہ قیام کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، طوائف ہو یا ائیر ہوسٹس تکیہ ضرور پیش کرے گی۔ میں جتنی دیر وہاں رہا میرے ذہن میں محبتوں کی یادیں اُبھرتی رہیں۔ اپنی محبتیں، دوستوں کی محبتیں، قصے کہانیوں کی محبتیں اور میرے ذہن کی سبزی منڈی میں دُور دُور تک ڈنٹھل ہی ڈنٹھل پھیل گئے۔

جب میں اس چوبارے سے اُتر کر ایک دُوسرے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچا، تو اچانک میری نظریں چھت پر مرکوز ہو گئیں۔ بد بُودار ڈیوڑھی کی دھوئیں بھری چھت سے پرندوں کے پروں کا ایک دبیز گدا چپکا ہوا تھا۔ اس گدے میں جا بجا آڑے ترچھے گول گول سوراخ تھے جو کالی گہرے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی کوئی چھت نہ دیکھی تھی جو بال و پر کے قالین سے مزین کی گئی ہو۔ اس قالین سے کچھ بال اور کچھ نرم نرم روئیں چھوٹ کر زمین پر بھی گری ہوئی تھیں۔ میں نے زمین سے کچھ بال اُٹھائے یہ جنگلی کبوتر کے پوٹے کے بال تھے اور ان کی چمک مدہم پڑ گئی تھی۔ ان کے ساتھ گندگی ایک مرغوبی بھی تھی اور اس میں سے سیخ کباب کی ڈھلی ہوئی سیخ کی مدہم سی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر ایک مرتبہ پھر چھت کو غور سے دیکھا اور ایک موٹا سا آدمی بس ننگی پیٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے سیڑھیوں سے اُترا، مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ اوپر اُٹھا کر دُعائیں دینا شروع کر دیں:

"وَولا بادشاہ، سائیں بادشاہ، رنگ بھاگ سا دے۔ بھلے لوک، کرم نواز۔"

میں نے ایک مستعد طالب علم کی طرح حیرانی سے پوچھا:

"یہ چھت پر کیا ہے؟"

"یہ گھونسلے ہیں بادشاہ... ابابیلوں کے گھونسلے۔"

"ابابیلوں کے گھونسلے! یہاں؟"

"جی بادشاہ! یہ قسمت والا گھر ہے۔ دو سال سے ابابیل ادھر رہتے ہیں۔ بڑے انڈے بچے دیتے ہیں، بڑے سُریلے لوگ ہیں۔"

میں نے کہا:

"اب بھی رہتے ہیں؟"

"کیوں نہیں جی! اللہ فضل کرے!" اس نے سارنگی سینے سے دبا کر کہا۔ "اب بھی رہتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے انشاء اللہ۔"

"میں نے ان کے گھونسلے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ بڑے عجیب ہیں، کیسے بناتے ہیں؟"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا:

"بادشاہ! یہ جنوروں پرندوں کے پَر جمع کرتے ہیں، پھر کسی سُریلے مکان کی چھت میں اپنے لعاب سے ان پروں کو چپکاتے ہیں، چاروں طرف سے اور ایک کونے میں سوراخ چھوڑتے ہیں داخل ہونے کے لیے اور پھر اس کے اندر رہتے ہیں۔ پروں کی تھیلی کے اندر یہیں انڈے بچے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا:

"کمال کاریگر لوگ ہیں۔"

"کاریگر! میرے بادشاہ!"... اس نے محبت کے ساتھ کہا: "بڑے سُریلے، بڑے کن رس جانور ہیں۔ بڑے گنی۔ اللہ نے ان کو بڑے مرتبے دیے ہیں۔ جہاں پورے سُر لگتے ہوں وہاں اپنے گھونسلے بناتے ہیں، جہاں بے سُرے لوگ رہتے ہوں وہاں سے ڈیرہ اٹھا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا:

"... آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ میرے قریب آکر رازدارانہ لہجے میں بولا:

"ابابیل کو میرے نبیؐ میرے سوہنے حضرت داؤدؑ کی دعا ہے۔ وہ سُر میں اُڑتے ہیں، سُر میں تیرتے ہیں اور جہاں سُر ہوں وہاں گھر بناتے ہیں۔ اس گھر پر خدا کی بڑی رحمتیں ہیں۔ دونوں بیبیاں ایسے سُر میں گاتی ہیں کہ جگنو روشنی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جل بجھ نہیں کر سکتے... ایسے ہی گھر میں ابابیلوں کے گھونسلے ہوتے ہیں۔"

"تو یہاں کسی اور گھر میں ان کے گھونسلے نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ایمانداری سے کہا... "بی بی مست ناز کے گھر میں ہیں اور کہیں نہیں۔"

"اور کہیں کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اور کہیں سُر ہو میرے بادشاہ تو ابابیل گھر بنائیں۔ ٹکا دھم ٹکا دھم والے کوٹھوں پر ابابیلوں کا کیا کام؟"

پھر مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا:

"آج سے دو سال پہلے بی بی بختاور کی ڈیوڑھی میں بڑے گھونسلے تھے ابابیلوں کے۔ شام کو ان کی واپسی پر ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ بی بی نے دو نئے روشندان کھلوائے تھے دیواروں میں ان کے آنے جانے کے لیے۔ بڑے خوش تھے میرے بادشاہ جانور اس گھر میں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تینوں بیبیاں بڑے بڑے سُر میں تھیں میرے بادشاہ۔ دو کو ذاتِ پاک نے وہ گلے دیے تھے کہ بڑے بڑے پکے راگ ان کے گلے سے نکل کر ان کے پاؤں پڑ جاتے تھے اور تیسری کو میرے مولا کی ذات نے پیر دیے تھے کہ ٹھیکے پر برکت ہوتی تھی۔ دھمک نہیں ہوتی تھی اور اس کے پیروں کے نیچے کا فرش ابابیلوں کے گھونسلے کی چھت تھی۔ وہ ایسے سُر اور بیٹ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے تھے۔"

"لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ وہ اب گھونسلے نہیں رہے۔" میں نے کہا۔

"بڑی نے ملتان کے ایک رئیس سے نکاح کر لیا۔ درمیانی نے نیلا تھوتھا کھا کر خودکشی کر لی اور تیسری فلموں میں چلی گئی۔ اب ہوٹل کے سیٹ پر ویمپ بن کر ناچتی ہے۔ میرے بادشاہ! اب ابابیل اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!"

میں نے ہنس کر کہا:

"تو یہ ابابیل آپ کی راجدھانی میں ہی گھونسلے بناتے ہیں اور کہیں نہیں"

"ناں ناں ناں۔۔۔" اس نے گز والے ہاتھ سے کان کو چھوا اور ادب کے ساتھ بولا: "مسجدوں میں بھی گھونسلے بناتے ہیں میرے بادشاہ! لیکن ان مسجدوں میں جہاں کوئی سُریلا موذن ہو۔ میرے مولا حضرت بلالؓ جیسا، جہاں میں کنستر کھڑکتے ہوں، وہاں نہیں بناتے"

دراصل تعلق خاطر کے لیے ایک خاص قسم کے ماحول۔ ایک خاص قسم کی فضا اور خاص نوعیت کے پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سارے الفاظ پھر میری سوچ کو محدود کیے دیتے ہیں۔ محبت کے لیے کچھ ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے شاید ابھی کوئی لفظ بنا نہیں۔ پہاڑوں پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ان کی ٹھنڈک، ان کے سبزے، ان کی عظمت۔ ان کی دُھند اور بارشوں کی وجہ سے نہیں ہوتا یا شاید انہی کی وجہ سے ہوتا ہو یہاں آکر بھی انسان محبت میں شرابور ہو جاتا ہے۔ بلاوجہ۔ بغیر کسی ارادے یا مقصد کے۔ بن دیکھے مجالے۔ بغیر کسی پلان کے۔

شیرباز نے کہا:

"صیب! جب ہم یہ موڑ مڑیں گے تو آپ کو ناران کا یوتھ ہاسٹل نظر آئے گا۔ بڑے ہِپّی لوگ ٹھہرتے ہیں یہاں آکر"

"ہپّی کون؟" مسعود نے پوچھا۔

"یہی اپنے ہپّی نہیں ہوتے۔ انگریز لوگ۔ اپنا بستر مستر کمر پہ باندھ کر لاتے ہیں۔ بڑے خدائی خوش ہوتے ہیں"

"لیکن کرتے کیا ہیں خان؟"۔۔۔ عماد نے پوچھا۔

"خدا خبر کیا کرتے ہیں یار اجی۔ چرس مرس پیتے ہیں۔ ہلّا گلّا کرتے ہیں۔۔۔ پیدل چلتے ہیں"

"بدمعاشی نہیں کرتے؟" عمر نے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی کرتے ہوں گے۔ بدماشی کرنے کو کون سا زیادہ ٹیم چاہیے۔ وہ دیکھو جی وہ" شیرباز نے کہا۔۔۔ "وہ ٹین کی چھت نظر آ رہی ہے ناں۔ وہی یوتھ ہاسٹل ہے"

ہم سب نے گردنیں موڑ کر دیکھا، اونچی پہاڑی کی گود میں پتھر کی دیواروں اور ٹین کی چھت والا یوتھ ہاسٹل بادل کے ایک ٹکڑے تلے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"آپ ادھر ٹھہریں گے صیب یا ڈاک بنگلے میں؟"

"ڈاک بنگلے!" ہم چھیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"کون سے بنگلے میں صیب؟"

"فارسٹ ریسٹ ہاؤس" عماد نے جواب دیا۔ "ہم نے اس کا بندوبست پنڈی ہی سے کر لیا تھا۔ ادھر تار دے دیا تھا"

"تار گھر تو خراب ہے جی"۔۔۔ شیرباز نے کہا۔۔۔ "ابھی ادھر تار نہیں آتا، چٹھی رسی آتا ہے"

"بس تو چٹھی پہنچ گئی ہوگی" عماد نے اطمینان کے ساتھ کہا، کیونکہ یہ سارا انتظام اس کا تھا اور محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر نے جو عماد کا دوست تھا اسے یقین دلا دیا تھا کہ ہمارے جانے تک سارے انتظامات مکمل ہوں گے اور چوکیدار کمرے کھول کر ہمارا منتظر ہوگا۔۔۔ میں نے انتظار کرنے والوں کو دیکھا۔ انتظار کرتے کرتے سو جانے والوں کو بھی اور مر جانے والوں کو بھی۔ میں نے مضطرب نگاہوں اور بے چین بدنوں کو دیکھا ہے آہٹ پہ لگے چونکے کانوں کے زخموں کو دیکھا ہے۔ انتظار میں کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا ہے۔ منتظر آدمی کے دو وجود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جگہ مقررہ پہ انتظار کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو جسدِ خاکی سے جدا ہو کر پذیرائی کے لیے بہت دُور نکل جاتا ہے۔ جب انتظار کی گھڑیاں دنوں مہینوں اور برسوں پہ پھیل جاتی ہیں تو کبھی کبھی دوسرا وجود واپس نہیں آتا اور انتظار کرنے والے کا وجود

اُس خالی ڈبے کی طرح رہ جاتا ہے جسے لوگ خوبصورت ہونے کی وجہ سے رکھ لیتے ہیں اور کبھی اپنے درمیان سے جُدا نہیں کرتے۔ یہ خالی ڈبہ کئی بار بھرتا ہے۔ قسم قسم کی چیزیں اپنے اندر سمیٹتا ہے، لیکن اس میں "وہ" لوٹ کر نہیں آتا جو پذیرائی کے لیے آگے نکل گیا تھا۔ ایسے لوگ بڑے مطمئن اور پُورے طور پر شانت ہو جاتے ہیں۔ ان مطمئن، پُرسکون اور شانت لوگوں کی پرسنیلٹی میں بڑا چارم ہوتا ہے اور انہیں اپنی باقی ماندہ زندگی اسی چارم کے سہارے گزارنی پڑتی ہے۔ یہی چارم آپ کو صُوفیا کی شخصیتوں میں نظر آئے گا۔ یہی چارم عمر قیدیوں کے چہروں پر دکھائی دے گا۔ اور اسی چارم کی جھلک آپ کو عمر رسیدہ پروفیسروں کی آنکھوں میں نظر آئے گی۔

مَیں ایسے ہی ایک پرنس چارمنگ کو جانتا ہوں جسے بارہ برس تک اپنی محبوبہ کے خط کا انتظار رہا۔ اس کی تحریر کی ایک جھلک دیکھنے کی آرزو رہی۔ اس کے ہینڈ رائٹنگ کے خم و پیچ کو ایک بار پھر سے دیکھ لینے کی تمنا رہی۔

ہم ایک چائے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بیرے نے زرد پتی کے پانچ پاؤنڈ والا لفافہ لا کر ہماری میز پر رکھ دیا۔ ایک پان مَیں نے نکالا، دوسرا منیر نے۔ پھر دو ہاتھ بیک وقت اس لفافے کی طرف بڑھے۔ ایک منظور کا اور دُوسرا اس چارمنگ پرسنیلٹی کا جس سے ہم اپنی اپنی جگہ بہت متاثر تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا:

"لیجیے لیجیے" اور پھر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

منظور نے اپنا پان نکالا اور آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔ پرنس چارمنگ نے پاؤنڈ والا لفافہ اُٹھایا۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر لفافہ میز پر رکھ دیا۔ یہ لفافہ بی اے ہاؤس ٹیسٹ کے اس پرچے کا آدھا ورق تھا جو ان کی محبوبہ نے دیا تھا اور جس کے ایک کونے پر سُرخ پنسل سے نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس تحریر کی تلاش میں ان کا ایسٹرل وجود اتنی دُور نکل گیا تھا کہ اس کے واپس لوٹنے کی ساری اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے مسکرا کر کہا:

"آج کی بارش تو کچھ لمبی ہی ہو گئی۔"

ہم سب نے ریستوران کے دروازے کی طرف گردنیں موڑیں اور منظور نے خوش اخلاقی سے جواب دیا:

"جی سر! کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔"

جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے، تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہو جاتا ہے اور شمعِ زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے اُڑ کر آنے لگتے ہیں۔

جب ہم ناران کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی ہمارا منتظر نہ تھا۔ چوکیدار کو ڈھونڈا، تو پتہ چلا کہ وہ جمعہ پڑھنے گیا ہے۔ ہم نے اپنا سامان اُتار کر برآمدے میں رکھا اور اخروٹ کے بھیگے ہوئے درختوں کا نظارہ کرنے لگے۔ مسعود، عمر اور عماد جمعہ پڑھنے چلے گئے اور مفتی، انطلی اور مَیں سامان کی رکھوالی پر بیٹھ گئے۔ گلیشیر کے ٹھنڈے پانی کی ایک کول اس ریسٹ ہاؤس کے گرد چکر مار کر سامنے ترائی کی طرف بہہ رہی تھی۔ برآمدے کے کٹہرے پر سفید پینٹ ابھی اچھی طرح سوکھا نہ تھا۔ فرش سیلا تھا اور ہم اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے تھے۔

ناران پتھروں کا قصبہ ہے۔ سڑکوں پر پتھر، گلیوں میں پتھر، کھیتوں کی مینڈھوں پر پتھر، قبروں کے تعویذوں پر پتھر، کولوں کے کنارے پر پتھر، چھوٹے، بڑے، گول، چپٹے۔ پتھر ہی پتھر۔ آپ راستوں پر اچھی طرح سے چل نہیں سکتے۔ کسی جگہ بیٹھ نہیں سکتے۔ قدم جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ کسی سے محبت بھری گفتگو نہیں کر سکتے۔ شعر نہیں کہہ سکتے۔ گنگنا نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ پتھرا نہیں سکتے۔

مَیں سڑک کے بیچوں بیچ چھڑی کا سہارا لے کر کھڑا تھا اور میرا دایاں پاؤں ایک پتھر کے سر پر تھا۔ اس پتھر کی رنگت سیاہ اور چمکدار تھی اور دُھوپ کی تمازت سے اس پر پسینہ سا آیا ہُوا تھا۔ شدتِ جذبات سے اس پتھر کی رگیں پھیل سی گئی تھیں اور اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مَیں نے گھبرا کر اپنا پاؤں اس پر سے اُٹھایا اور ناف کے آگے چھڑی لٹا کر اس کے سامنے خمیدہ ہو گیا۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ پتھر میں حیات یا رُوح

تو نہیں ہے، لیکن تمام مخلوقات خواہ بولنے والی ہوں یا خاموش، اپنے خالق کے بارے میں ضرور فصیح زبان سے کہے گی کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جمادات کے دو پہلو ہیں۔ ایک رُخ اپنے خالق کی طرف جس میں وہ اللہ سے واقف۔ اللہ کے تسبیح اور اُس کے عبادت گزار ہیں اور دوسرا رُخ مخلوق کی طرف۔ اس میں وہ نہ کچھ جانتے ہیں، نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں، مگر لوگ چونکہ جمادات کے ایک ہی رُخ سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بے حس پتھروں پر چل رہے ہیں اور بے جان زمین پہ آ جا رہے ہیں، اگر انہیں دوسرے رُخ کا علم ہوتا تو ناممکن تھا کہ کوئی شخص کبھی بھی خدا کی نافرمانی کرتا یا اس کی حکم عدولی کرتا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، کوئی بزرگ تھے جنہیں فتح نصیب ہو چکی تھی اور وہ حضرت احمد مکی کے مزار کے قریب زیتون کے درخت تلے بیٹھے تھے۔ اچانک دیکھتے کیا ہیں کہ سارے پتھر کیا چھوٹے کیا بڑے اور سارے درخت اور اُن کی ٹہنیاں اپنی زبان میں خدائے بزرگ و برتر کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس تسبیح کے سننے سے قریب تھا کہ میں ڈر کر بھاگ جاؤں اور پھر کبھی اُدھر کا قصد نہ کروں کہ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے قریبی پتھر کی طرف غور سے کان لگائے، تو مجھے چند مختلف آوازیں سنائی دیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ پتھر تو ایک مگر آوازیں کئی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ پھر میں نے آنکھیں کھول کر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پتھر کئی پتھروں سے ترکیب پا کر ایک ہو گیا تھا اور ہر پتھر سے جدا جدا آواز آ رہی تھی۔ یہی لوگ کہتے ہیں کہ حیوانات کی دنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب ایک بیل کسی دوسرے بیل سے ملتا ہے، تو دن بھر میں اُسے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کا ذکر اپنے ملنے والے سے کرتا ہے کہ میں نے آج فلاں فلاں گھاس کھائی اور فلاں فلاں جگہ پانی پیا۔ فلاں فلاں جانور سے ملا اور فلاں فلاں خیال مجھے آیا۔ اسی طرح دوسرا بیل بھی اس کو جواب دیتا ہے اور دونوں اسی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ہماری گفتگو میں الفاظ اور مخرج اور معانی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں حروف محذوف ہوتے ہیں یا یوں سمجھیے ان کے حروف کو ہم سے مخفی کر دیا گیا ہے جیسے ایک کلر بلائنڈ کے لیے رنگ محذوف کر دیتے ہیں اور وہ ہر اُس شخص سے جھگڑتا رہتا ہے جس کو رنگ نظر آتے ہیں۔ ہم کو تو الفاظ نے اس قدر مجبور اور ایسا مختل کر دیا ہے کہ جب تک کسی اجنبی کی زبان

نہ آتی ہو تو ہم اس کی خاموشی کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتے۔

سورج کی چمک ایک دم غائب ہو گئی اور سارے ناران کو بادلوں نے گھیر لیا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ ہم پتھروں والی پگڈنڈی سے بھاگ کر پھر برآمدے میں آ بیٹھے۔ سامنے دو کوہستانی عورتیں تیز تیز قدم اٹھاتیں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ اعظمی نے چھتری کی مٹھ پہ سے ٹھوڑی اٹھائے بغیر کہا:

"دیکھو! دیکھو مفتی۔ سالیوں نے عمر بھر ناران سے بڑا کوئی اور قصبہ نہ دیکھا ہوگا، لیکن دیکھو چل کس طرح رہی ہیں، کولہے مٹکا مٹکا کر اور گھما گھما کر۔"

میں نے بھی ان عورتوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھا، تو مفتی نے کہا:

"یارو! تم تو بے حد نالائق آدمی ہو۔ اس میں شہری یا پینڈو ہونے کی کوئی بات نہیں فیشن یا سیکس کا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ عورت اپنی چھوٹی ٹانگوں کی وجہ سے چھوٹے قدم اٹھانے پر مجبور ہے۔ عورت کی ران کی ہڈی ایک بڑے اور کھلے پیڑو کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور اندر کی طرف مڑی ہوتی ہیں۔ ہڈی کے اس جوڑ کی وجہ سے اس کو ہر لمبا ہر قدم پہ باری باری گھمانا پڑتا ہے تاکہ آسانی سے چل سکے۔ اگر عورت تم احمقوں کی طرح سیدھی طرح سے چلنے کی کوشش کرے تو اس کے گھٹنے آپس میں ہر قدم پہ ٹکرانے لگیں اور وہ ہر مرتبہ منہ کے بل گر جائے۔"

ہم دونوں کو یہ بات سن کر بہت صدمہ ہوا اور افسوس ہوا کہ وہ ہمیں دکھانے کے لیے اس طرح سے نہیں چل رہی تھیں۔ پھر دنیائے ادب کے وہ سارے ٹکڑے اور سارے شعر اپنے آپ گھومنے لگے جن میں کولہے مٹکاتی عورتوں کا چسکے دار ذکر کیا گیا تھا۔

عمر، عماد اور مسعود ٹمبر پہ چڑھ کر آ گئے۔ ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار بھی تھا جسے انہوں نے مسجد سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ چوکیدار بڑا سخت دل، اُصول پرست اور نمازی قسم کا انسان تھا۔ سارے راستے عماد اس کی منتیں کرتا آیا تھا کہ ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن وہ کاغذ کے بغیر اور صاحب کی تحریری اجازت بنا کمرہ کھولنے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان کندھوں پر لادا اور چوکیدار سے مصافحہ کرنے کے بعد ہی اور

مسکن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ مسکن دائمی ہوتے ہیں، کچھ عارضی۔ کچھ لوگ دائم ایک در پر پتھر کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی بس کے پیچھے اخبار کے ٹکڑے کی طرح بھاگتے ہیں۔ اور تھک کر کنارے سے لگ جاتے ہیں، پھر جب دیکھو ہنا ہے تو دوسری سمت کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ دائمی لوگوں کے بدن بھاری، آنکھیں بڑی، کندھے چوڑے اور کولہے وزنی ہوتے ہیں۔

ان کے معدے عام طور پر خراب اور ان کے بدن ریاح میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر شتر دلے، حاسد، جھوٹے، متکبر اور خود غرض ہوتے ہیں۔ عارضی لوگ چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے ستے ہوئے، پیٹ تنگ، سینے کشادہ اور ماتھے فراخ ہوتے ہیں۔ یہ جگر اور گردے کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بھی عام طور پر خود غرض، متکبر، جھوٹے، حاسد اور شتر دلے ہوتے ہیں۔ دائمی لوگوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عمر بھر عارضی لوگوں کا روپ دھارنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں اور عارضی لوگوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دائمی لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ عارضی لڑکیاں میک اپ زیادہ پسند کرتی ہیں اور دائمی لڑکیاں زیور اور کپڑوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سیز فائر کے باوجود جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے اور وہ اپنی اپنی حدیں پاٹ کر ایک دوسری پر شدید حملے کر جاتی ہیں۔ اس میں عام طور پر بیشتر نقصان مردوں کا ہوتا ہے۔ عین اس طرح جس طرح نظریات کی جنگ میں ہمیشہ آدمی مارے جاتے ہیں —— نظریات نہیں۔

ہم اپنی اپنی پشتوں پر اپنا اپنا بوجھ لادے ایک عارضی مسکن کی تلاش میں نادان کے بازار سے گزر رہے تھے۔ اور دکاندار، قلی، کسان، موچی، ترکھان، مولوی اور چرواہے ہمیں اپنی اپنی نگاہوں کے ترازو میں تول رہے تھے۔ بازار میں ایک طرف آٹے دال، کمل بچھونے، گھڑی ساز، تلیث بٹ، چپلی کباب، چائے اور گھڑی ساز کی دکانیں تھیں اور دوسری جانب چپلی کباب، صابن، خشک میوے، گھڑی ساز، لبساطی، جیب ٹائر، جیپ بیٹری، جیب ٹرانزل نائی اور گھڑی ساز کی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کے باہر کچھ لوگ سبز اخروٹ اور ملوک بیچ رہے تھے اور ہر چار دکانوں کے بعد سڑک کے کنارے ایک موچی بیٹھا تھا۔ دیواروں پر مرزائیوں کے

خلاف نعرے لکھے تھے اور دیواروں کے اندر پتھروں کی دراڑوں میں ہر طرح کے کیڑے مکوڑوں کے عارضی مسکن تھے۔ کچھ مکوڑیں انڈے دے کر فارغ ہو چکی تھیں، کچھ حاملہ تھیں اور باقیوں کے یہاں ابھی نسل کشی کا سلسلہ جاری تھا۔

مفتی نے چلا کر کہا:

"اوئے حرامزادو! آہستہ چلو۔ پتہ نہیں تمہارے ساتھ ستر سال کا ایک بوڑھا چل رہا ہے۔"

ہم سب نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارا ستر سالہ بوڑھا ایک نوجوان گجری اور اُس کے کم عُمر بھائی کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا اور انہیں جیب سے کچھ نکال کر دے رہا تھا۔ مفتی ہمیں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

عمر نے کہا:

"دیکھا دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ اس کمبخت کو ساتھ لے کر نہ چلو۔ یہ ہم سب کو دکھا دکھا کر اور ترسا ترسا کر مارے گا۔"

"اسی کی تو ساری برکت ہے عُمر۔" مسعود نے اپنی مخصوص ہکلاہٹ میں جواب دیا اور پھر سر ہلا ہلا کر خوش دلی سے مسکرانے لگا۔

مسعود بڑا کمینہ اور چھوٹے لیول کا دنیا دار انسان ہے لیکن وہ اپنے دوستوں کی خوبیوں اور ان کی صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دینے کا عادی ہے۔ سامنے ہو تو شاید شرما جائے۔ لیکن پیٹھ پیچھے اس کو اپنے دوستوں کی ثنا کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور وہ بڑی ایمانداری اور خلوص نیت کے ساتھ اس لطف کے چسکے لیتا رہتا ہے۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اب عمار پر بھی مسعود کی اس خصلت کا رنگ چڑھنے لگا ہے اور وہ بھی اس لطف میں گھٹنے گھٹنے ڈوب چکا ہے۔ ایک میں اور عمر اس دائرے سے باہر رہ گئے ہیں۔ عمر چونکہ سادہ لوح اور عاشق مزاج انسان ہے اس لیے وہ اس دائرے میں کود پھاند کر آتا ہے۔ لیکن میں کبھی اس کھیل میں شریک نہیں ہوا۔ مجھے شروع ہی سے غیبت اور منافقت پسند ہے اور میری انا نے آج تک کبھی یہ برداشت نہیں کیا کہ میرے ہوتے ہوئے کسی اور کی تعریف ہو کسی اور کی بات ہو اور اس

گفتگو میں میرے ہی دوست شریک ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی طور پر یہ ایک بُری اور قبیح عادت ہے لیکن یہ عادت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے، عین اس مسّے کی طرح جو میرے دائیں گال پر ہے اور جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

خان بابا سے ہم نے دو کوٹھڑیاں کرائے پر لیں۔ آٹھ روپے یومیہ کے حساب سے۔ ہر کوٹھڑی میں تین چارپائیاں تھیں۔ مُفتی، مسعود اور میں ایک کوٹھڑی میں۔ اعظمی، عُمر اور حمّاد دوسری کوٹھڑی میں۔ درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی۔ لکڑی سوکھ جانے سے جوڑوں میں بڑی بڑی دراڑیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی بات کر سکتے تھے اور ایک دوسرے کو کپڑے بدلتے ہوئے بھی دیکھ سکتے تھے۔ دراصل اِسی دیکھنے کا احساس ہمیں حماد نے دلایا جو ہر مرتبہ پاجامہ بدلتے ہوئے آواز لگایا کرتا تھا کہ ادھر نہ دیکھنا، میں پتلون اُتار رہا ہوں۔ اس کے جواب میں مُفتی ہمیشہ عینک لگا کر کہا کرتا تھا:

"بدل بدل، ہم نہیں دیکھ رہے۔"

جب ہم ان کوٹھڑیوں میں اپنا اپنا سامان قرینے سے فرش پر لگا کر چارپائیوں پر لیٹ گئے، تو پہاڑوں کی چوٹیوں سے شام اُترنے لگی۔ میں نے تنگ دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا اور ریڈیو اناؤنسر کی طرح اعلان کیا:

"آئی شام آئی شام آئی شام۔"

مسعود نے سر ہلا کر کہا:

"واہ!"

میں نے کہا:

"یہ میرا فقرہ نہیں مسعود! یہ اُردو کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار رفیق حسین کا فقرہ ہے۔"

"رفیق حسین!" مُفتی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "رفیق حسین کون؟"

میں نے کہا:

"میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ 'ساقی' میں اس کے افسانے چھپتے تھے۔

بعد میں ایک کتاب 'آئینۂ حیرت' کے نام سے شائع بھی ہوئی۔ میرے پاس تھی، پتہ نہیں کون لے گیا، لیکن اس سے بڑا افسانہ نگار اردو کو اب تک کوئی نہیں ملا۔"

میرے اس دعوے کو مسعود اور مُفتی دونوں نے باطل جانا اور رفیق حسین سے لاتعلقی کا اظہار کر کے خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود بولا:

"پتہ نہیں کیسا افسانہ نگار ہوگا، لیکن یہ فقرہ غضب کا ہے: آئی شام، آئی شام، آئی شام"

باہر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور شام سیاہ رنگ کے گھیرے کی طرح خاموشی سے قدم اُٹھاتی ہماری چوکھٹ کے باہر آ کر بیٹھ گئی۔ پہاڑوں کی شام محبت کرنے والی عورت کی طرح ہوتی ہے۔ خاموش، اُداس، UNDEMANDING شفیق اور کربناک۔ اس کے وجود سے ویسی ہی خوشبو آتی ہے جیسے رِقّت زدہ عورت کی لوئی سے آیا کرتی ہے۔ اُون کی خوشبو، جسم کی خوشبو، رنگ کی خوشبو، آنسوؤں کی خوشبو۔ جس طرح گرمیوں کی شامیں سردیوں کی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں اسی طرح پہاڑ کی شامیں میدانی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں، پھر ہر پہاڑ کی اپنی شام ہوتی ہے۔ کسی میں درختوں کی بُو باس شامل ہوتی ہے، کسی میں ندی نالوں کی، کسی میں پتھروں کی اور کسی میں رات کے جوہڑوں کی۔ خوشبو کے بارے میں اب تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ فلاں خوشبو خوشگوار کیوں ہوتی ہے اور فلاں ناگوار کس لیے۔ کہتے ہیں کچھ خوشبوئیں شروع سے خوشگوار ہوتی ہیں اور کچھ ناگوار۔ اگر ایک دن دُودھ پیتے بچے کی ماں کے پستان پر ہینگ لگا دی جائے، تو بچہ دُودھ پینا چھوڑ دیتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ لیکن اگر اسی پستان کو دُودھ سے تھیر دیا جائے، تو وہی بچہ ہمک کر اُس کی طرف لپکے گا اور اُس سے چمٹ جائے گا۔ میرا خیال ہے جن خوشبوؤں کے ایٹم ہموار اور ملائم ہوتے ہیں اور وہ ہماری قوتِ شامہ کو لُطف عطا کرتے ہیں لیکن جن خوشبوؤں کے ایٹم نوکیلے ہوتے ہیں وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں اور پریشان کرتی ہیں۔

ناران کی اس شام میں رات کے بہت سے ہموار اور ملائم ایٹم شامل تھے اور ہم سب

پر ایک خوشگوار کیفیت طاری تھی مُفتی اپنی چارپائی پر نیم دراز پان لگا رہا تھا مسعود اپنے ہاتھوں کی کنگھی بنا کر سرہانے کی جگہ رکھے سیدھا شہتیر لیٹا تھا اور اس کی دونوں کہنیاں چھت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ مَیں نے ابھی اپنے بُوٹ اُتارے تھے اور بستر میں آلتی پالتی مارے اپنے پاؤں دبا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام کو میرے سب سے بڑے بھائی آفتاب فوت ہوئے تھے۔ وہ فوت تو رات کے وقت ہوئے تھے، لیکن ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کا قد لمبا، بدن اکہرا، بال سیاہ اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ وہ البرٹ وکٹر کے کوارٹر نمبر ۲ میں لیٹے تھے اور ان کی سانس سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو نہایت ہی ہموار اور ملائم ایٹموں کا مجموعہ تھی جس کی خوشگواری میں موت کا پیغام تھا۔ آخری سلام تھا۔ ان کے کمرے کی بتی بھی مدھم تھی اور ان کی آنکھوں کا نُور بھی مدھم ہوتا جا رہا تھا۔ مَیں ان کے سامنے اپنی آستینیں چڑھائے کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا آستین چڑھانے کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ وہ میرے بازو پر بندھی ہوئی چھوٹی سی پٹی دیکھ لیں جہاں سُوئی لگا کر آج صبح میرا ایک بوتل خون لیا گیا تھا۔ یہ خون مَیں نے بھائی جان کے لیے دیا تھا اور بوتل ابھی ہسپتال کی فریج میں پڑی تھی۔ خون دینے کے بعد میں ریڈیو سٹیشن پر ہر ایک کو اور گھر پہنچنے پر قدسیہ اور نوکی کو بتا آیا تھا کہ مَیں نے بھائی جان کے لیے خون دیا ہے اور اس سے مجھے بڑی روحانی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میرے ماں باپ میرے شکر گزار تھے، لیکن میرے بہن بھائی کچھ لاتعلق سے تھے۔ اُنہوں نے ابھی قدسیہ کے ساتھ بولنا شروع نہیں کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا خاوند ان کے بھائی جان کے لیے خون دے۔

بھائی جان تکیے سے سر لگائے کھڑکی کی طرف تکے جا رہے تھے اور اُن کی سانس سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ مَیں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تو اُنہوں نے پُوچھا:

"وہاں کون ہے، کھڑکی میں؟"

مَیں نے کہا:

"کوئی نہیں بھائی جان! شام اُتر رہی ہے۔"

"شام!" اُنہوں نے مسکرا کر حیرت سے پُوچھا "اتنی جلدی؟"

تی:

پھر اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور مَیں انہیں اندر کی شام کے حوالے کر کے باہر کی شام میں چلا آیا۔

شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی اور ناران کے پہاڑ اندھیروں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ لیڈر اپنی کرنٹ تبدیل کر کے ہمارے دروازے پر آ گیا اور سوئی بھا کر ہمیں جگانے لگا۔ وہ ہمیں کھانا کھلانے لے جا رہا تھا اور ہم تھکاوٹ کی وجہ سے ایک قدم چلنے کو تیار نہ تھے۔ اس نے چیخ کر کہا:

"اُدھر وہ دونوں مُردوں کی طرح لیٹے ہوئے ہیں۔ اِدھر تم تینوں نہلائے دُھلائے کفنائے پڑے ہو۔ اگر اسی طرح پہاڑ پر آنا تھا، تو مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

"اس کو مارو۔" اِدھر عماد نے نعرہ لگایا۔

"ناں ناں! لیڈر کو نہیں مارنا!" ... مسعود نے محبت کے ساتھ کہا ... "عوام کو مارو۔"

"پھر اِدھر کی عوام تو مر چکی ہے، مشرقی پاکستان کی۔" اعظمی نے کہا۔ "اب تمہاری باری ہے۔"

"یار عمر!" مُفتی نے کمبل کندھوں پر کھینچ کر کہا۔ "یہ کیسے بے حیا لوگ ہیں تمہارے پیرو۔ ایک تم ان کی خدمت کرتے ہو، انہیں ہر سال سیر پہ لے نکلتے ہو۔ دُوسرے یہ تمہارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایسی لیڈری سے تو ڈوب مرنا بہتر ہے۔"

"یہ ہمارا لیڈر نہیں مُفتی جی!" ... عماد نے اپنی کوٹھڑی سے چلّا کر کہا ... "یہ بچیوں کا لیڈر ہے۔"

اس پر دونوں کوٹھڑیوں نے مل کر زندہ باد کا ایک نعرہ مارا اور مسعود اور اعظمی اپنی اپنی سوٹیاں لکڑی کی دیوار پر بجانے لگے۔ ہوٹل کا مالک خان بابا بھاگ کر آیا۔ اس کے ساتھ اس کا نوکر ملازم بھی۔ دونوں کے ہاتھ میں چیڑھ کی جلتی ہوئی لکڑیاں تھیں جو وہ جلدی میں چولہے سے کھینچ لائے تھے۔

مُفتی نے تالی بجا کر کہا:

"لے یار عُمر! تیرا اشتعل بردار جلوس نکلنے کا انتظام ہو گیا"۔

پھر ہم سب اتنے زور سے "لوڈی بچہ ہائے ہائے! لوڈی بچہ ہائے ہائے" کے نعرے لگانے لگے کہ ساری وادی میں ایک کہرام سا مچ گیا اور خان بابا اور اس کا گونگا ملازم جلتی ہوئی لکڑیاں بُجھا کر واپس باورچی خانے میں چلے گئے ــــ لیڈر دُنیا بھر کی غلیظ گالیاں دیتا ہُوا جائے واردات سے غائب ہو گیا اور ہم اپنی اپنی چارپائیوں پر پھر خاموشی سے لیٹ گئے۔

گوجروں کے قافلے اپنا اپنا مال لے کر ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کچھ مویشیوں کے قدموں کی چاپ تھی کچھ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کبھی کبھی اس قافلے میں ٹرانسسٹر کے بول سنائی دے جاتے یا پھر پس منظر میں دریائے کنہار کی تیز موسیقی تھی۔

عماد نے اپنی کوٹھڑی سے آواز دے کر کہا:

"مسعود!"

اور مسعود نے اپنی چارپائی سے جواب دے کر کہا:

"ہاں!"

پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک سب چُپ رہے پھر مُفتی بولا:

"لعنت ہو تم دونوں پر۔ ایک نے کہا مسعود۔ دوسرے نے کہا ہاں اور بات کوئی ہوئی نہیں"۔

عماد نے کہا:

"مُفتی جی! میں نے اس کا جواب سُنا ہی نہیں، اس لیے خاموش ہو گیا"۔

مسعود نے کہا:

"اس نے ہنکارے کا جواب نہیں دیا، اس لیے میں بولا نہیں"۔

اس پر ایک لمبی بحث چل نکلی۔ اعظمی کہہ رہا تھا میں نے مسعود کا ہاں نہیں سُنا۔ میں اور مُفتی کہہ رہے تھے مسعود نے ہاں کہا ہے۔ دونوں طرف سے تاویلیں دی جانے لگیں، لیکن کسی پارٹی نے دوسری پارٹی کی بات نہ مانی اور جھگڑا طول کھینچ گیا، عین اسی طرح جیسے عید کے چاند پر جھگڑا ہُوا کرتا ہے۔ پشاور میں ایک دن پہلے عید ہو جاتی ہے۔ لاہور میں ایک دن بعد بحث مباحثے کے درمیان کافی بدمزگی ہوئی۔ میں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی، تو ہر ایک نے میری نیت پر شبہ کیا اور میرے کمرشل بی ہیویئر کو دل کھول کر گالیاں دیں۔ پھر ہم سب کے دل میں ایک دُوسرے کے بارے میں جو جو شکوک و شبہات تھے وہ آہستہ آہستہ باہر آنے لگے۔ ہم سب نے اپنے اپنے شکوک کا دل کھول کر اظہار نہیں کیا، بس اشارے سے کرتے رہے اور دُوسرے ان اشاروں کو اچھی طرح سے سمجھتے رہے۔ صرف مُفتی نے اعظمی کو کھری کھری سُنا کر اور اس کا بولنا بند کر دیا۔ یہ کھری کھری باتیں پچھلے تین چار سال کی غلط فہمیوں پر محیط تھیں اور مُفتی انہیں چوگنا کھلا کر اندر ہی اندر پال رہا تھا۔ اس وقت اعظمی نہ بھاگ سکتا تھا نہ کان بند کر سکتا تھا نہ کوئی اس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔

جب سب نے حسب توفیق اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو دونوں کوٹھڑیوں میں خاموشی پھیل گئی۔ کوئی بیس منٹ تک سارے مجرمین اپنی اپنی چارپائیوں پر چُپ چاپ لیٹے رہے۔ پھر اعظمی دھیمی آواز میں پکارا:

"مُفتی جی!"

"جی جی جی" مُفتی جی نے پان تھوک کر کہا۔

"آج کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"آج غم کھاؤ!" مسعود نے چولہے سے کہا۔

"شاہ جی سے چیز مانگو سا ہی سوال کا" عماد بولا۔

"چیز میرے پاس ہے" میں نے ایمانداری سے کہا۔ "لیکن اتنا نہیں کہ ہم سب کا پیٹ بھر سکے"۔

"خان سے دال وال لے لیتے ہیں" مسعود نے رائے دی۔

"اس کے پاس کیا ہو گا اس وقت" عماد بولا۔

"ضرور ہو گا" اعظمی نے کہا۔ "وہ جو جلتی لکڑیاں اُٹھا کر لائے تھے، تو چولہے ہی سے

تو لائے تھے۔"

"چولہے پر چائے ہو گی۔" میں نے دردناک آواز میں کہا۔

"اوئے بدذاتو! مرے کیوں جاتے ہو۔" مُفتی نے نیا پان کلّے میں دباتے ہوئے کہا۔ "ابھی لیڈر آ جائے گا اور اس کی گود میں سامانِ خورد و نوش ہو گا۔"

"لعنت تیری سائیکالوجی پر۔" مسعود نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر ہم سب گیدڑوں کی طرح بولے:

"لعنت لعنت لعنت۔"

جب گیدڑ بولنے بند ہوئے اور کوٹھڑی کے سامنے چلتی ہوئی کوہل کے پانی کی آواز سنائی دینے لگی، تو عتاد نے کہا:

"یار مسعود عشا پڑھ لیں۔"

مسعود اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ٹوپی مار کر چارپائی سے اُٹھا اور آستین چڑھانے لگا۔

مُفتی نے کہا:

"یار کتنی رکعتیں ہوتی ہیں اس نماز میں؟"

"بس مُفتی جی! کیا نماز کیا رکعتیں۔" مسعود نے آہستہ سے کہا... "مٹی پھوڑی کرنا ہے۔"

پھر وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف دیکھ کر سنجاری کے انداز میں بولا: "ودی ودی۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔"

اس کی آواز سُن کر عتاد بھی باہر نکل آیا اور دونوں کوہل کے کنارے بیٹھ کر برف کے پانی سے وضو کرنے لگے۔

مُفتی نے اپنا مخرج صحیح کر کے کہا:

"شاہ جی! سو گئے؟"

میں نے کہا:

"نہیں جی، جاگ رہا ہوں۔"

کہنے لگا:

"یہ نمازی لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن ان کے ساتھ چل نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو شاہ جی!" اس نے باآوازِ بلند کہا۔ "میں نے زندگی میں جس آدمی کی بھی عزت کی ہے، اُس کے ساتھ کبھی نہیں چلا۔ میری عقیدت ضرور اس کے جلو میں رہی ہے لیکن میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔"

میں نے کہا:

"مُفتی جی! یہ عزت بھی خوب چیز ہے۔"

کہنے لگا:

"اللہ اسے خوش رکھے، اس نے زندگی کے ہر مشکل مقام میں میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ میں نے جس سے بھی تعلقات منقطع کرنے چاہے، فوراً اس کی عزت کرنا شروع کر دی۔ چند دنوں کے اندر اندر فریقین کی طبیعتوں پر بوجھ پڑے بغیر تعلق ٹوٹ گیا۔"

"اور وہ جو دھرمپورے کی استانی تھی... کیا نام تھا اُس کا؟"

"عالم بی بی۔" مُفتی جی نے بھولے سے کہا۔

"اس سے تعلقات منقطع کرنے کا بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا تم نے؟"

"ہاں ہاں ہاں۔" مُفتی کہنی کے بل ہو کر بیٹھ گیا۔ "اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس میں اُس ہستی کا کمال تھا جس نے یہ تعلقات ختم کروا دیے۔ دور بیٹھے بیٹھے۔ یہاں سے پانچ ہزار میل دور۔"

میں نے کہا:

"تم قدرت اللہ شہاب کی بات کر رہے ہو؟"

"بالکل۔" مُفتی نے عقیدت سے کہا۔ "میں اس کی بات کرتا ہوں اور ڈنکے بجا کر کرتا ہوں۔"

"لیکن تم لوگوں کی نظروں میں اُسے کتنا ذلیل کرتے ہو؟" میں نے دُکھی ہو کر کہا۔

"ہُوا کرے۔ میں کوئی کم ہوتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے لوگ مجھے ایک چھوٹے درجے کا گھٹیا، ٹٹ پونجیا، مطلب پرست، افسر باز اور سائیکوفینٹ نہیں سمجھتے؟"

میں نے کہا:

"سمجھتے ہیں۔"

"پھر شاہ جی!" مُفتی نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "لکڑی کے ساتھ جب لوہا لگتا ہے تو ساری لکڑیوں کو تیرنے نہیں دیتا۔ میں تو اس کو ذلیل کر دوں گا۔ اس نے میرے ساتھ کون سی بھلائی کی ہے؟"

میں نے کہا:

"بھلائی برعکس اور محبوب کی باتیں ہیں اور میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"شاہ جی! وہ دوسری بات کرو!" اعظمی نے اپنی کوٹھڑی سے ہانک لگائی۔ "دھرم پورے کی عالم بی بی والی۔"

"بہت تیری سُور زادے۔" مُفتی نے ہنس کر کہا۔ "تو نے اِدھر کان لگا رکھے تھے۔"

"میرے کان تو ہر وقت آپ کی خدمت میں سوا دھان رہتے ہیں مُفتی جی!" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ قصّہ کب کا ہے؟"

"بتا بھئی!" مُفتی نے مجھے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"یہ پچھلے سال کا ہے اعظمی!" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یعنی جب مُفتی اُنتیس سال کا تھا؟" اعظمی نے حیرت سے پُوچھا۔

"بکواس کرتا ہے۔" مُفتی نے ہنس کر کہا۔ "اس وقت میری عمر پورے اڑسٹھ کی نہیں ہوئی تھی۔ تین مہینے باقی تھے ابھی۔"

"ارے شاہ!" اعظمی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "ہمیں بتایا ہی نہیں۔"

میں نے کہا:

"میں نے کون سا سکھ پایا ہے اس قصّے سے جو تمہیں بتاتا۔ عجیب مصیبت کے دن تھے۔ مُفتی سنبھالے سے نہیں سنبھلتا تھا۔ ایک اکیلی میری جان، پھر اس بُڈھے کے تقاضے۔ میرے تو بال سفید ہو گئے۔ خدا بھلا کرے احمد بشیر کا اور بانو قدسیہ کا جنہیں میں نے اپنے ساتھ شامل کر کے کچھ بوجھ ہلکا کیا، ورنہ یہ اب تک قتل کر چکا ہوتا۔"

"بہت تیرے کی شاہ!" اعظمی زور سے ہنسا اور اس کی ہنسی مُفتی کی ہنسی میں دب کر رہ گئی۔

عالم بی بی پچاس پچپن برس کی خاتون تھی۔ چمپئی رنگ۔ چمکدار آنکھیں۔ نوجوان چھب کی ہُوئی جلد، محبت بھرا دل، خوش گفتار، نہایت مکّار، نہایت سیانی، نہایت بھولی۔ میں نے آج تک کسی عورت کو اس کی طرح روتے ہُوئے نہیں دیکھا۔ دل چاہتا تھا وہ روتی رہے اور آدمی بیٹھا اُسے دیکھتا رہے۔ اس کے سینے میں محبت کرنے والا دل اور اس کے دماغ میں مرد کو قتل کرنے کے ڈیزائن بھرے تھے۔

"لو کھوا کھاؤ!" عمر ایک آدمی کے سر پر روٹیاں اور شوربے کی ڈِگی رکھوا کر لے آیا۔

"آگیا آگیا آگیا... لیڈر آگیا!" مُفتی نے زور کا نعرہ لگایا اور عمر نے بچوں کی طرح اُس کی نقل اُتاری۔ پھر عمر ہماری کوٹھڑی کے اندر پڑے ہُوئے میز کو اپنے رُومال سے صاف کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے کھانے کا سامان میز پر چُنا اور بڑبڑانے لگا۔ دراصل وہ ہمیں گندی گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا کہ اگلے سال وہ ہمارا لیڈر نہیں بنے گا اور مُفتی آہستہ آہستہ گنگنا کر کہہ رہا تھا:

"تو لیڈر بنے نہ بنے بیٹے تجھ سے اچھے عوام اور کہاں ملیں گے۔" مُفتی کی یہ بات سُن کر وہ اور چڑتا اور گالیوں کی بوچھاڑ تیز تر کر دیتا۔

اعظمی اپنی اُونی ٹوپی کانوں تک کھینچ کر ہماری کوٹھڑی میں آگیا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ نمازیوں کی نماز بھی ختم ہونے والی ہے اور انہوں نے کھانے کی خبر رکوع میں جاتے ہُوئے سُن لی ہے۔

مُفتی نے کہا:

"وہ آجائیں، تو کھانا شروع کریں گے۔ جب تک ہم ہاتھ دھو لیں۔" پھر وہ ہاتھ دھونے

باہر کو پل پر چلا گیا، لیکن پانی میں ہاتھ ڈالے بغیر واپس آ گیا کیونکہ باہر سردی کافی تھی اور برف کا پانی اس لائق نہیں تھا کہ اس میں ہاتھ ڈالے جائیں۔

کھانا کھاتے ہوئے ہم سب خاموش تھے اور کھا چکنے کے بعد اونگھنے لگے تھے۔

کسی نے کسی سے بات نہ کی، جن کو ہاتھ دھونے تھے وہ صابن دانی لے کر کو پل پر چلے گئے جنہیں پونچھنے تھے وہ بستر کے ساتھ پونچھ کر لیٹ گئے۔ دونوں کوٹھڑیوں میں چارپائیوں پر سگریٹوں کے جگنو چمکنے لگے۔ مُٹھی سو گیا۔ اُدھر سے بھی عقاد کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ مسعود نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا کرنے میں چمکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"اشفاق اب تیری عمر کتنی ہے؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، تو وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

جب میں روم میں تھا، تو میری عمر ستائیس برس کی تھی۔ اُس وقت بھی میں ایک ایسی ہی کوٹھڑی میں رہتا تھا، لیکن وہ کوٹھڑی زمین پر نہیں تھی، بلکہ ایک اونچے مینشن کی چھٹی منزل پر تھی اور مجھے ایک سو سولہ سیڑھیاں طے کر کے اس میں پہنچنا پڑتا تھا۔ ایک کونے میں میرا بستر تھا۔ پائنتی کی طرف چلمچی سٹینڈ تھا۔ کھڑکی کے پاس لکھنے کی میز تھی۔ اس کے ساتھ کپڑوں کی الماری اور الماری کے ساتھ ایک وارڈروب جس پر میں نے سٹوو لیمپ رکھا ہوا تھا اور جہاں میں صبح سویرے اٹھ کر کافی بنایا کرتا تھا۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے مجھے اپنے گھر کے سارے لوگ باری باری سے یاد آتے تھے۔ ہر چہرے کے داغ نمایاں ہو جاتے تھے۔ ہر آنکھ میں شفقت کی فراوانی ہو جاتی تھی۔ ہر آواز میں محبت کا لوچ بڑھ جاتا تھا۔ ہر لمس کا دباؤ گہرا ہو جاتا تھا اور ہر دباؤ کے ساتھ تنہائی کی شدت اور طویل ہو جاتی تھی۔ کچھ تنہائیاں اوائلِ عمر کی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے لیے بھٹی کا کام دیتی ہیں۔ کچا کورا برتن تنہائی کی شیر گرم حدت سے پکنے لگتا ہے۔ ذرات گرم ہو کر ایک دوسرے کو پکڑنے لگتے ہیں اور کورا برتن بجنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ زنگ لگتا ہے نہ ڈوبتا ہے مسلسل ہچکولے کھانے کے لیے ایک وجود بن جاتا ہے۔

میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور ہمارے گاؤں میں میری بڑی آپا کی سہیلی باجی سلمٰی آئی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کالج میں پڑھتی تھیں اور ریاضی کی طالبہ تھیں۔ ان کے کانوں میں سونے کی نازک اور منقش

مثلثیں آویزاں تھیں۔ وہ جب بات کرتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے ہنس رہی ہوں، جب مطالعہ کرتی تھیں تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کو یاد کر رہی ہوں۔ دونوں سہیلیاں شام کے وقت جب کھیتوں میں سیر کرنے جاتی تھیں، تو سارے راستے فضیلت کے باب بن جاتے تھے۔ سیدھے کھڑے ہونا، بالوں میں کنگھی کرنا، کنپٹیاں صاف کرنا اور ناک میں انگلی نہ ڈالنا باجی سلمٰی نے سکھایا تھا۔ وہ جتنے دن ہمارے گھر میں رہیں میں اپنے دوستوں کے ساتھ گیند وکھونڈی کھیلنے نہیں گیا۔ ماں کے ساتھ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا۔ ابا جی کے بوٹ اُتروانے اور اُن کے سلیپر لانا کبھی نہیں بھولا۔ دراصل میں جو کام بھی کرتا تھا وہ باجی سلمٰی کے نام معنون کر کے کرتا تھا۔ میری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں، جو کچھ بھی تھا باجی سلمٰی کے لیے تھا اور مجھے یقین تھا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور لوٹ کر باجی کی خدمت میں پہنچنا ہے۔ گرمیوں کی جس صبح انہیں ہمارے گاؤں سے جانا تھا وہ صبح بڑی گرم اور جاں سوز تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ درخت خاموش تھے اور کھیت حبس کی وجہ سے ہانپ رہے تھے۔ گھر کے سب لوگ سلمٰی باجی کو چھوڑنے سٹیشن پر گئے تھے اور گھر میں صرف میں اور اماں جی رہ گئے۔ ہر ایک میری اس بیہودگی پر کہ میں باجی کو الوداع کہنے نہیں جا رہا، نالاں تھا۔ خاص طور پر میرے بڑے بھائی جو باجی کے ساتھ گھنٹوں علمی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔

جب مجھے اپنے گھر کے اندر ریل کی سیٹی سنائی دی تو میرا اندر بالکل خالی ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے وجود کے آر پار دیکھ رہا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گیا اور چھت پر آ گیا۔ کھجوروں کے جھنڈ سے پرے پرانی حویلیوں کے اُس پار ریلوے لائن تھی جو چھت سے صاف نظر آتی تھی، لیکن اس کا فاصلہ انچوں تک ناپا ہوا تھا۔ میں اپنے کوٹھے کے موگھے دار پردے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اینٹوں سے گرد کی خوشبو آ رہی تھی اور موسم میں رات کی باسی گرمی کا خمیر تھا۔ پھر ایک اور سیٹی سنائی دی اور اس کے ساتھ انجن کی چھک چھک چھکا چھک کی آواز آنے لگی۔ حویلیوں کے کنگروں سے ذرا پہلے سیاہ دھوئیں کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر انجن نے سیٹی بجائی اور سنپولیا سی گاڑی کھجوروں کے جھنڈ سے باہر نکل آئی۔ جھنڈ کے پیچھے آدھی گاڑی کو تو میں نے نکلتے دیکھا، لیکن اس کے بعد مجھ میں طاقت نہ رہی۔ میں

پسی ہوئی کچی چھت پر لیٹ گیا اور میری ایڑیاں تیزی سے ہوٹل کی چھت پر چلنے لگیں۔ اگر میں بڑی عمر کا آدمی ہوتا اور میری شہ رگوں میں لچک نہ ہوتی، تو میں یقیناً مر جاتا۔ میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جاتی اور میرے ناک منہ سے سیاہی مائل خون تیزی سے بہہ کر بائیں گال پر اترتا اور پھر زمین پر گر کر منجمد ہو جاتا۔ لیکن یہ کیفیت وقتی تھی۔ میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک اسی طرح چھت پر پڑا رہا اور لوٹنیاں لگاتا رہا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف چلتی رہی۔ یہ بے چینی یہ تڑپ یہ ذبح ہونے کی کیفیت بڑی تکلیف دہ تھی، لیکن اس تنہائی اور اداسی کے پاسنگ بھی نہ تھی جو سلمیٰ باجی کے چلے جانے کے بعد میرے وجود کے اندر آئی تھی۔ میری حالت اس اناڑی نے نواز کی تھی جو بانسری کے سوراخ میں پھونکیں مار مار کر اپنے آپ کو بانسری سے زیادہ خالی اور روزن دار کر چکا ہو۔ مجھے اپنے اردگرد ہر شخص کی ذات ایک روح دکھائی دیتی تھی اور میں زندہ ہونے کے باوجود روحوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں ایک جونک بن کر اپنے وجود کے ساتھ چمٹا ہوا تھا اور میرے وجود کا خون ختم نہیں ہوتا تھا۔

جوانی کا دور بڑا رنگین اور پُرفریب ہوتا ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ آدمی محبت کرے اور اس ثمر کی لذت سے آشنائی حاصل کرے۔ یہ وقت بجائے خود بڑا کیف پرور اور سرور انگیز ہوتا ہے۔ اس میں آدمی اور نہیں تو محبت کرنے والوں کے قریب ضرور رہتا ہے۔ مرتا نہیں تو کم از کم ان لوگوں کو ضرور دیکھتا رہتا ہے جن کے بدن موت کا فرشتہ اپنی نازک انگلی سے چھوتا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس دور کا خالی ہاتھ انسان محبت کرنے والوں کی تنہائی اور اداسی کی ٹھنڈک سے اپنے وجود میں ایک مستقل کپکپی محسوس کیے جاتا ہے اور یہ کپکپی چپ چاپ اس لرزاہٹ کے ساتھ مل جاتی ہے جب وہ رحم مادر میں تھا اور اسے محفوظ و پُرسکون ہونے کے باوجود تنہائی کا شعور تھا۔ لیکن یادداشت بہت کمزور تھی۔

قیامِ روما کے دوران میرے پاس ایک نوجوان آیا۔ یہ پاکستان کے کسی بڑے محکمے میں اچھا افسر تھا اور ٹریننگ کے لیے ہالینڈ بھیجا گیا تھا۔ ہالینڈ میں یو این او کے اس مخصوص کورس کے لیے دنیا کے اور ملکوں سے بھی سرکاری ملازم آئے ہوئے تھے۔ ان میں آسٹریا کی ایک

لڑکی وکٹوریہ بھی تھی جو چینی نژاد کرسچین خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انگریزی بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔ یہ پاکستانی نوجوان میرے پاس میرے کمرے میں کوئی ہفتہ بھر رہا اور ہر وقت وکٹوریہ کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنا کورس دو ہفتے پہلے ختم کر کے آ گیا تھا اور وکٹوریہ کو ابھی ایک پندھواڑہ اور وہاں صرف کرنا تھا۔ جب وہ وکٹوریہ کے حسن و جمال، اس کی مسکراہٹ، اس کے تبحرِ علمی اور اس کی شفقت کا ذکر کرتا، تو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی اداسی پھیل جاتی اور وہ روم میں ہوتے ہوئے ڈین ہاگ کی پیچ دار گلیوں میں اتر جاتا اور اس کا بایاں ہاتھ خود کلامی کرنے والے انسان کی طرح کھلنے اور بند ہونے لگتا —— ہم جب بھی باہر گھومنے کے لیے جاتے وہ کسی نہ کسی جگہ سے روم کا ایک ویو کارڈ ضرور خریدتا۔ مجھ سے الگ ہو کر اس پر پتہ لکھتا۔ پیغام والی جگہ پر ایک دو سطریں گھسیٹتا اور کسی قریبی ڈاکخانے میں وہ کارڈ پوسٹ کر کے مجھے اعتماد میں لینے کی غرض سے مسکراتا اور کہتا:

"وکٹوریہ کو لکھا ہے تمہارا بھی سلام بھیجا ہے۔"

میں نے اتنے بڑے شہر، ایسے پُررونق شہر، مجسموں اور فواروں کے شہر اور کیپٹل آف دا ورلڈ میں ایسا تنہا اور اداس آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ باتیں کیا کرتا اور اندر سے غائب رہتا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ روم کے گلی کوچوں میں گھوما کرتا اور غیر حاضر رہتا۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا:

"میں نے سنا نہیں۔"

"میں نے دیکھا نہیں۔"

"میں نے خیال نہیں کیا۔"

"میری توجہ نہ تھی۔"

اس کے باوجود وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ میرے پاس نہیں تھا۔ میرے روم میں نہیں تھا۔ اپنے پاکستان میں نہیں تھا۔ وہ محبت کا مارا نہ تھا۔ محبت میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ رہتی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ناچا کرتیں، لیکن میں نے اپنی زندگی میں ایسا تنہا اور اداس نوجوان اور کوئی نہ دیکھا تھا۔ میں جب بھی اس سے وکٹوریہ کے بارے میں پوچھتا وہ بغیر کسی تامل کے میرے ہر سوال

کا جواب دیتا۔ جب بھی از خود اس کا ذکر کرتا پوری تفصیل اور ساری جزئیات کے ساتھ کرتا۔

اس کے باوجود میرے اور اس کے درمیان تنہائی کا کوئی ہاتھ بھر کا فاصلہ رہتا اور میں اور سارا روم اور روم کے سارے مجسمے اور سارے کلیسے اور اس کے باغات اور اس کے گورے بدنوں کی لڑکیاں، کوئی بھی اس کی تنہائی دُور نہ کر سکتیں۔ ایک ہفتہ میرے پاس قیام کرنے کے بعد وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر نیپلز چلا گیا اور وہاں سے دخانی جہاز میں سوار ہو کر پاکستان روانہ ہو گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھ پر اُداسی کا ایسا دورہ پڑا کہ میں نے یونیورسٹی سے پانچ دن کی رخصت لی۔ اپنا اٹیچی کیس تیار کیا اور ہالینڈ روانہ ہو گیا۔ سہ پہر کے قریب میں ڈین ہاگ پہنچا۔ تھوڑی دیر ہوٹل میں سویا۔ پھر خاموشی کے ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ پانی پی کر ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی، لیکن نیند نہ آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا، تو معلوم ہوا کہ ابھی ہیگ میں شام نہیں ہوئی۔ ذرا ٹھہر کر ہوگی۔ میں بے مقصد بازاروں میں گھومتا اور دکانوں میں جھانکتا رہا۔ سائیکل چلاتی لڑکیوں کو دیکھتا رہا اور جب شام ہوئی تو میں وکٹوریہ کی انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا۔ وکٹوریہ اپنے کمرے میں تھی، لیکن اس نے کہلا بھیجا کہ مہمان کو ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔ میں ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ کر رسالے دیکھتا رہا، پھر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کی تفصیلات کا جائزہ لیتا رہا، پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور دوبارہ رسالوں کی تصویریں دیکھنے لگا۔ سامنے کا دروازہ کھلا اور سفید براق کپڑوں میں ملبوس وکٹوریہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا،

"وکٹوریہ۔"

میں نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ کی انگلیاں آہستگی سے دبائیں اور سلیقے کے ساتھ کہا:

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام اشفاق احمد ہے اور میں راحت کا دوست ہوں۔"

"راحت!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کیسا ہے وہ؟ چلا گیا یا ابھی روم میں ہی ہے؟"

"چلا گیا۔" میں نے کہا۔

"روم میں وہ تمہارے پاس ہی ٹھہرا تھا نا؟" وکٹوریہ نے کرسی میرے قریب کھینچ لی اور ہم بڑی آہستگی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ کہنے لگی:

"اُداس تو نہیں تھا؟"

"تھا۔" میں نے مُسکرا کر کہا۔ "کچھ زیادہ ہی اُداس تھا۔ بہت ہی تنہا۔ ہر وقت تمہیں یاد کرتا تھا۔"

وکٹوریہ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی سفید کلائی پر ریسٹ واچ کی طلائی زنجیر ٹھیک کرنے لگی، پھر اُس نے سر اُٹھایا اور بولی:

"کب گیا؟"

میں نے کہا:

"روم سے تین دن ہوئے روانہ ہو گیا تھا۔ اب معلوم نہیں نیپلز بھی کچھ دن ٹھہرا یا نہیں۔"

"نیپلز!" اس نے چیخ کر کہا۔ "کیوں؟ کیا ہوائی جہاز سے نہیں گیا؟"

میں نے کہا:

"نہیں، وہ تو بحری جہاز سے گیا ہے۔"

"اوہ مسیو اشفاق!" اس نے دُکھی ہو کر کہا۔ "اسے بحری جہاز میں نہیں جانے دینا تھا۔ کتنے دن لگتے ہیں پاکستان پہنچنے کے لیے؟"

"نو دن۔" میں نے جواب دیا۔

"نو دن اور نو راتیں وہ اکیلا رہے گا، اکیلا سوچے گا۔ اکیلا بیٹھے گا۔ یہ اُس نے کیا کیا؟"

مجھے وکٹوریہ کی باتوں سے کچھ کرسٹل قسم کی محبوبہ ہونے کا شُبہ ہوا۔ وہ راحت کے بارے میں متفکر ضرور تھی۔ لیکن اس کی پریشانی ٹیکنیکل قسم کی تھی۔ اس میں رُوح کا فقدان تھا اور بار بار

سر جھکا کر تیز تیز کر رہی تھی۔ وہ کافی خوبصورت لڑکی تھی اور اُس کی گردن عام چینی عورتوں کے مقابلے میں لمبی تھی۔ اس کے بال بالکل سیاہ تھے اور اس کی ناک اس قدر چپٹی نہ تھی۔ اب اس کے سفید لباس میں مجھے لیموں کے رنگ کی لکیریں بھی نظر آنے لگیں۔ وہ محبت میں مبتلا ضرور دکھائی دیتی تھی لیکن اس قدر بھیگی نہ تھی۔ اُسے دُکھ ضرور تھا۔ لیکن وہ تنہا نہ تھی۔ اُداس نہ تھی۔ ہم بڑی دیر تک اسی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اُس نے آہستہ سے پُوچھا:

"خاور کے متعلق کیا کہتا تھا؟"

"خاور!" میں نے حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"خاور کے بارے میں اُس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" وکٹوریہ نے گلا صاف کر کے پُوچھا۔

"نہیں۔" میں نے اعتراف کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "وہ کچھ کہتا بھی تھا اور نہیں بھی کہتا تھا۔"

"وہ بیمار ہے اور خاموش ہے اور اس کو رونا نہیں آتا۔"

"وہی خاور ناں۔" میں نے دماغ پر جھوٹ موٹ زور دیتے ہوئے کہا۔ "جو اپنا .... کیا نام ... اُدھر..."

"کراچی سے آئی ہے۔" وکٹوریہ نے کہا۔ "تمہارے پاکستان سے۔"

"اُسے وہ روم سے ویڈیو کارڈ ضرور بھیجا کرتا تھا۔" میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اس سے زیادہ اُس نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔"

"بڑا سنگ دل ہے تمہارا دوست!" یہ کہہ کر وکٹوریہ پھر خاموش ہو گئی۔

ایک مرتبہ سانتا ماریا ماجورے سے ٹرام میں سوار ہوتے وقت رش کی وجہ سے راحت کے کوٹ کا کالر اُلٹ گیا تھا اور اندر کی جیب میں احتیاط سے رکھا ہوا ویڈیو کارڈ نمایاں ہو گیا تھا۔ اس پر لکھا تھا کہ

تو ہمی دانی کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را!

میں اس وقت اس شعر کا محلِ استعمال نہ سمجھا تھا، لیکن اب بیگ میں آجانے کے بعد اور وکٹوریہ سے مختصر سی ملاقات کے بعد بہت سی کھوئی ہوئی کڑیاں آپس میں ملتی جا رہی تھیں۔ وکٹوریہ راحت کی محبوبہ نہ تھی بلکہ اس کی رازداں اور کونفی ڈانٹ تھی۔ اس نے ایک صبح ہوسٹل میں خاور کے کمرے سے گزرتے ہوئے اسے تلاوت کرتے سنا تھا اور اس کا کافر دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مومن ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنے کمرے میں اخبار بچھا کر فجر کی نماز پڑھنے لگا اور آہستہ آہستہ دونوں جانماز کو آڑے رُخ بچھا کر اکٹھے نماز پڑھنے لگے۔ جب انسانوں کے درمیان جسم کی محبت ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچنے لگتے ہیں۔ جب ان میں آگہی اور دانش کی قدر مشترک ہو تو وہ لمبی سیروں، لمبے راستوں اور لمبے سفر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور جب ان کی محبت پر رُوحانیت کا ابر اُتر آئے، تو وہ بستروں کے انبار میں دو معصوم بچوں کی طرح تانے کی ایسی چادریں بن جاتے ہیں جس سے ان کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ یا تو چیخ چیخ کر مدد کرنے والوں کو بلاتے ہیں یا دم گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ یہی کیفیت خاور کی تھی۔

جب میں اور وکٹوریہ اس کے کمرے میں پہنچے، تو وہ عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ہم ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے سلام پھیر کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا مانگی اور اُٹھ کر چپل پہننے لگی۔ پھر اس نے جانماز تہہ کیا اور اپنے سرہانے رکھ دیا۔ وکٹوریہ نے اس سے میرا تعارف کرایا، تو اس نے آہستگی سے "السلام علیکم" کہا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات شروع کرنے کی کوشش کی، لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں نے ایسی تنہا، اس قدر اُداس، اتنی شانت اور ایسی دُکھی لڑکی اپنی ساری عمر میں نہیں دیکھی۔ اس کا منگیتر پاکستان نیوی میں ملازم تھا اور اس نے کبھی کسی کا دل نہ دُکھایا تھا۔ خاور بھی اس کا دل دُکھانا نہیں چاہتی تھی۔

یہی تنہائی جب رنگین عمر کے آخری حصے میں پہنچتی ہے تو آدمی انسانوں کی بولی سمجھنے سے قاصر ہونے لگتا ہے، پھر وہ پھولوں سے، جانوروں سے، دیواروں سے اور موسموں سے ڈائیلاگ شروع کر دیتا ہے۔ ایک بھرے ہوئے گھر میں جہاں اس کی بے پناہ عزت ہوتی ہے، جہاں اسے بے پناہ مان دیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک پرانی کرسی، اُدھ کھلے دریچے اور بند

کتاب سے قریب تر پاتا ہے۔ ان کی اُداسی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب ان کے بچّے ان کے لیے فادرز ڈے یا مدرز ڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تنہائی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب گھر کے لوگ کسی اہم کام میں ان سے مشورہ لیتے ہیں یا ان کے فیصلوں پر سر جھکانے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں کوئی طویل بیماری اُن کی تنہائی کم کرنے میں سب سے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کچھ بدنصیب ایسی بیماریوں سے صحت یاب ہو جاتے ہیں، تو ان کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جاتا ہے اور وہ تنہائی کی ڈوری سے کھنچتے ہوئی نفی کرتے نیستی کی آباد دُنیا تک پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی بات سمجھنے اور ان سے کلام کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اصل میں تکبّر اور زعم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے تنہائی، مفارقت اور ایکانت۔ بڑے بڑے ولیوں، قطبوں اور غوثوں میں جب تکبّر و زعم کا بیج پھوٹنے لگتا تھا، تو انہیں تنہائی اور مفارقت کا داغ دے کر سنسان وادیوں یا آباد شہروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا، جہاں وہ کنجری بن کر ناچنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ناچ ناچ کر یار منانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہ تو دیوانے لوگ تھے مگر کوئی معمولی آدمی بھی تخلیق کے کرشموں اور تخلیقی قوتوں سے آشنائی کا خواہشمند ہو تو اُسے ایک طویل عرصے کے لیے اپنے آپ کو تنہائی اور مفارقت کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جب یہ تنہائی اس کا خون چوسے گی، اس کی صحت تباہ کرے گی، اس کے عزم و اعتماد کو دیمک کی طرح چاٹے گی، اس کے ایمان اور اس کی خوشی کو گھن بن کر کھا جائے گی، تو پھر آہستہ آہستہ اُسے تخلیق کا عرفان ہونے لگے گا، تخلیقی عمل کا شعور پیدا ہونے لگے گا۔

تنہائی، اُداسی، مفارقت اور ایکانت کے بارے میں سوچتا سوچتا میں بھی نیند کی وادی میں اُترنے لگا۔ خان بابا کی کوٹھڑی کے اندر میلے چکٹ تکیے پر سر رکھتے میرا باہر کی دُنیا سے جو تعلق تھا اُس کا آخری رشتہ ایک سیٹی کی آواز تھا جو میری نیند کی پہلی جھوک میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔

صبح سویرے چھ بجے سے ذرا پہلے لیڈر سوٹی لے کر ہماری کوٹھڑی میں آ گیا اور ہمارے پیروں اور سروں پر ٹھوکے مار کر ہمیں جگانے لگا۔ ہمارا لیڈر ایک روشن ضمیر، مستعد اور نیک نفس انسان ہے۔ اس کا دل جس قدر صاف ہے اسی قدر دماغ بھی صاف ہے۔ جب وہ

ایک پروگرام اپنے ذہن میں طے کر لیتا ہے تو پھر اس سے بال برابر انحراف نہیں کرتا۔ رات ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ صبح سویرے جھیل سیف الملوک چلیں گے اور سارا دن وہاں گزار کر شام کے وقت واپس ناران آئیں گے۔ آنے جانے کا بندوبست، دن بھر کا راشن پانی اور دوسری ضرورت کی چیزوں کا اہتمام اس کے ذمّے تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ ان ساری چیزوں کا بندوبست رات کو سونے سے پہلے کر کے سوئے گا اور ہمیں اتنی جلدی جگانے آ جائے گا۔ ہمیں اس کا بے وقت آنا بہت بُرا معلوم ہوا۔ خاص طور پر عماد اور مسعود کو جو فجر پڑھنے کے بعد پھر بستروں میں دبک کر سو گئے تھے۔ لیڈر کی سوٹی کے ٹھکوروں سے مُنّی بھنّا اُٹھا اور جل کر بولا "حرامزادے، پہلے نوجوانوں کو اُٹھا پھر مجھے جگا — یہ کیا کہ سب سے پہلے میرے سر پر ہی ٹاپ کرنے لگ گیا ہے۔"

"وہ اُٹھتے نہیں" — عمر نے چیخ کر کہا — "تم تو سیانے بیانے آدمی ہو، تم تو اُٹھو۔"

"میرا تو ابھی سونا نمبر ایک ہی ختم نہیں ہوا اور تم اُسی کی جان کے دشمن ہو گئے ہو۔ ابھی تو مجھے سونا نمبر دو شروع کرنا ہے۔"

مُنّی کی ایک نرالی عادت ہے۔ وہ جس کمرے میں جس بستر پر سوتا ہے صبح چار پانچ بجے وہاں سے اُٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر پھر سو جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا سونا نمبر دو فرش پر ہوتا ہے اور اگر فرش پر قالین یا دری وغیرہ نہ بچھی ہو تو وہ دوسرے کمرے میں ٹرنکوں پر، میز پر یا کرسیوں پر جا کر سو جاتا ہے۔ پھر وہ دن چڑھے بیدار ہوتا ہے اور ننگے پاؤں ہر کمرے میں، ہر برآمدے میں گھومتا رہتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ اُسے چائے کا ایک بڑا مگ نہ مل جائے۔ چائے پینے کے بعد اُسے اپنے ارد گرد کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ خواب کی وادی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاتا ہے۔ اگر اس کی یہ ڈرل پوری نہ ہو، تو سارا دن بیزار، بے چین اور تنگ دل رہتا ہے۔

اتنے میں گونگا پراٹھوں اور انڈوں کی ٹرے لے کر آ گیا۔ لیڈر کا حکم تھا کہ پہلے کلّی کر کے ناشتہ کر لو، اس کے بعد منہ ہاتھ دھونا اور شیو وغیرہ کرنا۔ ہم سب نے ہاتھ دھونے اور شیو کرنے کو ناشتے

پر ترجیح دی اور اپنے اپنے بستروں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیڈر نے کہا ابھی چائے نہ بنوائے اور ہماری کشتوں کا معائنہ کر لے کہ ان میں جھیل سیف الملوک تک جانے کی تمام چیزیں ٹھیک ہیں یا نہیں۔ لیڈر ہماری کشتوں کا معائنہ کرنے چلا گیا اور ہم شیو کرنے لگے۔ جب مرد جوان ہوتا ہے تو اس کی شیو میں سب کو دلچسپی ہوتی ہے۔ خود اس کو بھی حجامت بنانے میں مزہ آتا ہے۔ بلیڈ، سیفٹی، گرم پانی کا مگ، خوشبودار صابن، برش، سہاگ رات کے بعد عورت کو سب سے پیاری چیز مرد کا شیو کرنا لگتی ہے۔ دلہن خواہ جاگ رہی ہو یا سوئی ہوئی ہو دولہا کبھی بھی غسل خانے میں شیو نہیں کرتا، اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس چھوٹی میز لگا کر شیو بناتا ہے اور اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتا جاتا ہے۔ مرد کو اپنے ذاتی استعمال کے سامان میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ عورت کو دوسرا کو دکھانے کے سامان میں آنند آتا ہے۔

جب تک عورت مرد کا سامان رہتی ہے وہ اس پر جان چھڑکے جاتا ہے، اس کے لئے حلال ہوتا رہتا ہے۔ جب وہ آزاد اور خود مختار ہو جاتی ہے تو مرد اس کی ایک آزاد اور خود مختار فرد کی حیثیت سے عزت کرنے لگتا ہے اور دونوں کے درمیان باہمی اُلفت کے بجائے تعظیم کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے شیو کا سامان ان کی بیویاں پیک کر کے رکھتی ہیں، کچھ کے اردلی اور ملازم یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ باقی کے خود اپنا سامان دھو کر رکھتے ہیں اور کچھ انہیں اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں، اگلے دن کے لئے۔ بڑی عمر کا آدمی اکیلا اپنی شیو کرتا ہے۔ اس کے برش پکڑنے اور سیفٹی چلانے میں کوئی خوبصورتی نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے پر صابن کا جھاگ نہیں اُٹھتا۔ ہلکے نیلے رنگ کا چپکی دار پانی سا پھیلتا رہتا ہے جو کشش ثقل سے موٹے موٹے قطروں کی صورت میں نیچے بھی گرتا رہتا ہے۔ اسے اپنی کھال ایک طرف سے پکڑ کر سیفٹی چلانی پڑتی ہے اور ماس کو بار بار زیر کرنا پڑتا ہے۔ ہم سب چونکہ بڑی عمر کے لوگ تھے اس لئے ایک دوسرے سے دُور دُور کوئی پتھر پر، کوئی دروازے کی دہلیز پر، کوئی کھڑے ہو کر اور کوئی کرسی پر بیٹھ کر شیو کر رہے تھے اور ہماری ٹھوڑیوں سے نیلگوں قطرے ٹپک رہے تھے۔

اب ناران کی سب سے بلند چوٹی کے پیچھے سے سورج نکل آیا تھا اور ہم اپنی اپنی کسٹ

کندھوں پر اُٹھائے، چھڑیاں ہاتھوں میں پکڑے بازار سے گزر رہے تھے جہاں گھڑی سازوں کی بہت سی دُکانیں تھیں۔ لیڈر ہم سب سے آگے تھا اور اس کی پیٹھ پر سب سے زیادہ بوجھ لدا ہوا تھا۔ مُفتی چونکہ ستر سال کا تھا اس لئے قطار میں سب سے پیچھے تھا۔ ہم پتھروں کے سروں پر پاؤں رکھتے، چھڑیوں سے دوسرے پتھروں کو ٹھکوروتے جھیل سیف الملوک کی طرف رواں تھے اور ہمارے سامنے سات میل لمبا رستہ اور ڈھائی ہزار فٹ کی چڑھائی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جب ہم فارسٹ ریسٹ ہاؤس والا موڑ مڑ کر اخروٹوں کی چھاؤں میں چلنے لگے تو دو راہگیروں نے ہمیں روک کر پوچھا — "کدھر کے ارادے ہیں صاحب؟"

"جھیل سیف الملوک کے۔"

"پیدل؟"

"جی جناب۔"

"پہلے بھی کبھی گئے ہیں پیدل؟"

"نہیں جناب، پہلا موقع ہے۔"

"واپسی مشکل ہے" — ایک نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کیوں؟" — عماد نے پوچھا۔

"میدانی لوگ اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکتے صاحب۔"

سامنے سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان آ رہا تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں بکری کی رسی تھی جسے اس نے کان سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ بھی باتوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ سفید ڈاڑھی والے نے بتایا کہ یہ لوگ لاہور اور راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور پیدل سیف الملوک جا رہے ہیں۔ سندھی ٹوپی والا ہنسا اور پتھر پر تھوک کر بولا — "ہفتہ دس دن ہوئے ایک فوجی کپتان نے بھی کوشش کی تھی۔ بڑا خوبصورت جوان تھا لیکن جب سیدوں کے بنگلوں سے اوپر گیا اور پہلی لمبی چڑھائی چڑھی تو ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور دم دے دیا!"

"کیوں؟" — مسعود نے پوچھا۔

"کلیجہ پھٹ گیا اور کیوں؟ سالم جیپ کرا کے اس کی لاش بالاکوٹ لے جائی گئی اور پھر پُورے فوجی اعزاز کے ساتھ اس کو دفن کیا گیا۔ آپ کی پنڈی کا تھا۔"

"سُن لو مُنّی تم" — مسعود نے ہنس کر کہا — "تمہارا دل بھی کمزور ہے اور دو دفعہ ہسپتال بھی ہو آئے ہو۔ سالم جیپ کرانی پڑے گی۔"

"کتنے پیسے لگیں گے؟" — مُنّی نے پُوچھا۔

"سو روپے" — سندھی ٹوپی اور بکری کی رسی والے نے جواب دیا۔

"سو میرے پاس ہے یارو۔ پتلون کی چھوٹی جیب میں۔ فکر نہ کرنا اور چندہ جمع کرنے نہ بیٹھ جانا۔" مُنّی نے آرام سے کہا اور ان تینوں کے ساتھ باری باری پُرتپاک مصافحہ کر کے آگے چلنے لگا۔ عُمر ان لوگوں سے پُوچھ رہا تھا کہ یہاں قبر کھُدوانے پر کتنی لاگت آتی ہے اور وہ لوگ بتا رہے تھے کہ قبر تو قصبے کے لوگ مل ملا کر مُفت ہی کھود دیتے ہیں لیکن جگہ تلاش کرنے میں ذرا دِقّت ہوتی ہے۔ عماد پُوچھ رہا تھا کہ یہاں قبروں کے تعویذ لکڑی کے کیوں بناتے ہیں اور وہ بتا رہے تھے کہ اخروٹ عام ہوتا ہے اس لیے سستا پڑتا ہے اندر پتھر ہوتے ہیں اور اُوپر اخروٹ کی لکڑی کا بکسا۔ قبر خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ مُنّی چونکہ ان باتوں میں شریک نہیں ہُوا تھا اس لیے ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ ہمارا لیڈر تھا اور ہم قطار کی صُورت میں اس کے پیچھے چل رہے تھے راستے میں عُمر نے ہم سب کو روک کر کہا — "یارو مُنّی کو مناؤ وہ نہ جائے۔ وہ ہارٹ کا مریض ہے اور اس کو دو مرتبہ اٹیک ہو چکا ہے" — مسعود کہہ رہا تھا "جب اس کی دوائیاں ساتھ ہیں تو پھر زیادہ فکر کرنا مناسب نہیں" — اعظمی نے کہا — "لیڈر اپنی کِٹ اچھی طرح سے دیکھ لو کہ اس میں مُنّی کی دوائیاں ہیں بھی یا نہیں؟" — ہم نے پتھروں کی مینڈھ پر کِٹ کھول کر دیکھی اس میں مُنّی کی تینوں شیشیاں موجود تھیں اور مریض ہمارے خدشات کی پروا کیے بغیر بڑے آرام سے چڑھائی چڑھ رہا تھا۔

جھیل سیف الملوک کو جانے والا رستہ بڑا پتھریلا ہے۔ اس میں ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور ہر قدم اُونچا نیچا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنا سفر شروع تو کر دیا تھا لیکن اس کے ختم ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ جوں جوں ہم ایک ایک فٹ، ایک ایک گز اُوپر کو اُٹھ

رہے تھے، دھوپ تیز ہو رہی تھی اور ہوا کمزور۔ چہرے پر اور گردن پر سوئیاں چُبھنے لگی تھیں اور سانس کھینچنے میں دِقّت ہونے لگی تھی۔ قصبے سے کوئی ایک میل دُور نکل آنے کے بعد ہم نے پہلا پڑاؤ ایک جنگلی کی اوٹ میں کیا جہاں تھوڑا سا سایہ تھا۔ سب نے اعظمی کے فولڈنگ گلاس سے کوہلی کا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹانگیں لمبی کر کے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ اعظمی اپنی چھڑی سے پتھروں پر سنگ ترنگ بجا رہا تھا اور مُنّی کی طرف کانی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ عماد اور عُمر کی پُرانی شرط چل رہی تھی کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤ اور دس روپے لے لو۔ عُمر کہہ رہا تھا دس کم ہیں بیس دو تو ابھی چلا جاتا ہوں اور اگر دس ہی دینے ہیں تو چوٹی ذرا چھوٹی کر دو۔ سامنے والی کے بجائے دوسری لے لو۔ یہ بائیں ہاتھ والی — مسعود نے کہا — "مُنّی جی! یہ پہاڑ اور میدان میں اور اونچان میں اور نیچان میں کچھ فرق ہے کہ بس نظر ہی کا دھوکا ہے؟"

مُنّی نے کہا — "کمبل پوش سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضور آپ کے نزدیک کفر اور اسلام میں کچھ فرق ہے یا نہیں تو آپ نے کہا تھا، بھائی کچھ بھی نہیں۔ دونوں شامیں سرکاری ہیں۔ اندھیرے اُجالے کا سا حال ہے۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے گرمی میں چھاؤں۔ دن کو روشنی اچھی لگتی ہے رات کو اندھیرا۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا کسی کو بھی علم نہیں! — پتہ نہیں یہ اونچائی نیچائی ایک سی ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے۔"

عماد جو مُنّی کی بات غور سے سُن رہا تھا، ٹوپی اُتار کر بولا — "دونوں سرکاری شامیں ہیں مُنّی جی، فکر نہ کرو۔"

"فکر میں کرتا ہوں یا تیرا یہ کچھ لگتا مسعود کرتا ہے مجھے کیا، میں کیوں فکر کروں۔"

عُمر نے کہا — "اوئے تلقین شاہ! تجھے یہ باتیں سمجھ میں آ گئی ہیں معرفت کی؟"

"اس کو تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے" — مسعود ہنس کر بولا — "اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کیسے کمایا جا سکتا ہے اور کس طرح سنبھال کر رکھا جا سکتا ہے۔"

"ہاں سچ" — عماد نے سنجیدگی سے کہا — "آپ اس قدر لالچی اور پیسے کے پیر کیوں ہیں؟"

مَیں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا — "دراصل یہ خاصیت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور چونکہ مَیں نے اسے دُور کرنے کی کوشش نہیں کی اس لیے یہ اور بھی راسخ ہوتی گئی۔ اب میں اصول پسند

کے چکر سے نکل نہیں سکتا۔"

"جب تمہیں اس بات کا اتنا احساس ہے تو پھر اس چکر سے نکل کیوں نہیں آتے؟"— عُمر نے پُوچھا۔

مَیں نے کہا۔"احساس دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک اکتسابی اور دوسرا جذباتی جب آدمی کو اکتسابی اور کتابی احساس ہوتا ہے تو وہ ہر مسئلے کا تجزیہ کر کے اسے اسی طرح چھوڑ دیتا ہے اور جب اس کی پیش قدمی جذباتی ہوتی ہے تو وہ اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور عام طور پر کامیاب ہوتا ہے۔مَیں چونکہ حصولِ زر اور جلبِ منفعت کو کتابی طور پر بُرا سمجھتا ہوں جذباتی طور پر نہیں اس لئے اس چکر سے نکل نہیں سکتا۔"

"تو تم اس کو جذباتی مسئلہ بنا کر سوچا کرو ناں"— عُمر نے بھولی پن سے نصیحت کی اور مَیں نے اسی بھولی پن کے ساتھ اس کی نصیحت پر عمل کرنے کا وعدہ کرلیا۔ رستے میں جنگل سے ایک آدمی اور اس کی نو دس سال کی لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تو مسعود نے جیب سے دو لیمن ڈراپس نکال کر لڑکی کو دیئے۔ آدمی نے پُوچھا کہ ہم لوگ خدانخواستہ جھیل سیف الملوک دیکھنے تو نہیں جا رہے اور ہم نے بیک آواز کہا۔"الحمدللہ وہیں جا رہے ہیں"— وہ بیچارہ کچھ فکر مند سا ہو گیا اور مُنہ لٹکا کر بولا۔"پچھلے سال لاہور سے بی بیوں کا ایک قافلہ آیا تھا کوئی تیس پینتیس بیبیاں تھیں۔بہت خوبصورت اور بہت ہی اچھے کپڑوں والی۔ان کے ساتھ ان کی کُستانیاں اور مستیں بھی تھیں۔وہ بھی پیدل سیف الملوک جا رہی تھیں۔"

"پھر؟"— عماد نے پُوچھا۔

"آگے ایک اخروٹ کا درخت آئے گا۔آدھے راستے کے بعد کی پہاڑی پر۔اس کے پیچھے آپ کو ایک بڑا سا پتھر دکھائی دے گا۔آدھا کالا اور آدھا لال۔ایک بی بی نے جو اُن سب میں سے خوبصورت تھی اس پتھر پر بیٹھ کر اپنی چپلی کا فیتہ کسا اور بس وہیں ختم ہو گئی۔"

"کیا ہو گئی"— عُمر نے چیخ کر پُوچھا۔

"مر گئی"— چھوٹی لڑکی نے جواب دیا۔

"کیوں؟"— عماد نے پُوچھا۔

"بس جی اللہ کا حکم۔جسم کا زور پڑا۔خون نے گرمی کھائی۔ٹھنڈی ہوا نے پلٹا مارا اور نس پھٹ گئی۔"

"پھر؟"— عماد نے پُوچھا۔

"پھر کیا جی اُس کو سالم جیپ کرا کے لے گئے۔لاہور کی بی بی تھی بڑی خوبصورت۔"

"تم نے مری ہوئی دیکھی تھی؟"— عُمر نے پُوچھا۔

"ناں جی ہم نے تو نہیں دیکھی پہلے لوگوں سے سُنا ہے۔"

"پہلے لوگوں سے؟"— مُفتی نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"پہلے لوگ جو اس جنگل میں رہتے تھے۔ہم سے پہلے۔"

اعظمی نے کہا۔"اٹھو یارو، یہ تو سب کو سالم جیپ کرا دیتے ہیں۔آئندہ کوئی آدمی ملا تو اس سے بات نہ کرنا۔"

"بالکل ٹھیک ہے جی"— اس آدمی نے کہا۔"یہ پریوں کا علاقہ ہے جب تک پہلے آدمی کو السلام علیکم کہو اور وہ وعلیکم السلام کہہ کر جواب نہ دے اس کے ساتھ بات نہیں کرنی چاہیئے۔"

"کیوں؟" عماد نے پُوچھا۔

"وہ آدمی نہیں ہوتا جی پری کا رُوپ ہوتا ہے، چڑیل ہوتی ہے۔"

"یار یہ پریاں اور چڑیلیں بھی بڑی دُکھی مخلوق ہیں"— مُفتی نے کہا۔"مجھے ان لوگوں پر انسانوں سے بھی زیادہ ترس آتا ہے۔"

"تو سالا لوگ ترس کرنے کدھر چلا گیا"— اعظمی ہنس کر بولا۔

مُفتی نے کہا۔"غوث علی شاہ قلندر نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں ہم شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھتے تھے تو ایک طالب علم تھا، نہایت پاکیزہ صورت اور موہنی مُورت۔اس کے پاس ایک چڑیل خوبصورت عورت بن کر آیا کرتی تھی اور دو روپے ہر رات کو دے جاتی تھی۔"

"دو روپے"— مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

اور مسعود قہقہہ مار کر بولا۔"اس کمبخت کو صرف دو روپے ہی نظر آئے اور وہ خوبصورت

عورت نظر آئی جو ہر رات طالب علم کے پاس آتی تھی۔ لعنت ہو تیری کم عقل سوچ پر۔"

منشی نے جھلا کر کہا ۔۔ "سنو یار، غور سے سنو۔ وہ چڑیل خوبصورت عورت کے روپ میں تمام رات اس طالب علم کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک رات دونوں ایک چارپائی پر تھے اور چراغ کوئی پانچ چھ ہاتھ کے فاصلے پر طاق میں روشن تھا۔ طالب علم نے ایک عام مرد کی طرح اس سے کہا کہ جا چراغ گل کر دے۔ اس عورت نے وہیں سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر چراغ گل کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر طالب علم سہم گیا اور ڈر کے مارے لرزنے لگا۔ عورت نے بہت کچھ تسلی تشفی اس بیچارے کی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔ اے گل رعنا، میں تجھ پر عاشق ہوں اور تیری باندی ہوں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہ کر۔ لڑکا چپ چاپ اپنی جگہ خوفزدہ لیٹا رہا۔ جوں توں کر کے رات بسر کی اور صبح کو یہ ماجرا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بیان کیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اس کے بازو پر باندھ دیا۔ رات ہوئی تو وہ عورت حسب معمول پھر اس کی کوٹھڑی میں آئی مگر دور کھڑی رہی اور رونے لگی ۔۔ میں نے تیرے ساتھ کیا برائی کی جو تو نے ایسا ظلم مجھ ستم رسیدہ پر ڈھایا۔ خدا کے لئے یہ تعویذ کھول ڈال اب میں چار روپے روز دیا کروں گی۔"

مسعود نے زور کا نعرہ مارا اور چلا کر کہا ۔۔ "سنا شاہ جی؟ چار روپے روز!" اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"پھر پھر؟" ۔۔ عمر نے بے چین ہو کر پوچھا ۔۔ "پھر منشی؟"

"پھر کیا" ۔۔ منشی نے کہا ۔۔ "اس ظالم نے تعویذ کھولا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔"

"ایسا تعویذ ایک مرتبہ میری بیوی نے بھی کرایا تھا" ۔۔ عمر نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن اس نے کوئی خاص کاٹ نہیں کی" ۔۔ انگلی مسکرا کر بولا۔

"نہیں بھئی نہیں" ۔۔ مسعود نے چھڑی اوپر اٹھا کر کہا ۔۔ "پرسنل بات نہیں۔ خاص طور پر لیڈر کے بارے میں تو کوئی بھی بات نہیں!"

پھر ہم اٹھے اور منزل کی طرف چلنے لگے۔ راستہ جب پتھریلا ہو، سورج کی تمازت تیز ہو، ہر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوتی ہے۔ ہم اپنے پاؤں پر تو مضبوط تھے، لیکن ہمیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیڈر کا حکم تھا کہ چلتے رہو، چلتے رہو اور چلتے رہو۔

رک گئے تو مومینٹم ٹوٹ جائے گا اور تم لوگ کبھی جی جھیل تک نہ پہنچ سکو گے۔ ہمارے پہلو سے دو نوجوان لڑکے ٹٹوؤں پر سوار گزرے۔ ان کے ساتھ پیدل گائیڈ تھے جو ان نوجوانوں کو جھیل دکھلانے لے جا رہے تھے۔ مسعود نے حسرت بھری نظروں سے ٹٹوؤں کو دیکھا اور پھر گردن جھکا کر چلنے لگا۔

راستے میں پتھروں کے درمیان طرح طرح کے جنگلی پھول اُگے تھے جن میں سے تقریباً ہر ایک کو انگلی جانتا تھا اور اس کی نسل کو پہچانتا تھا۔ انگلی کو پھول جمع کرنے کا شوق ہے۔ تازہ رنگ برنگے چھوٹے بڑے، سوکھے استری کئے ہوئے پھول۔ وہ بار بار جھک کر پتھروں کے درمیان سے کوئی پھول توڑتا۔ اس سے ایک آدھ بات کرتا اور پھر احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے تھیلے میں رکھ لیتا۔ انگلی کا مزاج اپنی طرز کا نرالا ہے۔ اُسے قدرت نے لفظوں سے کھیلنا، ان کی صورت بدلنا، ان کے معنی الٹانا کچھ اس طرح سے سکھایا ہے کہ اس کے سارے دوست اس کی اس خوبی کو خرابی سمجھنے لگے ہیں اور اس سے میٹھا میٹھا حسد رکھتے ہیں۔ وہ میری آپ کی طرح سے ایک چھوٹا انسان ہے اور چھوٹی چھوٹی بے شمار کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ ہماری طرح اس کا بھی ایک ہی منتہائے مقصود ہے۔ نوکری کرنا، بال بچوں کو پالنا، اگلی ترقی پر نگاہ رکھنا اور آخر میں ریٹائر ہو کر فوت ہو جانا۔ اس ساری نارمل اور صحت مند زندگی کے درمیان اسے ایک ہی مزمن مرض لاحق ہے اور وہ ہے پھولوں سے محبت کرنا۔ میں نے انگلی کو پھولوں سے محبت کرتے زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، لیکن مجھے یقین ہے وہ ان سے کافی پیار کرتا ہوگا۔ پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ کیا مرد، کیا عورتیں، عام طور پر معمولی شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔ وہ پھولوں کی خوشبو سے یا ان کی رنگت سے یا ان کی کثرت سے پیار نہیں کرتے، ان کے ہونے سے پیار کرتے ہیں۔ ضلع شیخوپورہ کے ایک دور افتادہ گاؤں کرکن میں میں نے ایک نوجوان مصلن بیبو کو پھولوں سے پیار کرتے دیکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے کوارٹر کے صحن میں جھاڑو دیتے دیتے اچانک رک جاتی اور زمین پر گرے ہوئے کسی پھول کو اٹھا کر دیکھنے لگتی۔ دیکھنا اس کا عشق تھا۔ دیکھنا اس کا بدن تھا، ہستی تھی اور وہ پھول کو دیکھتے دیکھتے ایک اور طرح کی مٹیار بن جاتی۔ بڑی قبولی، بے حد (اصلاح Ovo (Ovum RECEPTIVE جیسے انڈا اپنی جھالر سے ٹوٹ کر تخم کی پذیرائی کے لئے ہوتا ہے۔ اس لڑکی کو بڑی گالیاں، بڑے دھوکے اور بڑی ٹھوکریں اور ٹھنڈے مہنے پڑتے تھے کیونکہ وہ کام دھیان سے

نہیں کرتی تھی۔

مُنّی چلتے چلتے رک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنے بوٹ کے تسمے کھول کر اس میں سے کنکر نکالنے لگا۔ ہم سب اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ لیڈر کا حکم تھا کہ ہم میں سے کوئی بیٹھنے نہ پائے کیونکہ بدن گرم ہیں سانس مرتب ہیں اور ٹانگیں چلنت ہیں اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی رخنہ پڑ گیا تو ساری مہم دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پھر لیڈر نے مُنّی سے پوچھا کہ اس کا دل کس طرح سے چل رہا ہے۔ مُنّی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھا۔ عماد نے رائے دی کہ مُنّی جی کو ایک لال گولی اسی وقت دے دینی چاہیئے لیکن مُنّی نہ مانا اور یہی کہتا رہا کہ جب ضرورت پڑے گی تو وہ خود مانگ لے گا۔ اس مختصر سے قیام کے بعد ہمارا قافلہ پھر آگے چلنے لگا۔

مکئی کے چھوٹے بڑے کھیتوں کی بیندھیں کاٹتے ہوئے جب ہم ایک ایسے راستے پر آئے جو نسبتاً کم پتھریلا تھا اور جس کی پگڈنڈی کے نیچے کچی مٹی بھی دکھائی دیتی تھی تو ہماری جان میں جان آئی۔ پیچھے سے دو گوالوں نے ہمارے قریب آ کر سر نکالا اور زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم سب نے باجماعت ان کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کے خالی برتن تھے اور سروں پر ساگ کی گٹھڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "ہم نے ناران کے بازار میں لوگوں کو باتیں کرتے سُنا ہے کہ ایک ستر سال کا بڈھا پیدل جھیل سیف الملوک دیکھنے جا رہا ہے۔"

مُنّی نے رُک کر کہا ــــ "وہ بڈھا میں ہوں۔ کر لو کیا کر سکتے ہو؟"

دوسرے نے کہا ــــ "آپ کے مُنہ پر خون چڑھ آیا ہے۔ اس ارادے سے باز آ جائیں۔ نہیں تو کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

مُنّی بولا ــــ "یہ کلیجہ پہلے بھی تین مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ ایک مرتبہ بٹالے میں۔ پھر قصور میں اور حال ہی میں لاہور میں۔"

"لاہور میں دھرم پورے کے اندر پھٹا تھا" ــــ انگلی نے ہنس کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا "کیا نام تھا اس کا شاہ جی؟"

"عالم بی بی۔"

"عالم بی بی کون ہے؟" ــــ عماد نے پوچھا۔

"یہ نمازیوں کے سُننے کی بات نہیں ہے" ــــ مُنّی نے جواب دیا ــــ "یہ بے نمازیوں کی وارداتیں ہیں۔"

دونوں گوالے ہماری باتوں سے بیزار ہو کر جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگے اور دیکھتے دیکھتے اپنے برتنوں اور گٹھڑیوں سمیت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب اخروٹ کا وہ درخت قریب آ رہا تھا جہاں لاہور کی ایک خوبصورت طالبہ نے دم توڑا تھا اور اس کی لاش سالم جیپ میں گھر واپس گئی تھی۔ ہم سب چور نگاہوں سے اخروٹ کے اس تناور درخت کو دیکھ رہے تھے جس کے نیچے خانہ بدوشوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ بیٹھا تھا اور ان کے پہلو میں سیاہ رنگ کا ایک کتا بڑے زور سے بھونک رہا تھا۔ مسعود نے گردن گھما کر اُدھر دیکھا اور پھر بڈھے بیل کی طرح سر ڈال کر لمبے لمبے قدم اُٹھانے لگا۔ عماد چونکہ سائنس کا طالب علم ہے اور اس کو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات کا علم ہے اس لیے وہ چلنے اور رکنے کی سائنس سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اسی نے ہم سب کو یہ رائے دی تھی کہ چلنے میں ایک ردم ہونا چاہیئے۔ جس تال پر قدم اُٹھاؤ اسی پر اُٹھاتے چلے جاؤ۔ اگر اکھڑے یا بے تالے ہوئے تو جلد تھک جاؤ گے اور کبھی اپنی منزل کو نہ پہنچ سکو گے۔ اس کے کہنے کے مطابق میں اور مسعود دل ہی دل میں اپنی چال کے ماترے گنتے جاتے تھے اور ٹھیک جا رہے تھے۔ مگر چونکہ پہاڑی آدمی ہے اور اُس کا بچپن اور جوانی دھرم سالے میں گزری ہے اس لیے اُس کو چلنے میں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ انگلی کچھ ایسا بے معز اُونٹ ہے کہ اُس کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ مسافت طے کر رہا ہے۔ چلنے کے معاملے میں اگر کوئی تکلیف میں مبتلا تھا تو وہ عماد تھا۔ ایک تو اُس کے قدم تال سے باہر پڑ رہے تھے دوسرے بلندی پر آ جانے کی وجہ سے اس کا سر گھوم رہا تھا اور اُسے ہلکی ہلکی ابکائیاں آ رہی تھیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہر بڑے سائنس دان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ زمین کی زندگی بڑے لوگوں کے لئے بڑی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔

سامنے سے کچھ لوگ کدالیں اور پھاوڑے لے کر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ سلک کی قمیص پہنے ایک موٹا سا سیٹھ بھی تھا۔ یہ مزدوروں کی پہلی بیٹ تھی جو راستے کا گلیشیر کاٹ کر

آرہی تھی۔ انہوں نے ہمیں روک کر ہم سے سگریٹ مانگے اور ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہمیں سے واپس چلے جائیں کیونکہ جھیل ابھی بہت دُور تھی اور شام پڑنے تک ہم بمشکل تمام وہاں پہنچ سکتے تھے۔ میسٹ نے کہا ”پرسوں تک جیپ چلنی شروع ہو جائے گی اور شہری لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف نہ ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ بھی پرسوں تک انتظار کریں اور اپنی جان مشقت میں نہ ڈالیں۔“

ہم نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے چل پڑے۔ آگے چلنا، آگے بڑھنا اور مسلسل چلتے رہنا اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہر وقت منزل پر نگاہ رکھنی اور جدوجہد کے ساتھ زندہ رہنا زندہ لوگوں اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے، مر جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے۔ بلندی بلندی بلندی۔ شہرت شہرت۔ عزت عزت، لیکن آگے بڑھنے، ہر وقت جدوجہد کرنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی کوئی حد نہیں۔ اگر ایک ڈاکٹر جو ایک معمولی سا ایم بی بی ایس ساہیوال کا رہنے والا، جاٹوں کا لڑکا، معمولی گھرانے کا فرزند اور وہ ترقی کرنے لگے اور ترقی کرتا کرتا انگلستان پہنچ جائے اور سرجری میں اپنے کمالات دکھا کر رائل سوسائٹی آف سرجنز کا فیلو بن جائے اور اس کی تحقیقات دنیا کی سات زبانوں میں ترجمہ ہو کر سارے عالم میں پھیل جائیں اور اس کے لئے اعزازی ڈگریوں کے بند دروازے آپ سے آپ کھلنے لگیں اور اُسے ہر ملک اپنے یہاں رہنے کی دعوت دے اور اُسے واشنگٹن ڈی سی سے اس لڑکی کا خط ملے جس نے ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں اس سے بدتمیزی کی تھی اور ڈنر پر کہا تھا ”ڈاکٹر صاحب آپ کچھ زیادہ ہی بور ہیں۔ آپ مجھے امپریس نہیں کر سکتے“ ۔۔۔ اور یہ بات اس کے دل میں گرہ بن کر بیٹھ جائے اور اس نے اس گرہ کو کھولنے کے لئے مسلسل جدوجہد، مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کی ہو اور اس محنت کے صلے میں اُسے دنیائے طب میں وہ مقام ملا ہو جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور پھر واشنگٹن ڈی سی کے ڈپلومیٹک سرکلز کے بڑے صاحب کی اس لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے اور اس شادی پر چند غیر ملکی ڈاکٹر بھی کراچی آئیں اور اس شادی میں شریک ہوں تو کتنا بڑا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور نوجوان کی کیسی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔

پھر وہ ہاکس بے کے ہٹ میں ہنی مون منائیں۔ گھوڑا ڈاکا، خانس پور اور ایوبیہ میں ایک ساتھ ایک مہینہ گزاریں، لندن، پیرس اور روم کے ہوٹلوں میں اپنی رنگین، خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی کے پروگرام بنائیں۔ اپنے بچوں کے نام پہلے سے سوچیں۔ لڑکی ہر رجسٹر میں دستخط کرتے وقت اپنے نئے نام کے نئے لفظ کو اُجاگر کر کے لکھے تو خوشی، شادمانی اور کامیابی کے کیسے کیسے شادیانے بجیں اور جب ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہو اور زچہ بچہ ہسپتال سے گھر آئیں اور کوٹھی کے تینوں بڑے لانوں میں تین بڑے تنبو تانے جائیں اور پولیس بینڈ بجے، تو محنت اور مسلسل جدوجہد اور کامیابی اور کامرانی کیسے کیسے رنگ برنگے جوڑے پہن کر ان تنبوؤں کے درمیان اور قناتوں کے ساتھ ساتھ چکر لگائیں۔

جب ڈاکٹر کے آفٹر شیو لوشن کی خوشبو اور اس کی بیوی کے فیناچی کی نکہت ایک ساتھ بچے کے گالوں میں رچنے لگے تو زندگی کس کس طرح ان کی کوٹھی کے دروازے اور دریچوں میں جھولا جھولے اور پھر جب ایک دن اس لڑکی کا ایک کزن بھارت کے جنگی کیمپ سے رہا ہو کر کراچی اپنی کزن سے ملنے جائے اور ڈاکٹر کا کیپٹن سے پہلی مرتبہ تعارف ہو اور تینوں لان میں بیٹھ کر چائے پئیں اور جنگی کیمپوں کے حالات سنیں اور تنہائی، اُداسی اور دُوری کے قصے بیان کریں اور رات کے وقت کیپٹن اپنے کمرے میں کھڑکی کھول کر وائلن بجائے اور سمندر کی لہریں اس میں آنسو بھریں اور مسلسل جدوجہد اور کش مکش اور کوشش کا لکڑہارا اپنے تکیے پر سر رکھ کر سو جائے اور اس کی بیوی وائلن کی آواز سنتی رہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے کانوں میں گرنے لگیں اور ساتھ کے کمرے میں جا کر وہ اپنے بچے کو دیر تک دیکھتی رہے اور پھر مٹھی بھر آیا کو کمبل اُڑھا کر واپس اپنے بستر میں آ کر لیٹ جائے تو کیا ہو اور اگر مسلسل جدوجہد کرنے والا محنتی، زندہ اور اولوالعزم ڈاکٹر بقیہ عمر اپنی بیوی کے آنسو پونچھتا رہے اور اس کا کوئی علاج نہ کر سکے تو کیا ہو! اور اگر وہ کیپٹن نوکری چھوڑ دے، اور شادی کرانے سے انکار کر دے اور پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہو کر لیاری کوارٹرز میں رہنے لگے تو کون روک سکے! اور اگر ڈاکٹر اپنی بیوی کو علاج کی غرض سے ولایت لے جائے اور اس کا علاج نہ ہو سکے تو پھر کون ہے جو ستاروں پر کمند ڈالے، لیکن ہر وقت اپنی منزل پر نگاہ رکھنا اور جدوجہد کے ساتھ زندہ رہنا، زندہ لوگوں

اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے، مر جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔

ہماری نگاہیں اپنی منزل کی طرف تھیں اور ہم ایک زندہ قوم کے رُوپ میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم کُل چھ تھے اور چھ کے چھ ایک ساتھ چل رہے تھے اگر ہم پانچ ہوتے یا اس سے بھی کم ہوتے تو بھی اسی طرح چلتے۔ تعداد کارکردگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ نہ کارکردگی سے کوئی متاثر ہوتا ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے، ایک لمحے کی بات ہوتی ہے جب اثر کا جالا مؤثر بن جاتا ہے۔ اس وقت نہ کبوتر کی کوئی خوبی تھی نہ نورجہاں کی نہ شہزادہ سلیم کی۔ ایک لمحہ تھا جو اپنا کام کر گیا اور پھر سالوں اور مہینوں پر محیط ہو گیا۔

مسعود نے چیخ کر کہا — "شاہ جی پھر واپس پہنچ گئے لاہور؟"

مَیں نے دھیمی آواز میں کہا — "نہیں یار مَیں تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اس کو مارو" — مُفتی نے رُک کر کہا — "گنتی میں ہم چھ ہیں لیکن اصل میں پانچ ہیں۔ یہ سالا ہر وقت غائب رہتا ہے۔"

"حاضر سائیں حاضر" — مَیں نے جواب دیا اور پھر ہم چلنے لگے۔ دراصل سانس پھُول جانے کے باعث ہم زیادہ باتیں نہیں کر سکتے تھے اور مومینٹم پر اثر پڑنے کی وجہ سے رُک بھی نہ سکتے تھے۔

دور سامنے مزدوروں کی دوسری بیٹ گلیشئر کاٹ رہی تھی اور ہمیں ان کے پھاوڑے اُوپر اُٹھتے اور نیچے گرتے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔

عُمر نے کہا — "عمّاد بتا گلیشئر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"گلیشئر؟" — عمّاد نے ایک آنکھ میچ کر کہا — "یہاں سے؟ بس ہو گا کوئی ڈیڑھ میل دُور۔"

"ٹھیک ہے" — عُمر نے تسلیم کیا اور سوٹی ہوا میں لہرا دی۔

اُنکل نے کہا — "نوشا لالوگ کوئی شرط ہی نہیں لگائی۔ اُس نے ڈیڑھ میل کہا۔ اُس نے مان لیا۔"

"ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے" — مسعود بولا — "اب یہ جھیل تک کوئی شرط نہیں لگائیں گے۔"

"سمجھوتہ بھی بڑے کام کی چیز ہے" — مُفتی نے مری ہوئی آواز میں کہا — "جب سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو آدمی نکمّی ہو جاتا ہے۔"

"نہیں مُفتی جی" — مسعود نے اپنی ہکلاہٹ کے ساتھ کہا — "سمجھوتے میں زبردستی کا ایلیمنٹ ہوتا ہے۔ مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتہ کرنا بڑا کربناک ہے۔"

"اور میرا بابا کہتا ہے" — مَیں نے اُونچی آواز میں کہا — "کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔"

"واہ واہ" — مسعود نے نعرہ لگایا — "اپنے بابے کی باتیں سُنا۔"

مَیں نے کہا — "اِس وقت سانس پھُولی ہوئی ہے کہیں بیٹھیں گے تو بات کریں گے۔"

ہم پھُولی ہوئی سانسوں اور دُکھی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور گلیشئر ہم سے دُور ہوتا رہا۔ راستہ سُنسان تھا اور چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ خاموشی کی بھی ایک اپنی آواز ہوتی ہے۔ ایک اپنی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک اپنا ہی پیٹرن ہوتا ہے۔ مَیں نے ایک زمانے میں مختلف خاموشیاں ریکارڈ کی تھیں۔ رات کے ایک بجے مقبرۂ نورجہاں کے باہر پانچ منٹ کی خاموشی ریکارڈ کی تھی۔ پھر آدھی رات کو سمن آباد کی ڈونگی گراؤنڈ کی خاموشی ریکارڈ کی تھی۔ پھر چولستان میں آدھی رات کا سناٹا ریکارڈ کیا تھا۔ یہ تینوں ریکارڈیں میرے پاس موجود ہیں اور مَیں نے انہیں کئی لوگوں کو سُنوایا ہے۔ ایک جگہ کی خاموشی دوسری جگہ سے مختلف ہے۔ جب ایک نہایت ہی خاموش جگہ میں آدمی تین گھنٹے تک مسلسل بیٹھا رہے تو ابتدا میں اس پر بڑی خوشگوار کیفیات گزرتی ہیں۔ پھر دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ نبض چلنے اور رگوں کے پھڑکنے کی آواز شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ صدائیں اتنی بلند ہو جاتی ہیں کہ "کانوں" کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور اندر باہر بیشمار ڈھول بجنے لگتے ہیں۔ اتنی اُونچی آواز آتی ہے کہ آدمی سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ مضطرب ہو کر سناٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور ان آوازوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے جو اس کے معمول میں داخل ہوتی ہیں۔ سناٹا اور خاموشی بڑا عذاب ہے اور یوگی لوگ بڑی مُشکل سے ان

پر قابو پاتے ہیں۔

ہمارے دائیں ہاتھ اونچے اونچے پہاڑ تھے اور ان پر چھدرے چھدرے درخت اُگے تھے۔ کہیں کہیں اِکا دُکا جھونپڑے بھی تھے۔ کبھی کبھار ان کے پاس چرتی ہوئی بکریاں بھی نظر آ جاتی تھیں، لیکن اس ویرانے میں سوائے ہم چھ کے اور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے اور اتنی لمبی مسافت طے کرتے ہوئے ہم سب کی شکلیں مختلف ہو گئی تھیں اور کانوں کے نیچے جبڑوں کے پاس جلد کھچ گئی تھی۔ اُوپر کی جھریاں نیچے کی جھریوں سے آ ملی تھیں اور آنکھیں چھوٹی ہو گئی تھیں۔ مسلسل ہانپنے اور مستقل زور لگاتے رہنے کی وجہ سے ہمارے پھیپھڑے، دل، جگر اور انتڑیوں کا کچھ حصہ جسموں سے باہر آ گیا تھا اور بھاری گردوں اور پنڈلیوں کے اردگرد لٹک گیا تھا۔ جب ہم چلتے تھے تو باہر لٹکے ہوئے دل، جگر، پھیپھڑے اور انتڑیاں ہمارے وجود سے ٹکرا رہی تھیں اور ان پر راستے کی دھول جم رہی تھی۔ یہ جسمانی تکلیف کچھ کچھ اس تکلیف سے ملتی تھی جب سلمیٰ باجی ہمارے قصبے سے گاڑی میں سوار ہوئی تھیں اور میں کچی چھت پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ نزع، فرقت اور سیکس کا کرب تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ میں مرا تو کبھی نہیں لیکن میں نے دو آدمیوں کو نزع کی حالت میں ضرور دیکھا ہے۔ دونوں مختلف مقامات پر مختلف حالات میں مر رہے تھے، لیکن ان کی جان کنی کی کیفیت ایک سی تھی۔ پہلے شدید تشنج ہوتا تھا پھر ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے حلق سے آواز آنے لگتی تھی اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر کروٹیں بدل کر گزر جاتی تھی۔ پھر چار پانچ سیکنڈ تک وہ مکمل سکون کی لپیٹ میں آ جاتے اور اس کے بعد پھر وہی ڈرل شروع ہو جاتی۔ مرنے سے پندرہ بیس سیکنڈ پہلے ان کے چہروں پر طمانیت، سکون اور سپردگی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ پھر جیسے لذت حاصل کرتے وقت انسان "سی" کرتا ہے، وہ سارے کے سارے لذت میں ڈوب گئے۔ گردن ذرا سی ہلی اور منکا ڈھلک گیا اور مجھے یوں لگا جیسے انسان خواب میں پہاڑ پر سے چھلانگ لگاتا ہے۔ انہوں نے بھی چھلانگیں لگا دیں۔

فرقت میں بھی آدمی کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے، لیکن وہ آخری اور لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ اس کے دل کے گرداگرد سٹین لیس سٹیل کے بلیڈ کی نوک آہستگی سے پھرتی رہتی

ہے اور اس کا دل بند ڈبے کے اناناس کی قاشوں کی طرح کٹتا رہتا ہے جب بلیڈ اُوپر سے لے کر نیچے تک سارے دل کی گول گول قاشیں کاٹ چکتا ہے تو وہ قاشیں پھر جُڑ جاتی ہیں اور بلیڈ نئے سرے سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس گھومتے ہوئے بلیڈ کو روکنے کے کئی عوامل ہیں۔ کچھ کارگر بھی ہیں اور بلیڈ کی گردش کو روک بھی دیتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کافی وقت گزر جانے کے بعد یہ بلیڈ پھر سے گھومنا شروع کر دیتا ہے جیسے سردیوں میں غلطی سے غلط بٹن دب جانے پر گرمیوں کا رُکا ہوا سیلنگ فین گھومنے لگتا ہے۔

جب ہم گلیشیر کے قریب پہنچے، تو مزدور برف کے ڈھیلوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور گپیں لڑا رہے تھے۔ ہم اپنی اپنی چھڑیوں کی نوکیں برف میں گاڑتے گلیشیر سے گزرنے لگے۔ کٹے ہوئے بھر بھرے راستے پر برف کرچ کرچ کر کے ہمارے پیروں تلے دب رہی تھی اور ہمارے تپتے ہوئے پاؤں اندر ہی اندر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ یہ ٹھنڈک بڑی خوش آئند تھی۔ بھیگے ہوئے بالوں سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کی طرح۔ اُس میں تو دوری کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس میں پالا پڑنے کی کیفیت بھی تھی۔ ہم نے مزدوروں کو یک زبان سلام کیا اور اُن کے قریب سے گزرنے لگے۔ مفتی برف پر گھبرا ہو کر چل رہا تھا اور اُسے ہر لحظہ پھسل جانے کا خوف لاحق تھا۔ مسعود ہارے گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔ میں بے تالا تھا اور عمر اور اشفی نارمل انداز میں چل رہے تھے۔ ایک ممتاز کی حالت خراب تھی۔ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اُسے پھر اُبکائی آنے لگی تھی۔ برف کا ٹوٹا مشکل سے ڈھائی تین سو گز لمبا ہو گا، لیکن اُسے عبور کرنے میں اندازے سے زیادہ وقت لگا۔ گلیشیر ختم ہوا تو مفتی نے کمر سیدھی کر کے کہا "اب لاؤ ذرا۔"

لیڈر نے فوراً کٹ کھول کر سُرخ گولیوں والی شیشی نکالی تو مفتی چلا اُٹھا "شیشی نہیں گدھے لیڈر، مجھے چائے چاہیے۔"

اور ہم سب مل کر "چائے چاہیے، کون سی جناب" گانے لگے۔ لیڈر نے سوٹی اُٹھا کر ہمارا کورس بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اعلان کرنے کے انداز میں بولا "چائے وہاں مل سکے گی جہاں چشمہ ہو گا، پہاڑی کی اوٹ ہو گی، درختوں کی چھاؤں ہو گی اور سبزے کا ہموار ٹکڑا ہو گا۔"

"اور اگر" ــ مُفتی نے غصّے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ــ "یہ ساری چیزیں ایک جگہ نہ ملیں تو چاہئے بھی نہیں ملے گی"۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں"۔ ــ لیڈر نے چمکار کر کہا ــ "یہ چیزیں نہ بھی ہوئیں تو بھی چائے ملے گی۔ تم چلو تو سہی"۔

عماد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا ــ "ہاں مُفتی جی! آپ چلیں تو سہی، دس قدم پر چشمہ مل جائے گا"۔

"چشمِ ما روشن بھی ملے گا اور دل شاد بھی"۔ ــ انظمی نے کہا۔

"دلشاد کون ہے"۔ ــ مسعود نے پوچھا۔

"وہی جو پشاور سے آزاد کشمیر ریڈیو پر گانے آیا کرتی تھی"۔ ــ عماد نے جواب دیا۔

"یار! وہ دلشاد تو بڑی موٹی تھی"۔ ــ عمر بولا ــ "یہ دوسری اچھی تھی لائلپور والی"۔

"لائلپور کی ساری دل شادیں اچھی ہوتی ہیں بھائی"۔ ــ انظمی نے پیری کیپ ہاتھ پر جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یار اس دل شاد کے ساتھ نظامی مرحوم نے بڑا اچھا لطیفہ کیا"۔ ــ مسعود نے کہا تو لیڈر بولا ــ "اب آگے بھی چلو کہ یہیں رُکے رہو گے۔ راستہ لمبا ہے اور وقت کم ہے"۔

وقت کی کمی بھی انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ اگر وقت نہ ہوتا تو انسان کو کسی طرح کی اور تکلیفیں ضرور ہوتیں، لیکن وقت کی کمی کی کبھی شکایت نہ ہوتی۔ صمدانی صاحب اور ریحانہ کی محبت میں بھی وقت کی کمی حارج ہو گئی۔ وہ ایک بہت بڑے بنک کے زونل منیجر تھے اور ان کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ریحانہ شکل سے اٹھائیس انتیس برس کی ہو گی۔ بھرا بھرا بدن، ہلکی گندم گوں رنگت، کٹے ہوئے بال، ٹھوڑی کے عین درمیان چھوٹا سا تل۔ وہ ان کے بنک میں ایک ٹائپسٹ کی حیثیت سے آئی تھی اور اپنی خداداد لیاقت کی بنا پر جونیئر آفیسر ہو گئی تھی۔ اس کو پتہ نہیں صمدانی صاحب کی کون سی بات پسند آئی جو اُن پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی۔ سہیلیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ پارٹیوں میں جانا ختم کر دیا۔ کاغذوں پر توجہ دینا چھوڑ دی۔ صمدانی صاحب کا بڑا لڑکا لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے گیا تھا اور اسے گئے ہوئے

پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ صمدانی صاحب ہر اتوار ریحانہ کو اپنی کار میں لے کر راول ڈیم جاتے تو انہیں اپنا بڑا لڑکا ضرور یاد آتا، لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرتے۔ وہ اپنی کار ڈیم کے پہلو میں کھڑی کر کے لمبی سیروں پر نکل جاتے اور ریحانہ سارے راستے ان کے بازو کے ساتھ لٹکی جھولتی جاتی۔ جن جھاڑیوں میں پھول نہ بھی ہوتے ان میں بھی پھول نظر آتے۔ جن پتھروں میں چمک نہ بھی ہوتی ان میں بھی نیلم کی رگیں صاف نظر آتیں۔ جو راستے نہ ختم ہونے والے ہوتے وہ بھی ختم ہو جاتے۔ صمدانی صاحب کا ہر ملازم ان سے خوش تھا۔ ہر ماتحت ان کی مروت اور شفقت کے گن گاتا تھا۔ دو سال کی ان لمبی سیروں کے بعد اچانک ایک دن ایک لیفٹیننٹ سورڈ آف آنر لے کر ان دونوں کے درمیان آ گیا اور ریحانہ نے اس کے کندھے پر انگلی پھیر کر پوچھا ــ "یہ پھول تین کب ہوں گے؟"

"آج سے پورے دو مہینے بعد" ــ لیفٹیننٹ نے جواب دیا اور وہ دونوں سکوٹر لے کر راول ڈیم چلے گئے۔ ہر شام راول ڈیم کی طرف جاتے ہوئے ریحانہ کو صمدانی صاحب ضرور یاد آتے، لیکن وہ ان کے بارے میں کوئی بات نہ کرتی۔ ڈیم کی چڑھائی پر سکوٹر ڈالتے ہوئے شاہد کو ریحانہ کا بازو لپٹے ہوئے پیٹ کے گرد ایک سانپ لگتا جو سردیوں میں حدت حاصل کرنے کے لئے کسی چیتے کے بدن سے لگ کر بیٹھ گیا ہو۔ ڈیم کے کنارے پہنچ کر ریحانہ کو سطحِ آب پر بہت سے بجرے، شکارے اور گنڈولے نظر آتے جن کے بندھے ہوئے پردوں کے درمیان مرد اور عورتیں گٹاریں اور رباب لے کر گا رہے ہوتے۔ گھاس پر نیم دراز ہو کر جب شاہد اس سے اپنے یونٹ کی باتیں کرتا تو ریحانہ کو یوں لگتا جیسے دھیمے دھیمے وقتی کا الاپ کر رہا ہو۔ اس کی شخصیت کا سب سے خوبصورت حصّہ فوجیوں کے خاص انداز کی محبت تھا۔ ریحانہ اس کا محدود اور ایلیٹ انگلی سے متعین کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہا کرتی: "مجھے یہ بہت اچھی لگتی ہے ــ آپ لوگوں کی حجامت"۔

ایک شام جب صمدانی صاحب ریحانہ کے گھر گئے تو اس نے بڑی خوشی کے ساتھ ڈرائنگ رُوم کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ صمدانی صاحب کی عمر اب پچاس سے بہت اُوپر نکل گئی تھی۔ اُنہوں نے گھر کے اندر کھلنے والے دروازے

کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ریحانہ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ مَیں تمہارے صحن خانہ کی وہ دھوپ ہوں جو زمین سے اُٹھ کر اونچی دیواروں پر پہنچ چکی ہے۔ ابھی یہ مٹی پر آئے گی اور پھر اندھیرا پھیل جائے گا۔ مجھے آرام سے مٹی پر پہنچ لینے دو۔" ریحانہ نے سر جھکا کر کہا۔ "ہاں سَر، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ بہت ہی کم۔ میرے لئے تو آپ سے بھی زیادہ کم رہ گیا ہے۔"

صمدانی صاحب کی آنکھوں میں اس اقرار سے خوشی کے جگنو چمکے اور ان کی عمر پچاس سے بہت نیچے پہنچ گئی۔

"پھر ریحانہ؟" انہوں نے گلا صاف کر کے کہا۔ "مجھے اپنی محبت، قرب اور اپنے ساتھ کے چند مہینے اور عطا کرو۔ مَیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔"

ریحانہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُتر آئے اور اس نے سر جھکا کر کہا۔ "مَیں نے کہا ناں سَر کہ وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے اور ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔ اب مجھے جانے دیں۔"

کوئی دس سیکنڈ تک کمرے میں خاموشی رہی پھر ریحانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "دراصل سَر، ہر لڑکی کے لیے شادی کا ایک وقت ہوتا ہے اور جب وہ گزر جائے تو پھر وہ لڑکی ساری عمر ایسے ہی رہ جاتی ہے۔ میرا وقت بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ مجھے جانے ہی دیں۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور قالین پر صمدانی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ روتی ہوئی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

وقت کم تھا۔ جھیل دُور تھی اور ہمیں ہر حال میں سہ پہر سے پہلے پہلے وہاں پہنچنا تھا۔ راستے میں کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیے ایک گھنٹے کی بریک لازمی تھی۔

لیڈر سوٹی گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ "جلدی کرو، جلدی کرو۔ ہمت سے کام لو۔ وقت کم ہے اور ہمیں دُور پہنچنا ہے۔"

"شاباش شاباش میرے جوان، ہمت ساتھیو شاباش۔" مسعود بار بار نعرے لگا رہا

تھا اور حسن لوان کے نعرے اور للکارے ناگوار گزر رہے تھے۔

جب ہم کچی چڑھائی کا ایک موڑ مڑے تو سامنے گھاس کا ایک وسیع میدان نظر آیا۔ اس کے عین وسط میں ریونڈ کے چار اُونچے درخت ایستادہ تھے۔ مُغنی نے رُک کر کہا۔ "چائے کا مقام مل گیا۔"

"کہاں؟ کہاں؟" سب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ سامنے۔" مُغنی نے سوٹی سے اشارہ کیا۔

"اور پانی؟" لیڈر نے پوچھا۔

"پانی کی تلاش میں لیڈر جائے۔" عماد بولا اور پھر ہم نے "لیڈر لیڈر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ لیڈر ہماری کم ہمتی کے آگے ہتھیار ڈال گیا اور ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف لے چلا۔ بڑی خوبصورت گھاس تھی۔ کہیں کہیں اکا دُکا پھول کھلے تھے۔ اعظمی ان پھولوں کے نام بتا رہا تھا۔ مسعود انہیں سوٹیاں مارتا چل رہا تھا۔ پاہن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب ہم اپنی اپنی کمریں کھول کر آرام سے بیٹھ گئے تو لیڈر نے اپنی کٹ سے کیتلی نکالی اور کہنے لگا۔ "اب مُردوں کی طرح بیٹھ کیوں گئے ہو؟ پتھر اکٹھے کر کے چولہا بناؤ اور ڈھنگلے جلاؤ۔"

مَیں نے کہا۔ "دس منٹ تک ہم سے بات نہ کرنا ورنہ ہم ماریں گے۔"

"ماریں گے اور رگڑ کر عذرِ سستی ماریں گے۔" اعظمی نے کہا۔

لیڈر بڑبڑا کر خاموش ہو گیا لیکن اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں۔ دراصل وہ بھی تھک گیا تھا اور تھکا ہوا آدمی جب ایک مرتبہ بیٹھ جائے تو پھر اس سے اُٹھا نہیں جاتا۔ ہم سب آنکھیں موند کر گھاس پر لیٹ گئے اور ہماری خاموشی نے ہماری توجہ کا دامن وسیع کر دیا۔ کوئی ایک منٹ کے سکوت کے بعد ہمیں ڈرب ڈرب اور ٹُل ٹُل کی آواز آنے لگی۔ لیڈر اپنی جگہ سے تڑپ کر اُٹھا اور گردن گھما کر بولا۔ "ارے کیمو چشمہ تو یہ چل رہا ہے، ہماری کمروں کے پیچھے۔" عماد نے کہنی کے بل ہو کر دیکھا ذرا سی اُونچائی پر گھاس کے سرسبز پودوں کے درمیان پانی کے بڑے بڑے قطرے کوزہ بھر گہرائی میں گر رہے تھے۔ عماد نے لیڈر سے کہا۔ "بیٹا کیتلی لے جا کر اس ٹُل کے نیچے رکھ دے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا اور اپنے رومال سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ سورج کی تیز اور تیکھی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

کوئی پندرہ منٹ اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد مسعود "الا اللہ" کا نعرہ مار کر اٹھا اور پتھر ڈھونڈنے لگا۔ ہم سب بھی اس کے پیچھے چلا پھر ہیں اور عماد اُدھر کر جھنگیلے اکٹھے کرنے لگے۔ ریوڑ کے درختوں کی چھانٹ اور غیر قانونی طور پر کاٹی ہوئی لکڑی کے بڑے چھوٹے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہم نے چولہا بنایا، آگ جلائی اور کیتلی اس پر دھر دی۔ پھر توشہ دان سے پراٹھے اور انڈوں کی ٹکیاں نکالیں اور چولہے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔ بڑی شدید بھوک لگی تھی اور اُونچائی پر لطیف اور دن اسی خوراک میں لطیف سی چٹنی کا کام دے رہی تھی۔

جب ہم کھانا کھا چکے اور کیتلی میں بکس چائے بن چکی تو لیڈر نے ہر ایک کی پیالی لبالب بھرتے ہوئے کہا "اوے مردو! کوئی بات کرو۔ اب تو کھانا بھی کھا لیا ہے۔"

"ضرور ضرور" مسعود نے اپنی آخری بُرکی گرم چائے کے گھونٹ سے آگے دھکیلتے ہوئے کہا "شاہ جی سے اس کے بابے کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"یا بابو بابا کوئی نہیں یار" عمر نے کہا "اس سے اُلّی کی لڑکیوں کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"دفع کر یار اُلّی کو۔ گولی مار" عماد نے کہا "سو مرتبہ دیکھا ہے ہم نے اُلّی۔ یہ بتاؤ شاہ جی کہ آپ نے چین میں کیا دیکھا اور ان کو ہم سے کیسے مختلف پایا۔"

"واہ واہ" مفتی نے کہا "چین، چین، چین۔"

مَیں نے کہا "یار چین مَیں نے دیکھا ضرور ہے لیکن بڑی دیر ہوئی دیکھا تھا۔ اب پتہ نہیں اس کا حال کیا ہو گا۔"

"کوئی بھی حال ہو" مسعود نے کہا "تم موجودہ حال کو بھول جاؤ۔ اپنے زمانے کی بات کرو۔"

"چین صوفیوں کا ملک ہے اور وہاں تصوف کا فلسفہ چلتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" عمر نے چڑ کر کہا "کوئی عقل کی بات کرو۔ اتنے بڑے عظیم انسان کو صوفی بنا رہے ہو، راہب بنا رہے ہو، گوشہ نشین بنا رہے ہو۔"

مَیں نے کہا "عمر جب تک مَیں نے صوفی ازم کے بارے میں کچھ نہ پڑھا تھا اور تصوف کے بارے میں علم حاصل نہ کیا تھا میری بھی یہی سوچ تھی جو تمہاری ہے اور ایک مَیں کیا ہر شریف آدمی اور پڑھے لکھے مہذب آدمی کی یہی سوچ ہے لیکن اس علم پر ایک دو کتابیں پڑھنے کے بعد اور ان سے کچھ حاصل نہ کر سکنے کے بعد مَیں ان بابوں اور بزرگوں کی تلاش میں نکلا جو ہمارے علم، ہماری دھرتی، ہماری سائیکی اور ہماری مٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے پاس ہمارے لگتوں کا علم اور ان کی وراثت ہے۔"

"یہ جو پیر فقیر ہوتے ہیں" عمر نے سر جھٹک کر کہا "روپے دو گنے کرنے والے۔"

"یہ بھی اور ان کے علاوہ دوسرے بھی جو بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ڈاڑھی کو مہندی لگاتے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں۔ ڈکار لیتے ہوئے ایکسکیوزمی کے بجائے الحمدللہ کہتے ہیں اور پرانی قسم کے حنائی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔ استنجا کرتے ہیں، مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ سینے پر لگاتے ہیں۔"

"تمہیں کیا ضرورت آ پڑی تھی ان لوگوں سے ملنے کی؟" مسعود نے پوچھا۔

"اس لیے" مَیں نے کہا "کہ مَیں ٹائم، لائف، نیوز ویک، سوویٹ نیوز اور ریڈرز ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر تنگ آ چکا تھا اور میرا دل چاہنے لگا تھا کہ مَیں ان بابوں کی بات بھی سُنوں جنہیں میں اور میرا باپ اور میرے بھائی بہنیں کئی سال ہوئے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ دراصل مَیں اپنے لگتوں سے ملنا چاہتا تھا۔ مَیں ہر تفتے "حلقے" میں جا جا کر اداس ہو گیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" مفتی نے پوچھا۔

"یہ غالباً ۶۴ء اور ۶۵ء کی درمیانی مدت کا ذکر ہے۔ مَیں نے اپنا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈ لیا اور لائل پور، سالاروالی، گولڑہ شریف اور پاکپتن شریف کے چکر لگانے لگا کہ شاید یہاں مجھے کوئی ایسا بابا مل جائے جس کے پاس ہمارے لگتوں کا اصل علم ہو۔ وہ علم نہ ہو جو مودودی صاحب اور پرویز صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ اور جامعہ اشرفیہ اور اقبال اکیڈیمیوں کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سفر وسیلۂ ظفر کے دوران مجھے چند اصلی بابوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو اکتسابی علم نہ رکھتے تھے۔ پنجابی کے سوا کوئی

زبان دہ جانتے تھے۔ تجزیہ علمی سے ناآشنا تھے۔ شخصیت کے اعتبار سے بڑے سادہ اور لہجے اور اظہار کے بڑے نرم تھے۔ میں نے ان سے کچھ باتیں سنیں۔ کچھ باتیں ان میں دیکھیں۔ کچھ مجھے سمجھ آیا، باقی کا سارا میرے پلے نہیں پڑا۔

لاہور میں جب میں نے ایک بابا سے کہا کہ میں صوفی ہونا چاہتا ہوں، تو انہوں نے پوچھا کس لیے ؟ میں نے کہا کہ اس لیے کہ یہ مجھے پسند ہے۔ آپ نے کہا۔ مشکل کام ہے سوچ لو میں نے عرض کیا، اب مشکل نہیں رہا کیونکہ اس کی پرائمری اور مڈل پاس کر چکا ہوں۔ پاس انفاس نفی اثبات کا ورد کر لیتا ہوں، اسم ذات کے شغل کی بھی پریکٹس ہے۔ آگے کے راستے معلوم نہیں، وہ آپ سے پوچھنے آیا ہوں اور آپ کی گائیڈنس چاہتا ہوں۔

بابا نے ہنس کر کہا تو پھر تم روحانی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہو صوفی بننا نہیں چاہتے ہو۔ میں نے کہا ان دونوں میں کیا فرق ہے ؟ کہنے لگا روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف خرقِ عادات یعنی کرامات کا حصول ہے اور یہ طاقت چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن تصوف کا مقصد کچھ اور ہے ؟ وہ کیا ؟ میں نے پوچھا تو بابا نے کہا تصوف کا مقصد خدمتِ خلق اور مخلوقِ خدا کی بہتری میں لگے رہنا ہے۔ مخلوق اللہ سے دور رہنا رہبانیت ہے اور اللہ کی مخلوق میں اللہ کے لیے رہنا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔ مجھے اس بابا کی یہ بات اچھی نہ لگی، بے چارہ چٹا ان پڑھ بابا تھا اور اس کا علم محدود تھا۔ میں اُٹھ کر آنے لگا تو کہنے لگا روٹی کھا کر جانا۔ میں نے کہا جی کوئی بات نہیں، میں ساہیوال پہنچ کر کھا لوں گا۔ کہنے لگا خدمت سعادت ہے، ہمیں اس سے محروم نہ کرو۔ میں مجبور ہو کر بیٹھ گیا۔ بابا اندر سے کٹورا اور پیالی لے آیا۔ پھر اس نے دیگچے سے شوربا نکال کر پیالی میں ڈالا اور دال رکابی میں چنگیر سے مجھے ایک روٹی نکال کر دی جسے میں ہاتھ میں پکڑ کر کھانے لگا۔ وہاں مکھیاں کافی تھیں۔ بار بار ڈائیو لگا کر حملے کرتی تھیں۔ بابا میرے سامنے بیٹھ کر مکھیاں اڑانے کے لیے کپڑا جھلانے لگا اور میں روٹی کھاتا رہا۔

اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ کونے میں اس کے مریدوں اور چیلوں نے تھوڑی سی جگہ لیپ پوت کر کے ایک مسجد سی بنا رکھی تھی۔ وہاں دس بارہ آدمیوں کی جماعت کھڑی ہو گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی ندامت ہوئی کہ میں روٹی کھا رہا ہوں اور میری مکھیاں جھل رہا ہے۔ میں نے کہا بابا جی آپ نماز پڑھیں۔ کہنے لگے آپ کھائیں۔ میں نے کہا جی مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے آپ جا کر نماز پڑھیں۔ مسکرا کر بولے، کوئی بات نہیں آپ کھانا کھائیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا۔ جنابِ عالی! انہوں نے نیت بھی باندھ لی ہے آپ نماز ادا کر لیں قضا ہو جائے گی۔ بابا ہنس کر بولا نماز کی قضا ہے بیٹا، خدمت کی کوئی قضا نہیں۔ آپ آرام سے روٹی کھائیں۔۔۔

میں اس جیسے تین بابوں سے تین مختلف جگہوں میں ملا اور ہر جگہ سے مجھے مایوسی ہوئی۔ کسی نے کوئی ورد بتلایا نہ وظیفہ سکھایا نہ اسمِ اعظم کی ترکیب بتائی۔ بس یہی حکم دیا کہ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ ان کے درمیان رہو۔ تصوف کی منزلیں خود بخود طے ہوتی چلی جائیں گی۔ میں نے اس علم کو بے کار اور بوگس جان کر پھر ٹائم، نیوز ویک اور سوویت نیوز کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کوئی ایک سال بعد مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا اور ایک ہفتے کے قیام کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ چین کے سب لوگ صوفی ہیں اور ماؤزے تنگ ایک بڑا پیر ہے۔ گو ان کا رُخ دنیا کا ہے اور وہ رفعتِ انسانی کے لیے کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کا طریق کار اور اندازِ حصول اور مدارج طے کرنے کا قرینہ سارے کا سارا صوفیا جیسا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں ملنے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ جو فرمان کو سن لیتا ہے وہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے کیونکہ جو سُن لیتا ہے اس پر کرنے کا مقام آجاتا ہے۔ پہلے سُنتا ہے اس کے بعد کرتا اور اس کے بعد جانتا ہے۔ سارا چین اس تصور کی لپیٹ میں لپٹا ہوا ہے۔ پہلے ساری مخلوق ماؤ کے فرمان کو سنتی ہے پھر اس پر بلاحیل و حجت عمل شروع کر دیتی ہے اور جب عمل اپنے آخری مراحل میں داخل ہو جاتا ہے تو لوگوں پر خود بخود کھلنے لگتا ہے کہ فرمان کی روح اور اس کا فلسفہ کیا تھا، ان میں گیان اور علم اور جانکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے چو باؤچی سے پوچھا۔ یار تمہارے ملک کے لوگ ماؤ کی بات اس طرح سے کیوں مانتے ہیں اور اس پر بلاحیل و حجت کیوں عمل کرتے ہیں اور یہاں ڈسکشن اور سنٹنگ اور تھریشنگ کا کیوں رواج نہیں ؟ تو اس نے ہنس کر کہا سنٹنگ تھریشنگ منافقوں اور ریاکاروں کے فلسفے ہیں۔ جب مان ہی لیا، تو پھر وقت ضائع کرنے

سے فائدہ؟ جب باپ کو مان لیا تو والدہ کے پاس جاکر تمام تفصیلات کی تحقیق کرنے سے فائدہ؟ مجھے یاد آیا کہ لاہور کے ایک بابے نے مجھ سے کہا تھا۔ بات اُس وقت تک نہیں مانی جاتی جب تک بات والے کو نہ مانا جائے ...

بنین کا اور چین کے لوگوں کا سب سے بڑا فلسفہ آمنا و صدقنا ہے جو بات بڑا پیر کہے گا وہی حق ہوگی۔ اس کے بعد جو خلیفہ کہے گا، وہی درست ہوگی' اسی پر عمل ہوگا۔ ترمیم پسند کمیونسٹوں کی اور کیپیٹلسٹوں کی خطا ہے۔ چین میں نہ لوگوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے نہ باہر۔ نہ وہاں تنقیدی مجلسیں آراستہ ہوتی ہیں نہ گفتگو بازوں کی پالیاں بجتی ہیں نہ حلقے ہیں نہ گدّے۔ لوگ ہیں اور مجلس کا میل جول ہے اور خوشیاں اور سنگتیں ہیں اور گانا بجانا ناچنا اور ہنسنا ہے۔ میں نے جو پاؤچی سے بڑا کہا کہ اور نہیں تو کم از کم پیکنگ میں ایک اعلیٰ درجے کے حلقۂ ارباب ذوق قسم کی مجلس ہی بنالو جہاں لوگ آسکیں' ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر معاملات ڈسکس کر سکیں' ایک دوسرے کو اپنے علم کی چمچی سے ناک پکڑ کر دوا پلا سکیں' لیکن اس کمبخت نے میری بات نہ مانی اور مجھے شک ہوا کہ وہ پاک چین دوستی کمزور کرنے کے لیے سب ورشن میں لگا ہوا ہے۔ اُس نے کہا' ہمارے فلسفے کی یہ بنیاد ہے کہ جو شخص جس چیز کا علم نہیں رکھتا وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتا جب تک وہ عملی طور پر عرفان حاصل نہ کرلے۔ اپنے ہڈ گوڈے اس میں نہ جلالے۔ جب تک پوری کیفیت اُس پر نہ وارد ہو اسے وہ بات کرنے کا مجاز نہیں' میں نے کہا' یہ تو ہمارے صوفی بھی کہتے ہیں کہ صاحبو' جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان یا اقرار نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس نے کہا۔ میں صوفی کو تو نہیں جانتا لیکن ہمارے یہاں یہی بات ہے کہ اگر میں نے کھیت میں کام نہیں کیا تو کھیت کی بات نہیں کروں گا۔ اگر فیکٹری میں کام نہیں کیا تو فیکٹری کی بات نہیں کروں گا اور اگر سکول میں نہیں پڑھاتا تو درس و تدریس کی بات نہیں کرونگا۔

میں نے کہا گویا تمہارے یہاں صاحبِ حال ہی اپنے حال کی بات کرسکتا ہے۔ اُس نے پوچھا صاحبِ حال کا کیا مطلب؟ میں نے کہا۔ صاحبِ حال وہ ہوتا ہے جو ایک تو حال پر گزر رہا ہو نہ ماضی کی یاد میں مبتلا ہو' نہ مستقبل سے خوفزدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس پر ایک خاص علم کا' ایک خاص عمل کا اور ایک خاص کیفیت کا تاثر ہو۔ ہمارے یہاں صوفیا ایسی بات کہنے

ایسا اعلان کرنے اور ایسی تحریر لکھنے سے منع کرتے ہیں جو متکلم کی اپنی کیفیت نہ ہو' اپنا حال نہ ہو۔ مثلاً ایک خاص کیفیت' ایک خاص جذب' ایک خاص واردات کی بدولت جو کہا جائے یا لکھا جائے اُسے تو حق سمجھتے ہیں باقی کو ناحق۔ اپنا حال ہے تو نظم' غزل' نعت لکھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ طرح مصرع پر غزل لکھنے کو ریا اور منافقت پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنا حال ہے اور خلقِ خدا میں رہ کر زندگی بسر کی ہے اور ان کی زندگی اور ان کی کیفیات اور ان کی مشکلات اور ان کے انکسار کو حال بنایا ہے تو مضمون لکھ سکتے ہیں ورنہ ریاکاری ہے اور خلقِ خدا کے ساتھ منافقت ہے۔ — جو پاؤچی نے ڈائری نکال کر چینی زبان میں 'حال' اور 'صاحبِ حال' کی ترکیبیں لکھ لیں اور ہنس کر مجھ سے پوچھنے لگا۔ تم صاحبِ حال ادیب ہو؟ میں نے کہا' میرے چار افسانے صاحبِ حال کی کیفیت کے ہیں باقی کے تین سو اٹھارہ مضمون منافقت اور ریا کے ہیں۔ اُس نے ہنس کر کہا' بڑی خطرناک پروپورشن ہے' میں نے کہا' ایسے ہی ہے اور یونہی ہوگا' پھر اُس نے پوچھا' یہ باتیں جو تم نے ابھی بتائیں کسی کتاب میں ہیں جو میں واپس کراچی جاکر خرید سکوں' میں نے کہا' ایسی تو کتاب نہیں' 'تو پھر تم نے کہاں سے سنیں؟' اُس نے پوچھا۔ میں نے کہا' ان بابوں سے جو ہمارا پرانا علم رکھتے ہیں' اُس نے خوش ہو کر کہا' تو گویا تمہارے یہاں بھی یہ سسٹم ہے۔ فیڈ بیک کا! تم لوگوں سے بچتے ہو اور ان سے سیکھتے ہو' میں نے کہا' ایسا تو کوئی سسٹم نہیں۔ میں تو اپنے شوق کی غرض سے گیا تھا' صوفی ازم کا علم سیکھنے اور انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک کشکول تھما دیا کہ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ فیض یاب لوگوں کی صحبت میں رہو' سارے درجے آپ سے آپ مل جائیں گے۔ ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں...

واہ! جو پاؤچی نے سر ہلا کر کہا' خوب لوگ ہیں تمہارے ملک کے' یہ اصل پیچھے سٹرنگ گروہ ہے' میں نے کہا میں نے اُن سے ملنا ترک کر دیا ہے۔ بے چارے اور اَن پڑھ سے لوگ ہیں۔ لباس میں بھی مجھ سے مختلف۔ تعلیم میں بھی مجھ سے مختلف اور سوچ میں بھی مختلف۔ ان کی تو بولی بھی میری بولی سے مختلف ہے۔ کہتے ہیں اگر خدا کو راضی کرنا ہے تو اس کے محبوب کو خوش کرو اور خدا کا محبوب وہ انسان سمجھتے ہیں جسے اُس نے بنایا' پھر اپنی روح اس میں پھونکی پھر اس کے لیے عزازیل کو ابلیس بنا کر ذلیل و خوار کیا۔ وہ کہتے ہیں اونچا مقام حاصل کرنا ہے تو خدا کے محبوب کی

خدمت کرو۔ اس کو خوش کرو۔ اس کی خوشامد کرو وہ آپ سے آپ ہاتھ میں آجائے گا۔ عین اسی طرح جس طرح عاشق کے رُوبرُو محبوب کی تعریف کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے سے عاشق خوش ہوتا ہے" چوباڑچی نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کرو خوش اس کو کرو خدمت اس کی، بڑا آسان کام ہے۔ تم کرتے کیوں نہیں ہو؟ تم کو تو تمہارا خدا بھی انہی کی بدولت مل رہا ہے؟"

میں نے چوباڑچی کو خوش کرنے کی غرض سے کہا "ہمیں خدا نہیں چاہیئے یار۔ ہم پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں، ہم خدا کو لے کر کیا کریں گے اور چونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اس لیے ہم نے اس کے محبوب کو لے کر چاٹنا ہے؟ ہمیں تو اس کے جھٹلانے کے لیے اور اس کا بطلان کرنے کے لیے قدم قدم پر اس کے محبوب کے ناسیں دھواں دینا پڑتا ہے۔ اسے ٹکٹکی پر کھینچنا پڑتا ہے۔ چاہے سرکاری دفتر ہو چاہے سبزی منڈی ہو، چاہے بازار ہو چاہے حویلی ہو، چاہے ادبی محفل ہو چاہے نمازِ عید ہو ہمیں کسی نہ کسی صورت اس کے محبوب کو چانٹے مار کر سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو کمبخت سر پر چڑھ جائے۔" میری بات سن کر چوباڑچی زور سے ہنسا۔

عمر نے نعرہ مار کر کہا "ختم کر اپنی رام کہانی۔ بکواس کہیں کا۔ نہ تصوّف سے واقف نہ مارکسزم سے۔ یاویاں مارے جاتا ہے دیسی بابوؤں کی طرح۔ اوئے سائنس اور ٹیکنولوجی کی دنیا میں دیسی اور ہینڈو علموں کا کیا فائدہ؟"

"شاباش!" اخفش نے کہا "دیسی علم سے تو دیسی کنک ہی پیدا ہوگی۔ نس بندی کا علم تو نہیں آسکے گا"

"تو بھی نہ بک" لیڈر نے جھڑک کر کہا "ہر بات میں حجت ہی سوجھتی ہے۔ سیدھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا"

ہم نے اپنی اپنی کٹیں اٹھائیں۔ ان میں طے شدہ اصول کے مطابق پیالیاں، چائے کا ڈبہ، چینی اور خشک دودھ کے ڈبے، کیتلی اور چین، ڈالے اور پھر آگے کی طرف چلنے لگے۔

اب اخفش کی طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی تھی اور اس کے قدم مشکل سے اٹھتے تھے وہ بار بار رکتا اور ہم سب سے آگے چلنے کو کہتا لیکن کوئی بھی اس کو پیچھے چھوڑ کر چلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مسعود

کا خیال تھا کہ اسے ایک چٹان کی اوٹ تلے بیٹھنا اور آرام کرنا چاہیئے اور سفر ترک کر دینا چاہیئے۔ لیڈر بضد تھا کہ اگر ہم میں سے ایک بھی پیچھے رہ گیا تو مہم کا لطف آدھا ہو جائے گا۔ میری، عماد کی اور اخفش کی کوئی رائے نہ تھی۔ ہم بیچارے عوام کی طرح بڑے لیڈروں کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا اور ہم سب نے نگاہیں اوپر اٹھا دیں۔ صرف اخفش اپنی چھڑی پر جھکا ہوا نیچے راستے کو دیکھتا رہا۔ لیڈر نے کہا "بارش کے آثار ہیں اخفش کا ساتھ چلنا ٹھیک نہیں، اس کو بڑی تکلیف ہوگی" لیڈر کے بدلے ہوئے نظریئے پر اخفش کو دکھ پہنچا لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی چٹان پہاڑ کے پہلو سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لیڈر ڈبل لگا کر اسے دیکھنے لگا اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد زور سے بولا "لے آؤ اس کو۔ بڑی فسٹ کلاس جگہ ہے۔ لیٹ بھی سکتا ہے، بیٹھ بھی سکتا ہے" ہم اخفش کو بازوؤں سے پکڑ کر اس طرف لے چلے۔ اس کو ہمارا سہارا دینا اچھا نہ لگا اور اس کے چہرے پر تکدر کے آثار پیدا ہو گئے۔

دراصل مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو سہارا دینا بڑا ناگوار گزرتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں آپ کو سہارا دیا ہو یا آپ پر احسان کیا ہو، وہی آپ کو سب سے زیادہ بُرے لگتے ہیں اور آپ ان کی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سہارا لینے کے لیے آپ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کمزور ہیں اور آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ سہارا دینے والا جب پہلی مرتبہ آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھامتا ہے تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک قوی ہیکل مضبوط، تنومند پہلوان خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اترا ہے اور اس نے آپ کے ساتھ پنجہ ملایا ہے۔ جب وہ آپ کو سہارا دے کر پہلا قدم اٹھاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے آپ کو اڑنگے پر چڑھایا اور دوسرے قدم پر پٹخنی دے دی۔ اس سے پٹخنے اور شکست کھانے کے بعد آپ کے پاس زندہ رہنے کے لیے ایک ہی آرزو رہ جاتی ہے کہ کب وہ دن آئے جب میں اس کو پیڈھی پر چڑھا کر اس طرح پٹخنی دوں اور اپنی ہزیمت کا بدلہ اتار دوں۔ سالہا سال گزرنے کے بعد جب سہارا دینے والا آپ کے ہاتھوں پٹتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک ET TN BRATE

لیکن یہی سہارا جب انسان کو مخالف جنس سے ملتا ہے تو اس کی ساری عمر سہارا دینے والے ہاتھ کو چومتے اور اس کی کلائی سے گال رگڑتے گزرتی ہے اور اسے ہر گھڑی

یہی خوف لگا رہتا ہے کہ یہ ہاتھ مجھے چھوڑ نہ دے، مجھ سے دُور نہ ہو جائے۔

اس معاملے میں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ بچّے کو سہارا دیتی ہے، جوان کا تکیہ بنتی ہے اور بوڑھے کو اُنگلی سے پکڑ کر گور تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ جوانی میں عورت کا یہ کمال اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہِ انتخاب جب اپنے محبوب پر پڑتی ہے تو اس کا سب سے پہلا سنجیدہ سوال یہ ہوتا ہے کہ "آپ اس طرح سے کیوں رہتے ہیں؟" اور "اس طرح" کی تفصیلات بہم کرنے میں مرد کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کے دُکھ درد میں شریک ہونے کے لیے "مے آئی کم اِن پلیز" کہہ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے رہا ہے۔ مرد کا جواب عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ "مجھے آج تک کسی نے سمجھا نہیں اور میری ضروریات کی طرف توجہ نہیں دی۔" ان ضروریات میں خوراک، لباس، سیکس، محبت، تفریح اور دھول دھپّا بھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ لڑکی کبھی اس سے یہ نہیں کہتی کہ آج سے میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کروں گی یا میں آپ کی ضرورتیں پوری کروں گی یا میں آپ کو سہارا دُوں گی۔ وہ تو بس چُپ چاپ ٹکٹکی باندھ کر اپنے محبوب کو تکے جاتی ہے اور اس کی آنکھوں کے اندر ایک نازک سا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور محبوب کا سارا وجود اس کے ساتھ جھُولنے لگتا ہے اور جب ان کی شادی ہو جاتی ہے تو پہلی ہی رات کو نوجوان اپنی زندگی کے سارے واقعات، سارے دُکھ، ساری کلفتیں کھول کر رکھ دیتا ہے اور اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں اور مہربانوں کے سلوک اس کے قدموں کے سامنے اس طرح بکھیر دیتا ہے کہ دُلہن کے نازک پاؤں کو ٹھوکر لگانے میں آسانی رہے اور پنکھڑی ایسے ہونٹوں کو نفرین بھیجنے میں دِقّت نہ ہو۔ پھر شادی کے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مرد اپنی ساری کلفتیں، سارے دُکھ، سارے بوجھ ایک ایک کر کے گھر لاتا رہتا ہے اور بیوی سے مزید سہارے کی طلب کرتا رہتا ہے۔

مُنشی چونکہ مرد تھا اور اُسے سہارا دینے والے ہم سب اُس کے دوست بھی مرد تھے، اس لیے اُس کے چہرے پر تکدّر کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس نے ان ہاتھوں کو پسند نہ کیا جنہوں نے اس کے بازو تھام رکھے تھے۔

جب ہم اُس کھوہ کے پاس پہنچے جہاں مُنشی کو بٹھانا تھا اور ہمیں آگے جانا تھا اور پھر لَوٹتے ہوئے اس کو وہاں سے لینا تھا تو میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ایک سادھو تھا بڑی عمر کا جس نے گیروے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر اور بھنویں منڈائی ہوئی تھیں اور اس کے پاس پیتل کا ایک تاملوٹ تھا اور وہ برگد کے تنے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اتنے بڑے برگد کے نیچے جتنے بڑے برگد تلے مہاتما بدھ کو نروان ہوا تھا۔ یہ برگد ہمارے قصبے کے سکول سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا اور اس کے نیچے اتنا اندھیرا تھا کہ ہم لڑکے کبھی اس کی چھاؤں میں سے نہ گزرے تھے۔ مجھے جب بھی کسی آسیب زدہ جگہ کا خیال آتا ہے اس برگد کا اندھیرا، اس کے پتّوں کی گرد اور اس کی ڈاڑھیوں کے گچھے ضرور یاد آ جاتے ہیں۔ میں اُس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور نیکر پہن کر سکول جاتا تھا۔ جس دن پہلے پہل میں نے اس سادھو کو اس برگد تلے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ سُرخ کھنکتی ہوئی مٹی کا ایک بُت ہو جس کی آنکھوں میں گہرے سبز رنگ کے نگینے پڑے ہوں۔ میں نے اُسے حرکت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ جس مقام پر پہلے دن دیکھا تھا، دو تین مہینے تک اسی طرح اسی حالت میں دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن وہ سادھو لیٹ گیا اور اس کا تاملوٹ بھی اُس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ انہی دنوں ہمارے قصبے میں سُرخ آندھی آئی اور سارے گھر سُرخ مٹی سے اَٹ گئے۔ سادھو کے جسم پر برگد کے پتّوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ پھر ایک دن بارش برسی۔ زور کی موسلادھار بارش اور وہ سادھو کے جسم سے سارے پتّے بہا کر لے گئی۔ وہ پتّے اُس کے لیٹے ہوئے تاملوٹ میں اُسی طرح پڑے رہے۔ میں سکول سے آتے جاتے نظریں چرا کر اس سادھو کو ضرور دیکھا کرتا۔ میری رفتار برگد کے پہلو میں قدرے سُست ہو جاتی اور میں خوف کے مارے تیزی سے چل نہ سکتا۔ پتہ نہیں وہ خود بھول کر ادھر آ گیا تھا یا اُس کے گھر والے اُسے بھول گئے تھے یا شاید کسی سے بھی بھول نہ ہوئی ہو اور نروان کی طلب اُسے یہاں لے آئی ہو۔ دراصل بھول اور طلب میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ طلب جب صادق ہو جاتی ہے تو بھول بن جاتی ہے۔ طالب کو اپنا پرایا، دوست دشمن، گرد و پیش، خود اپنا وجود کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بس ایک طلب کی بھنبھیری سی گھومتی رہتی ہے، باقی سب کچھ لا ہو جاتا ہے۔ محبوب بھی جب اپنے چاہنے والے کو بھول جاتا

ہے، تو طلب کی ایک زنجیر سی بن جاتا ہے۔ جاہ کی طلب، زر کی طلب، نمود کی طلب، آسائش کی طلب اُس کے چاہنے والے کی تلاش بن کر اُسے کُو بہ کُو لیے پھرتی ہے۔ ایسا ہی وہ سادھو تھا۔ نہ وہ کسی کو بھولا تھا نہ کسی نے اُسے بُھلایا تھا۔ بس برگد کے نیچے ذرا ستانے اور دم لینے کو ٹھہر گیا تھا اور اُس کا یہ "دم" بہت ہی لمبا ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس بُت کے چہرے پر داڑھی بڑھی، بھنویں نکلیں، ابرن گل کر بدن پر چیتھڑے بن گیا، ستر ننگا ہو گیا اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موئے زہار کو دیکھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی دس دن پہلے میں نے سکول جاتے ہوئے اُس بُت میں حرکت کے آثار دیکھے۔ اُس کے گھٹنے اُوپر کو اُٹھتے تھے اور پھر نیچے بیٹھ جاتے تھے۔ سر ہلکے ہلکے دائیں بائیں ہلتا تھا اور ایک ہاتھ میں بھی جنبش تھی۔

جب میں دوپہر کے بعد سکول سے لوٹا تو سادھو کے جسم کی حرکت بند ہو چکی تھی اور دو پیلے دھاری دھار بھونڈ اُس کی آنکھوں پر بیٹھے تھے۔ رات بھر اُس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اگلے دن سکول جاتے ہوئے میں نے حوصلہ کر کے برگد کے نیچے نگاہ ڈالی تو سادھو ابھی تک وہاں لیٹا ہوا تھا اور اُس کے چہرے اور اُس کی ننگی رانوں کے ساتھ بے شمار بھونڈ اور بھڑیں چپٹی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت کمیٹی کے چوہڑے اُسے گند گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

جب ٹُنٹی اپنی چھڑی زمین پر رکھ کر اس کھوہ میں بیٹھنے لگا، تو میں نے چیخ مار کر کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ ٹُنٹی یا تو ہمارے ساتھ چلے گا یا ہم سارے نہیں جائیں گے۔"

"لیکن کیوں؟" لیڈر نے تنک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ اسے ہمارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں یار،" ٹُنٹی نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا، "تم لوگ جھیل دیکھ آؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"نہیں ٹُنٹی جی نہیں۔" مسعود نے سر ہلا کر کہا، "جھیل آپ سے زیادہ امپارٹنٹ نہیں، پھر کبھی سہی۔"

ہم سب نے مسعود کی ہاں میں ہاں ملائی اور ٹُنٹی اپنی سوٹی اُٹھا کر پھر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

راستہ لمبا تھا۔ جھیل ابھی دُور تھی اور اُونچائی تیزی سے اُوپر کو اُٹھتی جا رہی تھی۔ ہم چند قدم چلے ہوں گے کہ ٹُنٹی کو سانس لینے کے لیے پھر رُکنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی سارا قافلہ رُک گیا۔

جب قافلوں کا زمانہ تھا اور لوگ سفر اختیار کرنے کے لیے ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں تک ہم سفروں اور کارروانوں کا انتظار کیا کرتے تھے کہ کب آئیں یا کب روانہ ہوں تو شریکِ سفر ہوں۔ یہ قافلے اور کارواں دورانِ سفر ایک فرد کے لیے ٹھہر جایا کرتے تھے اور اس وقت تک ٹھہرے رہتے تھے جب تک اس فرد کی ضرورت پوری نہ ہو جاتی تھی۔ یہ اجتماعی دَور تھا اور آدمی ایک دوسرے کی لڑی میں پروئے ہوئے زنجیر کے ساتھ بندھے تھے، لیکن جب انفرادیت کا دَور آیا تو افراد ایک دوسرے سے الگ ہو کر منفرد ہو گئے۔ منفرد سوچ، منفرد مزاج، منفرد شوق، منفرد پسند۔ اس انفرادیت نے انسان کو بڑے خوشنما اور رنگین تحفے عطا کیے۔ اس کے وجود میں تجسس اور شرِ غالب کے پَر نکل آئے، لیکن وہ اکیلا ہو گیا۔ خوفناک اور زور آور دنیا کا سامنا کرنے کے لیے بے یار و مددگار، یکہ و تنہا۔

ایک امریکی عورت سر پر پیلا رومال باندھے ٹٹو پر سوار جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ سیاہ داڑھی والا ایک لمبا گائیڈ چل رہا تھا اور ان کے پیچھے بھوری داڑھی اور سنہرے بالوں والا ایک لمبا تڑنگا کوہستانی مزدور جا رہا تھا۔ لیڈر نے اُسے روک کر کہا، "خان ہمارے ساتھی کو اُٹھا کر جھیل تک چلو گے۔ ہم تمہیں دس روپے دیں گے۔" دس روپے کا نام سُن کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی چپل کے بند کسنے لگا، پھر اُٹھ کر بولا: "کون دوست ہے تمہارا؟"

"یہ" مسعود نے سوٹی سے ٹُنٹی کی طرف اشارہ کیا اور ٹُنٹی نفی میں سر ہلا کر بولا، "نہیں یار، میں اس کی پیٹھ پر نہیں چڑھوں گا۔ میں چلوں گا۔"

"کیوں نہیں چڑھو گے؟" انگی نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ انسان کی بے حرمتی ہے۔" ٹُنٹی بولا اور آگے چلنے لگا۔

"اوے ٹھیر" لیڈر کو کہا "آیا کہیں سے بڑا ترقی پسند۔ روز تمہارا کیا خیال ہے ہم آدمیوں کی پیٹھوں پر نہیں چڑھتے؟"

"چڑھتے ہیں" منشی نے رُک کر کہا "لیکن اس طرح سے نہیں۔ چالاکی سے چڑھتے ہیں۔ محبت سے چڑھتے ہیں۔ ہشیاری سے چڑھتے ہیں"۔

"تو اب بھی ہشیاری کے زور پر چڑھ جاؤ" مسعود ہنس کر بولا اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ کوہستانی کو ہماری ہنسی بڑی بے معنی سی دکھائی دی اور وہ باری باری ہم سب کا منہ تکنے لگا۔

"کوئی بات نہیں منشی جی" ممتاز نے سنجیدگی سے کہا "چڑھ جاؤ کوئی نہیں دیکھے گا۔ کوئی نہیں بتائے گا"۔

منشی کچھ ڈانواں ڈول سا ہو گیا تو لیڈر نے اپنی سوٹی اُوپر اُٹھا کر کہا "ہم بھی قسم کھا خدا کی جس نے کوہستانی اور اس کی پیٹھ پیدا کی ہے کہ کوئی بھی واپس جا کر یہ نہیں بتلائے گا کہ منشی نے راستے میں ایک آدمی پر سواری کی تھی"۔

ہم سب نے یک زبان ہو کر قسم کھائی اور اس عہد کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دائیں ہاتھ اُوپر ہوا میں اُٹھا دیئے۔ کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور منشی اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ہم پھر اسی طرح سے چلنے لگے۔ کچھ اُونٹ کی چال کچھ اصیل مرغے کی چال اور کچھ دھڑ ٹوٹے ہوئے کتے کی طرح۔ ہمارا اور منشی کی ڈنڈا ڈولی کا فاصلہ کوئی دس قدم کا تھا۔ اچانک اس نے آواز لگا کر کہا "ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ، بھگت کبیر کی بیوی آ رہی ہے" منشی کی آواز سن کر ہم رُک گئے اور کوہستانی اسے لے کر ہمارے قریب آ گیا۔ منشی نے کوہستانی کے گلے میں بازو ڈالے ڈالے کہنا شروع کیا "ایک روز بھگت کبیر مہاراج کے گھر چند سادھو مہمان آئے۔ اتفاق سے اس وقت ان کے گھر پر کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ تھی اور مہمانوں کو بھوکا رکھنا کبیر جی کا دھرم نہ تھا۔ بہت پریشان ہوئے اور اپنی بیوی سے کہنے لگے۔ اب کیا علاج کیا جائے؟ بیوی نے کہا مہاراج کہنے کی بات تو نہیں لیکن اب مشکل ایسی آ پڑی ہے کہ کہے بنا رہا بھی نہیں جاتا۔ ایک بنیا مجھ پر عاشق ہے اور مجھے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا ہے۔ اگر کہو تو اس سے کچھ سودا لے آؤں۔ کبیر جی نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جاؤ شتابی کرو۔ کبیر کی بیوی

جو نہایت خوبصورت اور بلا کی حسین تھی بنیئے کی دکان پر گئی اور کہا بے وقت مہمان آ گئے ہیں۔ گھر پر کوئی چیز موجود نہیں۔ ان کے لیے اتنا سامان مطلوب ہے۔ بنیئے نے کہا اس شرط پر دیتا ہوں کہ تُو رات کو میرے پاس رہے اور میری بغل گرم کرے۔ کبیر جی کی بیوی نے حامی بھر لی اور بنیئے کی شرط مان کے سودا لے آئی اور مہمانوں کو پکا کر کھلا دیا۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو بھگت کبیر نے کہا اب کپڑے بدلو۔ زیور پہنو اور جو وعدہ بنیئے سے کیا ہے اُسے پُورا کرو۔ بیوی نے بارہ ابرن اور سولہ سنگھار کیے اور کبیر جی اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر بنیئے کے گھر کی طرف لے چلے۔ بڑی محبت سے لے جا کر اُسے بنیئے کے دروازے پر جا اُتارا اور خود پلٹ آئے۔ بنیا اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اس کی نگاہیں سر سے پاؤں تک نثار ہونے لگیں۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اور ساری گلیاں کیچڑ سے بھری تھیں اس لیے اپنی محبوبہ کے پاؤں دیکھتے ہی حیران ہو کر بولا تمہاری جُوتیاں کیوں صاف ہیں؟ ذرا کیچڑ نہیں لگی۔ کبیر مجھے اپنی پیٹھ پر لاد کر یہاں لایا ہے"۔ یہ بات سنتے ہی بنیئے کی حالت بدل گئی۔ قصور معاف کرایا اور کہا "تو میری ماں ہے۔" اُس کے دل کا بھاؤ سب بھول گیا اور رام نام کا جاپ کرتا ہردوار کی طرف نکل گیا۔

اعظمی نے سنجیدگی سے کہا "ویسے منشی شکل و صورت سے اس وقت تو بھی ہماری ماں ہی لگتا ہے، بتا ہم کدھر کو نکل جائیں؟"

ہم ہنسنے تو کوہستانی نے کہا "اگے چلو صاحب تمہارا یہ دوست کافی وزنی اے"۔

جب ہم چلنے لگے تو منشی نے زور کی ایک ہانک لگائی کہ ؎

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے ترل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر کبیر

مسعود تڑپ گیا اور رُک کر بولا "شاہ جی اسے پھر پڑھو اور اس وقت تک پڑھتے جاؤ جب تک تمہاری سانس نہ ٹوٹ جائے"۔ "میں نے بڑی مشکل سے پہلا مصرعہ پڑھا اور میری سانس ٹوٹ گئی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو یہ دوہہ ہمیں صوفی تبسم نے سنایا تھا۔ اس وقت بانو قدسیہ بھی ہمارے ساتھ پڑھتی تھی لیکن جس دن صوفی صاحب نے یہ دوہہ سنایا تھا

اس روز وہ مجھی پر تھی مجھے یہ دوسرا وہ دن، قدسیہ کی چیخیں اور صوفی صاحب کا اس دن کا لباس آج بھی اچھی طرح سے یاد ہیں اور میں ان ساری چیزوں کو ملا کر ایک تصویر بنا سکتا ہوں۔ عورتوں کو واقعات اور حادثات من حیث المجموع یاد رہتے ہیں اور مرد کو ان کی تفصیلات یاد رہتی ہیں عورت خالق ہے اور مرد کرافٹس مین ہے۔ عورت اپنے اندر ہی سے پُرانا سُرانا خام مواد لے کر ایک جیتا جاگتا برینڈ نیو بچہ تخلیق کر دیتی ہے اور مرد بھاگ بھاگ کر اور چار دانگِ عالم سے چھوٹی چھوٹی چیزیں اکٹھی کر کے بڑی چابکدستی کے ساتھ ایک مووی کیمرہ، ایک وی۔ سی۔ آر، ریکارڈر یا ایک فوٹوسٹیٹ مشین بنا سکتا ہے۔ مرد پرفیکشنسٹ ہوتا ہے اس لیے اس کی نظر ہمیشہ جزئیات پر رہتی ہے۔ زندگی اور محبت کے میدان میں وہ چھوٹے چھوٹے پیچ اور ڈھبریاں کستا چلتا ہے اور اس کا ایک پیچ ڈھیلا ہو جانے سے ساری مشین لڑکھڑانے لگتی ہے۔ عورت کے تانے بانے کا مواد ایک ہی ہوتا ہے۔ کہیں سے ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو بھی کپڑے کی مجموعی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہم سارے دوست آہستہ آہستہ عشق کی ڈنڈا ڈولی کے آگے چلے جا رہے تھے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دہلیز پر قربان کر دی تھی۔ ابتدا میں جب ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں تو لڑکی گرم شال کی بُکل مار کر سوئیٹر بُننے لگی اور ہمارا دوست شام کے وقت چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اُس چاند کا نظارہ کرنے لگا جو شہر پر چمکتا تھا اور جس پر اس لڑکی کی نگاہیں بھی مرکوز ہو سکتی تھیں۔ اپنے گھر کے غسل خانے میں وہ پانی کے نل کو تھام کر گھنٹوں کھڑا رہتا کہ شاید شہر کے دوسرے کونے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے اُس نے بھی نل کھولا ہو اور زمین کے اندر ہی اندر چھپی پائپوں کے راستے اُس کے ہاتھ کا لمس یہاں تک پہنچ گیا ہو۔ اُس کی نوٹ بک میں شہر کے ان تانگوں کے نمبر تھے جن میں اُس نے اس مقصد سے سواری کی تھی کہ شاید ان میں کبھی فرزانہ بیٹھی ہو گی۔ اُس نے اپنے شہر کے ہر کھمبے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا کہ شاید راہ چلتے ہوئے کبھی فرزانہ کا ہاتھ یا بُرقعے کا کونہ اس سے ٹکرایا ہو۔

ہم سب فرزانہ کو جانتے تھے اور اپنے اپنے طور پر اُس کی طبیعت سے واقف تھے۔

اس نے بھی یوں ایک عمارت بنائی تھی جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ ہمارے دوست کو چاہتی ہے یا اُس پر اسی طرح سے مرتی ہے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہ مر رہا تھا۔ فرزانہ تو اپنے جسم کے خام مواد سے ریشم کے کیڑے کی طرح ایک تار سا نکال رہی تھی اور اس میں لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کو خدا کے چاند یا کمیٹی کے نلکے یا بجلی کے کھمبے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اس کے اس طرح لپٹتے جانے کی کیفیت نے ہمارے دوست کو عجیب طرح کے واہموں میں گرفتار کر دیا تھا۔ خود ہم بھی کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے کہ فرزانہ کو اس سے محبت ہے یا نہیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے محبت کے اقرار ہونے لگے۔ وعدے وعید ہونے لگے۔ ہجر اور بیقراری کی داستانیں بیان ہونے لگیں اور دونوں کے درمیان کسک کی جگہ تڑپ نے لے لی لیکن دونوں کی بنیادی خصوصیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہمارا دوست جب اُس کے نام خط پوسٹ کرنے جاتا تو اُس بس کا ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیتا جس میں سوار ہو کر وہ جی پی او گیا تھا۔ بس سے اتر کر لیٹر بکس تک جاتے ہوئے وہ ہر مرتبہ اپنے قدم ضرور گنتا کرتا۔ اور انہیں اس ٹکٹ کی پشت پر رقم کر لیا کرتا۔ جی پی او کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہر بار اس کنکر کو ضرور اُٹھا لیا کرتا، جو سیڑھی پر قدم دھرنے سے پہلے اس کے پاؤں تلے آیا ہوتا۔ اُس کے پاس بس کے بہت سے ٹکٹ، کنکروں کی ایک پوٹلی اور قدموں کی بے شمار گنتی جمع ہو گئی تھی۔ فرزانہ کے پاس صرف اُس کے خط تھے، بدن کے گرد کشمیری شال تھی اور دل میں شاید اُس کی یاد تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے درمیان ملاقاتیں ہونے لگیں۔ طویل اور خاموش ملاقاتیں۔ فرزانہ کے سارے گھر والے ڈرائنگ رُوم میں جمع ہوتے ہمارا دوست بھی پہنچ جاتا۔ چائے کا دَور چلتا، سیاست پر گفتگو ہوتی، فلموں کی باتیں ہوتیں، ریڈیو پروگراموں پر تنقید کی جاتی اور رات گئے ہمارا دوست گھر واپس لوٹتا۔ ان طویل اور لاتعلق ملاقاتوں میں فرزانہ اور ہمارے دوست کے درمیان تعلق کا بس ایک ہی فقرہ اُبھرا کرتا اور وہ بھی لفظوں کے بغیر۔ جب ان دونوں کو سب کی موجودگی میں اظہارِ محبت کرنا مقصود ہوتا یا اُن کے سینے محبت کے بوجھ تلے چٹخنے لگتے یا ایک کربناک چیخ اُن کے وجود کے اندر گونج بن کر گھومتی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا تو وہ اپنی پُوری آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر تین مرتبہ اپنے پپوٹوں کو

بند کرتے اور پھر آنکھیں بند کر کے شانت ہو جاتے۔ یہ شانتی، یہ سکون اور یہ اطمینان ان کی شخصیت پر کچھ ایسا اثر کر گیا تھا کہ باقی لوگوں کے اندر بہت کچھ چھیل دیتا جیسے تابوت کا ڈھکنا فٹ کرنے کے لیے دھیمے ہاتھ کا رندہ چلتا ہے۔

مہینوں پر مہینے اور برسوں پر برس گزرتے رہے اور ان کے درمیان آنکھیں کھولنے اور بند کرنے کا سلسلہ سولہ سال پر محیط ہو گیا۔ اس اثنا میں ہم سب نے اپنے دوست کو مختلف قسم کے مجرب نسخے عطا کیے۔ اپنے اپنے تجربات سے نوازا اور اس کو جسمانی محبت کی طرف شدت سے اکسایا لیکن اس کا انجن ایسا جام ہوا تھا کہ اُس طرف گیئر ہی نہ بدلتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی ایسی سکیمیں بنائیں، ہم نے بھی مواقع فراہم کیے لیکن وہ پپوٹوں کے بسط و کشاد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمارا خیال ہے اس لڑکی کی چند برگزیدہ سہیلیوں نے بھی اس کو ایسے ہی مشورے دیے ہوں گے تبھی تو وہ ہمارے دوست کی پیش قدمیوں کے آگے استقبالی بن گئی۔ پھر ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ ملاقی شدن ہیر بارانجھا در باغ۔ اور وہ دونوں موت کے کنارے جا کھڑے ہوئے۔ ہمارا دوست موت کی پرچھائیں بن گیا اور اُس پر دنیا کی ہر نعمت کے دروازے بند ہو گئے۔ آہستہ آہستہ زندگی پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ ایک ڈھنڈار ویرانے میں تبدیل ہو گیا۔ ہمارا نسخہ اُلٹ ثابت ہوا۔ دراصل وہ اس مٹی سے نہیں بنا تھا جس سے عام لوگ بنتے ہیں۔ اچھے شریف خوش وضع خوش اطوار لوگ وہ ایسے گارے سے بنا تھا جو مسجد کے پرنالے سے بہ کر زمین پر جمع ہو جاتا ہے اور جس میں مُصلّوں کے تنکے اور صفوں کے دھاگے شامل ہوتے ہیں۔ ایسی مٹی سے بننے والے لوگ نہ نمازی ہوتے ہیں نہ دنیادار، نہ سوختنی نہ فروختنی۔ کھنگرے ہوتے ہیں کوئی انہیں ٹھوکر بھی نہیں مارتا۔ ٹھوکریں کھانے والے لوگوں کی اَنا بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان میں زندگی کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سازگار ماحول میں رہنے والوں کی اَنا بڑی رنگین ہوتی ہے ان میں ریشم کی سی لچک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے وجود میں بھنورے کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا دوست آئینے کی کرچیوں سے بنا تھا وہ کرچیاں جو مسالے کی چوڑی سے چپکی ہوتی ہیں۔ وبا پڑنے پر اکھڑتی

بھی رہتی ہیں لیکن دھندلانے تک ایک ہی کلائی سے وابستہ ہو کر اس کا عکس دکھتی رہتی ہیں۔ اس ملاقی شدن سے ہمارا دوست اور گمبھیر اور غم ناک اور خاموش ہو گیا جیسے لمبی اونڈھی سانس بھرنے سے بے شمار اور چھوٹی چھوٹی آہیں سینے میں سنپولیوں کی طرح کلبلانے لگتی ہیں جیسے نکسیر میں ناک صاف کرنے سے خون اور تیزی سے بہنے لگتا ہے۔

لیڈر زور سے چیخا "اوئے اشفاق تو پھر پیچھے رہ گیا!"

میں نے نگاہیں اُوپر اُٹھا کر دیکھا تو میرے ساتھی ایک اونچی صدا کی حد تک مجھ سے دُور ہو گئے تھے۔ حماد چھڑی کا سہارا لے کر گھبرایا ہوا ہوتے ہوئے ہنس رہا تھا اور اس کی ہنسی میں شرارت تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سنجیدگی سے بولا "شاہ جی! سچ سچ بتانا اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟"

میں نے کہا "میں علم طبقات الارض کی بابت سوچ رہا تھا۔"

اس نے چلنے کا اشارہ کر کے پوچھا "پھر کس نتیجے پر پہنچے؟"

میں نے کہا "میں ذہن کی تہوں میں کچھ زیادہ نیچے نہیں پہنچا تھا کہ لیڈر نے آواز دے دی۔"

"ابھی اور نیچے جانے کا ارادہ تھا؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

میں نے کہا "ابھی تھوڑا سا نیچے اور جا سکتا تھا۔"

"لیکن جہاں تک پہنچے" حماد نے کہا "وہاں کیا دیکھا؟"

"وہاں آ" میں نے سر جھکا کر کہا "وہاں کیٹی کے پاپڑوں کا ایک جال بچھا تھا۔ کچھ کمزور ہو گئے تھے۔ کچھ کھنگرا گئے تھے۔ چند ایک میں سے پانی رس رہا تھا لیکن ہر نالی کے اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "اس جھرنے کو دیکھو شاہ جی کیا گیت گاتا ہوا جا رہا ہے۔ یہ گلیشیر کا پانی ہے اس میں گیت ہوتے ہیں سسکیاں نہیں۔"

میں نے کہا "لیٹنے اپنے کان میں حماد کسی کو گیت سنائی دیں گے کسی کو کراہیں۔"

اُنھوں نے پلٹ کر کہا "لو سالے دونوں پیچھے رہ گئے" مستی کی سواری ان کے ساتھ ساتھ جاری تھی اور اس نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ ماتھے کا

اور ہاتھ کا بڑا پرانا رشتہ ہے۔ کچھ ہاتھ ماتھے تک سلام کرنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ کچھ ڈھلی ہوئی زلف اٹھانے کے لیے۔ کچھ ہاتھ ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ ہاتھ ماتھا پیچھے دبانے اور ہونٹ اوپر اٹھانے کی غرض سے بڑھتے ہیں۔ کچھ ہاتھ دور دیکھنے کے لیے ماتھے کا سائبان بنتے ہیں اور کچھ پریشانی کے عالم میں جبیں بہائی کرنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ ہاتھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مریض کے ماتھے سے لگتے ہی اس کی بیماری سلب کر لیتے ہیں وہ آنکھیں کھول کر اپنے پر جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا ہے اور سارے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ الفاظ اظہار کا بڑا سہارا ہیں، لیکن ہم ان کے بغیر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ بدن کی بولی بڑی موثر بولی ہے اور انسان اس کا مطلب خوب سمجھتا ہے۔ ہر حرکت، ہر جنبش، ہر لچک اپنے اندر ایک معنی رکھتی ہے۔ اس کے لیے مخاطب کو کوئی ڈکشنری دیکھنی نہیں پڑتی، کسی سے معنی پوچھنے نہیں پڑتے۔ جب آپ دل ہی دل میں کسی کی پذیرائی کرتے ہیں، کسی کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں تو باتیں کرتے ہوئے آپ کے بازو کھل کھل جاتے ہیں اور ہاتھوں کی انگلیاں پھیل پھیل جاتی ہیں۔ آپ کرسی سے آگے جھک کر بات کرتے ہیں۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر سر آگے کر کے بولنے لگتے ہیں۔ کوٹ کے گریبان کے یا بلاؤز کے بٹن کھولنے سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آؤ تمہیں اپنے دل میں بٹھا لوں۔ تم سے دل کی باتیں کروں۔

جب کوئی خوبصورت چودہ سالہ لڑکی سڑک پر سے گزرتی ہے تو نوجوان دکاندار دونوں بازو پھیلا کر انہیں کمر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ بزرگ اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتے ہیں۔ خوش پوش مرد کا ہاتھ اپنی ٹائی کی طرف بڑھتا ہے۔ اطالوی لوگ اپنی دائیں گال پر دائیں ہی ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے برمہ چلانے لگتے ہیں۔ سسلی کے لوگ بائیں کان کی بن گوش کو دائیں ہاتھ کی چٹکی سے جھٹکے دینے لگتے ہیں۔ جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو ساکت ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے کرسی کے آرمز پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کندھے بیچارگی کے عالم میں ذرا ذرا ہلتے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں۔ جو عورت اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر کنڈلا کر آپ سے باتیں کرتی ہے وہ حفاظتِ خود اختیاری کا اعلان کر رہی ہوتی ہے اور بازوؤں کی فصیل کے پیچھے سے آپ سے ہمکلام ہوتی ہے۔ جو بار بار اپنے سینے کو دوپٹے سے ڈھکتی

ہے اور ٹخنوں تک ہاتھ لے جاتی ہے وہ کہتی ہے قبول کیا بعوض ایک گفتگو کے، ایک ملاقات کے قبول کیا، ایک مسکراہٹ نصف تبل نصف غیر متبل پر قبول کیا۔ جب چھوٹی لڑکیاں بلوغت کو پہنچتی ہیں تو وہ سر جھکا کر اور سینہ اندر کر کے بدن کی بولی میں اعلان کرنے لگتی ہیں کہ میں جوان ہو رہی ہوں ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کھڑے گھٹنے پر دوسری ٹانگ کی پنڈلی رکھ کر ٹخنے سے پاؤں گھمانے والا یا گھمانے والی یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ کبھی پھر بھی ملنا اور جلدی ملنا اور زیادہ قریب ہو کر ملنا۔ لیکن یہی پاؤں جب فرش پر بار بار بجنے لگتے ہیں اور آواز بیا اونچی ہونے لگتی ہے تو بدن اپنی بولی میں کہتا ہے۔ میں بیزار ہو رہا ہوں، میں جا رہا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔

مردوں کے مقابلے میں عورتیں بدن بولی سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ سیدھے سادے مرد ان کی بات سمجھ جاتے ہیں اور نا سمجھ اپنی گفتگو میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت ان سے مخاطب ہے اور بڑی لمبی بات کہہ رہی ہے اور بار بار کہہ رہی ہے۔ آج کل جب سر میں تیل لگانے اور چوٹی کرنے کا زمانہ نہیں رہا، عورتیں کھلے چھوڑے ہوئے بالوں کے پرے اپنے گالوں پر اُڑاتی ہیں۔ پھر انہیں سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹاتی ہیں۔ ان میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کو تھپتھپاتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں کہ میرے ہاتھ اس طرح تھپتھپانے کے عادی ہیں اور یہ بھڑکے ہوئے جذبات کو آسودگی بخشتے ہیں۔ سر ایک طرف جھکانا، آنکھوں کو گھمانا اور ہونٹوں کی کمان کو گول کرنا یہ کہتا ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اگلی دفعہ جب ملو گے تو اس سے بھی اچھے لگو گے پھر میں اپنی بدن بولی کا اگلا باب سناؤں گی، نئی بات بتاؤں گی اور تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جاؤ گے، اپنے آپ کو پیارے لگنے لگو گے۔ خود کو تھپکنے اور اپنے آپ کو لوری دینے والے کے جواب میں اگر سامنے کا مرد میز پر یا اپنی کرسی کے آرم پر یا اپنی کتاب پر انگلیوں سے تار دینے لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اٹھ کر باہر جا رہا ہوں سٹاپ۔ تم بھی اٹھ کر باہر آ جانا سٹاپ۔ یہاں بہت سے بیہودہ لوگ بیٹھے ہیں ان کے درمیان جی نہیں لگتا سٹاپ۔ باہر موسم اچھا ہے اور تنہائی ہے۔ کم اینڈ ٹنس۔

مفتی نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ممتاز نے میری طرف دیکھے بغیر اسی طرح سر جھکائے ہوئے

پھر پوچھا: "ہاں شاہ جی تو پھر آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"کافی خاص بات لگتی تھی۔" اس نے کہا۔ "آپ کا چہرہ بڑا متفکر تھا۔"

میں نے کہا: "ہر دانشور کا چہرہ ہر وقت متفکر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں۔"

دانشور کے لفظ پر وہ زور سے ہنسا اور رُک کر بولا: "ایک عام آدمی دانشور کب بنتا ہے؟"

میں نے کہا: "عماد اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔ کسی سمسٹر سسٹم کی ضرورت نہیں کوئی امتحان پاس کرنا نہیں پڑتا۔ بس کچھ عرصہ چند دانشوروں کے درمیان بیٹھ کر آدمی خود بھی دانشور بن جاتا ہے۔"

کہنے لگا: "شاہ جی میں ایک انجینئر ہوں اور ساری عمر ایک الیکٹرانک مستری بنتا رہا ہوں۔ اپنی سمجھ کے مطابق چند کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ کچھ سمجھ دار لوگوں سے بھی ملا ہوں لیکن میں دانشور نہیں بن سکا۔"

میں نے کہا: "سائنس کے طالب علموں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ دانشور نہیں بن سکتے۔ تم لوگ بڑے شوق سے بی ایس سی۔ ایم ایس سی کرتے ہو تاکہ نوکری حاصل کرنے میں آسانی رہے اور تم کو نوکری آسانی سے مل بھی جاتی ہے لیکن اپنی تمام عقلمندی اور فہم و فراست کے باوجود تم دانشور نہیں کہلا سکتے۔ انجینئر کہلاتے ہو' ڈاکٹر کہلاتے ہو' جیالوجسٹ کہلاتے ہو لیکن دانشور نہیں۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا: "مجھے دانشور بننے کا بڑا شوق ہے اور میں اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن کوئی میری مدد نہیں کرتا۔"

میں نے کہا: "اب تو وقت گزر گیا عماد' پھر کبھی سہی کسی اگلی زندگی میں' کسی اگلے زمانے میں۔"

وہ کچھ دُکھی سا ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میری طرف گھمایا اور پوچھا: "کیا مسعود بھی دانشور ہے؟"

میں نے کہا: "یہ اپنا مسعود؟"

"ہاں۔"

"نہیں' یہ دانشور نہیں اور شاید اب ہو بھی نہ سکے۔"

"کیوں؟" عماد نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے اپنا چانس کھو دیا۔ اگر شروع ہی سے لاہور میں رہتا تو شاید بات بن جاتی۔"

"لیکن یہ شاعری کرتا ہے۔" عماد نے وثوق سے کہا۔ "اس کی دو تین غزلیں تو بہت ہی اچھی ہیں۔"

میں نے کہا: "دانشور ہونے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں۔ مصنف یا صاحبِ کتاب ہونا لازمی نہیں۔ اس کے لیے ایک سیاسی نقطۂ نظر رکھنا ضروری ہے۔"

"اس کا سیاسی نقطۂ نظر ہے شاہ جی!" عماد نے چیخ کر کہا۔ "یہ بڑا مسلمان اور سخت قسم کا پاکستانی ہے اور پاکستان کو سیاسی طور پر ایک طاقتور ملک دیکھنے کا متمنی ہے۔"

"یہی باتیں اس کے دانشور ہونے کے خلاف جاتی ہیں۔" میں نے کہا: "اس لیے کہ مذہب' نیشنلزم' ملک اور اقدار سب پرانے سکے ہیں۔ انہیں میوزیم میں تو جگہ دی جا سکتی ہے' اعلیٰ سیاسی سوچ اور آفاقی برادری اور بقائے باہمی کے بازار میں نہیں چلایا جا سکتا۔ مسعود کے پاس چونکہ بہت ہی پرانے سکے ہیں اس لیے ان کے ساتھ وہ محلے کے بچوں سے گُھتی پا' تو کھیل سکتا ہے دانشوری کے موٹی کارلو میں رولے پر داؤ نہیں لگا سکتا۔"

عماد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "شاہ جی آپ کمیونسٹ تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا۔

"سوشلسٹ؟" اس نے پوچھا۔

میں نے دلہن کی طرح سر جھکا کر آہستہ سے "ہاں" کہا اور اپنے فلیٹ بوٹ میں سے کنکر نکالنے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ جب میں اُٹھ کر کھڑا ہوا تو عماد ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا تھا اور اس کی گردن ذرا سی جھکی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "شاہ جی آپ سوشلسٹ کیوں ہیں؟"

میں نے کہا: "اس لیے کہ جب سے روس نے چیکوسلوکیہ پر حملہ کیا اور مسٹر دوب چیک کا مدعا ہی غائب کر دیا اس وقت سے کمیونسٹ ہونے میں کوئی چارم باقی نہیں رہا۔"

"اور جمہوریت؟" اس نے آدمی سی بات کی۔

"جمہوریت کا پہلے پہلے رواج تھا جب کوٹ ٹخنوں سے اوپر ہوتے تھے اور ان کے لیپل تنگ ہوتے تھے۔ قمیصوں کے کالر چھوٹے اور نوکدار ہوا کرتے تھے۔ اب فیشن بدل گیا ہے اور میں وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ سوشلسٹ ہونا وقت کے ساتھ چلنا ہے۔"

اس نے کہا۔ "آپ وقت کے ساتھ اتنا کیوں چلتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں نام سرور ہوں غلام سرور نہیں۔ وقت کے ساتھ چلنا صحت بخش اور زندگی بخش ورزش ہے۔ اس میں لحمیات اور حیاتین اپنی پوری مقدار میں ملتے ہیں۔"

"لیکن دوسرے دانشور تو وقت اور زمانے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں شاہ جی؟"

میں نے کہا۔ "ان کا احتجاج در پردہ اقرار ہوتا ہے۔ عام لوگوں کو اور کم پڑھے لکھے انسانوں کو وہ احتجاج نظر آتا ہے جیسے محکمۂ زراعت کی طرف سے دیواروں پر لکھے ہوئے سلوگن 'پولی کو تلف کریں' میں ایک احتجاج نظر آتا ہے اور ایک عام پینڈو یہ سمجھتا ہے کہ محکمۂ زراعت پولی کے خلاف جہاد کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہے لیکن حقیقت میں وہ اقرار ہوتا ہے کہ پولی ہے اور اسی طرح رہے گی اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

میری بات عمار کی سمجھ میں نہ آئی اور اس نے روا روی میں پوچھا۔ "تو آپ بھی غربی اور بیماری اور بھوک کے خلاف اسی قسم کا احتجاج کرتے ہیں؟"

"بالکل۔" میں نے خفت سے جواب دیا۔ "میرا احتجاج بھی 'پولی احتجاج' ہے اور اسی چیز نے مجھے دانشور بنایا ہے۔ اگر مسعود چاہے تو وہ بھی 'پولی احتجاج' کا اعلان کر کے دانشور بن سکتا ہے۔ عزیز لیں لکھ کر نہیں۔"

پھر ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھانے لگے اور تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ منّی اپنے کوہستانی کی پیٹھ سے اتر آیا تھا اور دوسروں کے ساتھ قدم قدم چل رہا تھا۔ ہم پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ آئے تھے اور چوٹی کے گرد اگرد مسافت کے دائرے تنگ ہونے لگے تھے۔ لیڈر نے اپنی گھڑی دیکھی اور اعلان کیا کہ ہم بیس منٹ آدھ گھنٹہ اس جگہ رک سکتے ہیں۔ یہ خبر پاتے ہی سب اسی جگہ سرِ راہ بیٹھ گئے اور اعظمی پھولوں کی تلاش میں آگے نکل گیا۔ کوہستانی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ مسعود نے اپنے تھیلے سے ایک سیب نکالا اور کوہستانی کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو خان! سیب کھاؤ۔" وہ مزے سے دانت کریدتا

اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

"اوے!" لیڈر نے چڑ کر کہا۔ "سیب کیوں نہیں کھاتا؟ سیب اچھا نہیں لگتا؟"

"لگتا ہے لگتا کیوں نہیں۔" اس نے لاتعلقی سے جواب دیا اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"حد ہوگئی یار! یہ لوگ سیب پسند نہیں کرتے حالانکہ ان کے اپنے ملک کا میوہ ہے!" لیڈر ہنس کر بولا۔

"اسی لیے نہیں کھاتے میری جان۔" منّی نے کہا۔ "کہ ان کے ملک کا میوہ ہے۔ اس کو سیب دینا گویا ہمارے گاؤں میں کسی کو ایک بیر دینا ہے۔"

"تو یہ جب بھی کرے گا الٹی بات کرے گا۔" عمر نے کہا۔ "کہاں سیب کہاں بیر۔ کہاں ہیرا کہاں موتی۔"

"منّی!" مسعود نے منّی کو آنکھ مار کر کہا۔ "بس کر۔ اس پر اپنی باتیں ضائع نہ کیا کر۔ یہ لیڈر آدمی ہے اور لیڈروں کا ذہنی لیول بس اسی قدر ہوتا ہے۔"

لیڈر غصے سے لال پیلا ہو گیا اور چیخ کر بولا۔ "تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، گدھا سمجھتے ہو؟"

منّی نے کہا۔ "سمجھتے نہیں تم ہو۔" اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور اعظمی دور سے پکار کر بولا۔ "میرے بعد کیا بات ہو گئی؟ کون کس پر چڑھ گیا؟"

"یہ منّی لیڈر پر چڑھ رہا ہے۔" مسعود نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"لیکن وہ تو کوہستانی پر چڑھا ہوا تھا۔" اعظمی نے زور سے پوچھا۔

"کوہستانی بھاگ گیا۔" عماد نے کہا۔ "لیڈر کے بعد تمہاری باری ہے۔"

"حاضر سائیں حاضر۔" اعظمی وہیں سے بولا اور مسعود کوہستانی کے لیے نکالا ہوا سیب خود کھانے لگا۔ کوہستانی بڑے بھورے لدھر بندر کی طرح پتھر پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی حضرت عیسیٰ ایسی سنہری ڈاڑھی سے تنکے نکال رہا تھا۔

"منّی جی!" اعظمی نے تین بنفشی پھول آگے بڑھا کر کہا۔ "اسے ہماری طرف سے ان کو دے دینا۔"

مسعود نے سوالیہ نگاہوں سے انگلی کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی قینچی جیسی نگاہیں میرے اوپر گاڑ دیں۔ میں نے کہا: "یہ کوہستانی کا سیب کھا رہا ہے۔"

انگلی نے کہا: "یہ سیب کی بات نہیں، زیب کی بات ہے۔ کیا نام تھا اُن کا؟"

"کن کا؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"وہی جو دھرپورے لاہور میں رہتی تھیں؟"

"عالم بی بی۔" منشی نے یوں کہا جیسے کسی ملک کا دارالخلافہ بتایا ہو۔

"ہاں عالم بی بی۔ عالم بی بی۔" انگلی کی آنکھیں چمکیں۔ "یہ پھول میں اُن کے لیے لایا تھا۔"

"منشی۔" لیڈر نے غصے سے کہا۔ "اس حرامزادی عالم بی بی نے بڑا تنگ کیا ہے، سچ سچ بتا وہ کون تھی؟"

"وہ ایک حرامزادی تھی۔" منشی نے اطمینان سے کہا اور پڑیا سے ایک پان نکال کر منہ میں ڈال لیا۔

حماد جو پہلے ہم جیسا تھا لیکن اب بہت زیادہ نیک ہو گیا ہے، عالم بی بی کا نام سن کر چونکا اور پھر اس کی ناک کے نتھنے اور بڑے ہو گئے۔ منشی نے اس کے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "شکر کرو حماد جی بچ گئے ہو ورنہ ہماری طرح سے مارے جاتے۔"

انگلی نے کہا: "شاید مرا ہوا آدمی تمباکو کا پان کھا رہا ہے، اگلے جہان جائے گا تو پہلا سوال زام کے بارے میں کرے گا۔"

"لیکن منشی جی۔" مسعود نے کمال سنجیدگی سے پوچھا: "یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ آپ تو ماشاءاللہ پوتے والے ہیں۔"

منشی نے کہا: "بے علموں کے ساتھ سیر کرنے میں لطف نہیں آتا۔ تم لوگ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے اس کو بچے، جوان اور بوڑھے کے گز سے ناپتے ہو۔ تم سارے درزی ہو۔ آؤٹ فٹر ہو۔ اب کوئی ٹیلر ماسٹروں کو کیسے سمجھائے کہ مرد شروع دن سے لے کر آخر تک مرد ہوتا ہے اور اس کے تمام اعضا اسی طرح کام کرتے ہیں جیسے پہلے دن کر رہے تھے۔ عمر گزرنے سے کوئی عضو اپنی ڈیوٹی نہیں بدلا کرتا۔"

"لعنت ہو تجھ پر۔" لیڈر نے اس کے سر پہ سوٹی مار کر کہا۔ "اس کا سر سفید ہو گیا لیکن جوانوں کی سی سوچ نہ گئی۔"

"اب یہ اپنا عمر ہے۔" منشی نے آہستگی سے کہا: "کبھی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ منشی جی حیرانی کی بات ہے آپ ستر سال کے ہو گئے لیکن آپ کا دل ابھی تک خون پمپ کرتا ہے۔ آپ کی زبان اب بھی ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ آپ کے گردے ابھی تک پیشاب بناتے ہیں۔" پھر وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پان دائیں سے بائیں گال میں بدل کر بولا: "یارو! بچوں پر اور عنفوانِ شباب پر اور جوانی پر اور ادھیڑ عمر کی نفسیات اور جنسیات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بڈھوں پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ کسی بھڑوے نے ادھر توجہ ہی نہیں دی۔ دراصل بڈھے کو ایک فرائیڈ کی شدت سے ضرورت ہے اور جب تک وہ نیا فرائیڈ پیدا نہیں ہو گا تم جیسے لوگ بے علم ہی مر جائیں گے۔"

مسعود نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا: "اے بابا ہمیں بڈھوں کے بارے میں کچھ بتا۔"

منشی نے کہا: "سنو میرے پیارے بچو! بڈھے دراصل بڈھے نہیں ہوتے۔ وہ انسان ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا خوف، اخلاقی اقدار اور لوک لاج بڈھوں کو ان کی نارمل جنسی زندگی بسر کرنے نہیں دیتی۔ چھوٹوں کی تنقید اور اپنے ہم عصروں کے طعن سے خوفزدہ ہو کر بڈھا اپنی جنسی زندگی تجنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس زندگی کو جو تیس پینتیس بلکہ اس سے بھی زیادہ سالوں سے اس کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہے، اس کے بدن کا ایک جزو بن چکی ہوتی ہے، اس کی سائیکی کا ایک حصہ ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑا دھچکا ہوتا ہے میرے پیارے بچو اور اس دھچکے کو سہارنا بڈھے ہی کا کام ہوتا ہے، لیکن یہ ٹوٹ اور یہ گھٹن چھوٹ کیفیت بڈھے کو بدمزاج، چڑچڑا، ضدی، جھکی اور کڑوا بنا دیتی ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جھگڑتا ہے جس کو سوسائٹی کی طرف سے جنسی عمل کی اجازت ہو۔ ہر اس فیشن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس سے جنس کو تقویت ملتی ہو۔ پنجرے کا شیر ہر آزاد تماشائی پر دھاڑتا ہے اور دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ دیکھو اس بڈھے کو کیا ہو گیا ہے۔ پوتا گیند بلا برآمدے میں فرش پر چھوڑ جائے وہ لڑے گا۔ بیٹا نیا پلنگ لانا بھول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیٹی فریج کا دروازہ ٹھیک سے بند نہ کرے تو وہ لڑے گا۔ گوالا وقت پر دودھ نہ لائے تو وہ جھگڑے گا۔ بہو شلوار میں ازار بند ڈالنا بھول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیوی کل کا آیا ہوا خط آج دے تو وہ لڑے گا۔ عینک رکھ کر بھول جائے تو ہر ایک سے جھگڑے گا۔"

"واہ بھئی واہ" لیڈر نے تالی بجا کر کہا۔ "سالے کے پاس بیوی ہے پھر بھی لڑتا ہے۔"

"یہی تو بات ہے جن جی" منشی نے سر ہلا کر کہا۔ "ماچس ہے لیکن گھر والوں نے اسے پانی کی بالٹی میں ڈال دیا ہے۔ کھوکھا بھی گیلا تیلیاں بھی گیلی۔"

"لیکن یار منشی" اشفی نے شرارت سے کہا۔ "وہ دھرمپورے والی ماچس تو واٹر پروف تھی۔"

"تھی تو واٹر پروف" منشی نے اقرار بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن تھی مرسری ربڑ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھاؤ تو اُچک کر اوپر چلی جاتی تھی۔ پیچھے ہٹو تو لٹک کر نیچے آ جاتی تھی۔ نواسے نواسیوں والی تھی لیکن اپنی بیٹی سے جوان تھی۔"

عماد نے کہا۔ "منشی جی بوڑھے کے لیے جوان ساتھی اچھا نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے، ہوتا کیوں نہیں" منشی چیخ کر بولا۔ "بوڑھا تو بلکہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ عزت میں، مشکل میں، بیماری میں، تنگ دستی میں قابلِ اعتماد ساتھی ہوتا ہے۔ اپنے ساتھی کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے۔ جوانوں کے مقابلے میں چونکہ بوڑھے کی مصروفیات کم ہوتی ہیں اس لیے محبت میں، اختلاط میں اور تشفی میں زیادہ سے زیادہ وقت انویسٹ کر سکتا ہے۔ پھر وہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اپنے ساتھی کو جسمانی طور پر زیادہ خوش رکھ سکتا ہے۔ جنس سے لے" منشی نے سر ہلا کر کہا۔ "دل کھول کر جنس دے۔ لیکن یہ باتیں میرے بعد تم لوگوں کو کوئی نہیں بتائے گا۔"

مسعود نے عمر کو ایک جھڑکا مارا اور مصنوعی غصے سے کہنے لگا۔ "بدذات منشی جی کی باتوں پر ہنستا ہے!"

"ہاں دیکھو یہ ہنستا ہے۔" اشفی نے کہا۔ "حالانکہ شالا لوگ عام طور پر منشی جی کی باتوں پر ہنستا ہے۔"

میں نے کہا۔ "منشی جی یہ تو بکواس کرتے ہیں اور اس وقت سنجیدہ موڈ میں نہیں ہیں۔ آپ مجھے اور عماد کو بتائیں۔"

منشی اپنی بات کی لہک میں کہنے لگا۔ "بوڑھے کی راہ کا سب سے بڑا روڑا اس کی شکل ہوتی ہے۔ اس کی ہیئت ہوتی ہے۔ ناک لمبی ہو کر آگے کو جھک جاتی ہے۔ آنکھیں تنگ ہو جاتی ہیں۔ چہرہ جھریوں سے اٹ جاتا ہے۔ اس کے جسم کے خلیے کم ہونے لگتے ہیں لیکن وہ اس وقت

بس زندہ رہتا ہے جب تک اس کے ہونٹوں پر سوال نہ آ گئے۔"

"سوال کیسا؟" عمر نے بےچین ہو کر پوچھا۔

منشی نے کہا۔ "بوڑھے کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے طلب کا خواہش مند ہو۔ اس کا اظہار کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا، چپ چاپ خاموشی سے سن لیتا ہے اور پی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے، اپنی خوراک سے، اپنے لباس سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اور ایک دن اپنے کپڑے اٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جا کر خاموشی سے مر جاتا ہے۔"

مجھے یاد آیا ہمارا ایک یار تھا خواجہ رفیق۔ جب میری اور اس کی دوستی ہوئی اس کی عمر اکسٹھ برس کی تھی اور میں اپنی زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ میری اور اس کی دوستی ایک نسخے اور ایک لڑکی کے سلسلے میں ہوئی۔ خواجہ کے پاس کچھ پرانے صدری نسخے تھے جن میں سونا بنانے اور ہمزاد کو قابو میں کرنے سے لے کر ایک دن میں موتے اور تین گھنٹے میں گوہاری ختم کرنے کے نسخے تھے۔ میری ایک عزیزہ شب کور تھیں اور یاسین نے مجھے خواجہ کا پتہ دیا تھا۔ یاسین کراچی میں متوسط درجے کی لڑکیاں سپلائی کرتا تھا اور اس کا فلیٹ گاندھی گارڈن کے قریب تھا۔ اس کے گھر ایک مرتبہ ہم نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا وہ دراصل خواجہ کی رکھیل تھی اور اس کے سوا اور کسی کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔ اس لڑکی کا قد لمبا، رنگ سانولا اور ماتھا تنگ تھا۔ آنکھوں میں شرارت، گردن پر تل اور ایک نتھنے پر پھوڑے کا نشان تھا۔ اس نشان نے اس کی ناک میں مستقل طور پر ایک گرہ ڈال رکھا تھا اور جب وہ بات کرتی تھی تو یہ گوگر کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب ہم نے ذرا شوخ ہو کر اس سے بات کی تو وہ اٹھلا کر بولی۔ "میں خواجہ جی کو بلا دوں گی۔" پھر ہم نے یاسین سے خواجہ کے متعلق پوچھا اور یاسین نے بتایا کہ خواجہ ایک مقامی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے اور اس کے دو بیٹے کویت میں کام کرتے ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو شادی شدہ ہیں اور لیبیا میں اپنے خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ تیسری راولپنڈی میں لیکچرار ہے۔ خواجہ اکیلا کراچی میں رہتا ہے۔ دن بھر اکاؤنٹنسی کرتا ہے، رات عورت کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ دل کا بھی برا ہے اور نیت کا بھی۔ حاسد بھی ہے اور ظالم بھی۔ تنگ نظر ہے لیکن

خوب خرچ کرتا ہے۔ بدشکل ہے لیکن محبوب طبیعت ہے۔

ہم شب کوری کا نسخہ حاصل کرنے کے لیے یاسین کے ساتھ خواجہ کے فلیٹ گئے تو وہ ریشمی تہ بند باندھے چارپائی پر لیٹا تھا اور ایک عورت اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ خواجہ جلدی سے اُٹھا اور اس نے قریب پڑی ہوئی کرسی سے اپنا کُرتہ اُٹھایا۔ اسے پہنا پھر عورت سے کہنے لگا: "اب تو جا صغراں کل اسی وقت آجانا۔" صغراں کسی تکلف کے بغیر چارپائی سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ یاسین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ ہمارے یار ہیں اور بڑے دل والے آدمی ہیں کسی دفتر میں لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو خواجہ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنا زانو زور سے ہلانے لگا۔ خواجہ کا قد چھوٹا اور رنگ سانولا تھا۔ ماتھا تنگ اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ نہ ان میں نُور تھا نہ روشنی۔ کُھلی بھی بند دکھائی دیتی تھیں۔ چھوٹی سی ناک کے نیچے ٹوتھ برش ایسی مونچھیں تھیں جن پر چمکدار خضاب کی وارنش تھی۔ سر کے بال کالے اور سفید تھے اور بوتل صاف کرنے کے بُرش کی طرح کھڑے تھے۔ خواجہ جب ان پر ہاتھ پھیرتا تو آواز سی بھی آتی تھی۔ اس کے ایک کان میں چھید تھا اور دوسرا ذرا سا اندر کو مُڑا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا نشان تھا اور جبڑے کی ہڈی بہت ہی چھوٹی تھی۔ چہرے کی جلد ضرورت سے زیادہ کسی ہوئی تھی اور نتھنے کھنچے ہوئے تھے۔ بازو لمبے تھے اور ہاتھ چھوٹے اور اُنگلیوں کے پوٹے بندروں کی طرح آگے سے گول اور چمکدار تھے۔ گو وہ بڑے آرام سے چارپائی پر بیٹھا تھا لیکن اس کا سارا وجود ایک پھرکی کی طرح گھومتا ہوا لگتا تھا۔

یاسین نے کہا: "یہ آپ سے کوئی نسخہ لینے آئے ہیں۔"

"کیسا نسخہ؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"شب کوری کا۔" میں نے گلا صاف کر کے کہا۔

"کون بیمار ہے؟"

"میری بھانجی ہے۔"

"کس عمر کی ہے؟"

"اکیس بائیس برس کی!"

"اس کی شادی کر دو۔"

میں نے یاسین کی طرف اور یاسین نے میری طرف دیکھا اور کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

خواجہ کے اس چھوٹے سے جملے سے مجھ میں یلغار کی قوت پیدا ہو گئی اور میں نے منہ پکا کر کے کہا: "خواجہ جی کسی دن تازی کو ہمارے لیے بھی چھٹی دے دیں۔" وہ خاموش رہا۔ میں نے پھر کہا: "بس ایک دن کے لیے۔"

خواجہ نے چہرہ میری طرف پھیرا اور ہولے سے بولا: "جوان، وہ میری پابند ہے۔ اس کو چھٹی نہیں مل سکتی۔"

میں نے کہا: "ہم رقم خرچ کریں گے۔"

کہنے لگا: "پوچھ کے دیکھ لو جوان اگر وہ رقم کی شوقین ہے تو لے جاؤ۔"

یاسین نے کہا: "تو یہ ہے خواجہ جی۔ وہ آپ کی پابند ہے رقم کی نہیں۔"

میں نے کہا: "آپ میں کیا صفت ہے؟"

خواجہ بولا: "میں پھرکی ہوں۔ سارے پر گھوم جاتا ہوں جوان۔ کر لو گے؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں۔"

ہنس کر بولا: "تم نوجوانوں کو تو کان میں اُنگلی پھیرنا ٹھیک سے نہیں آتا تم کیا گھومو گے!"

میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا تو کہنے لگا : "بسے رضیہ سے ملاتا تھا یاسین منیرا سے ملاتا تھا۔"

"ان سب سے تو مل لیے خواجہ جی۔" یاسین نے آہستہ سے کہا۔

"اب تازی پر دل آگیا ہے۔" میں نے فقرہ مکمل کیا۔

خواجہ صاحب نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "دیکھ لو۔ اس کی مرضی ہے میں کچھ نہیں کہتا۔"

میں نے کہا: "اور شب کوری کا نسخہ؟"

اس نے کہا: "وہ میں نے تم کو بتلا دیا ہے۔ اس عمر میں اگر لڑکی کو رات کے وقت نظر نہ آئے تو آسان اور سستا علاج شادی ہے۔" پھر اس نے یاسین کی طرف دیکھے بغیر اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوچھا: "کتنے پیسے تھے تمہارے میرے ذمے؟"

"تیرہ خواجہ جی۔" یاسین بولا۔

خواجہ جی نے پانچ پانچ کے تین نوٹ نکال کر اس کو دیئے اور کہا "یہ سامنے رکھ لے جوان پھر کبھی حساب کریں گے۔"

چلتے وقت جب میں نے اپنا ہاتھ خواجہ جی کی طرف بڑھایا تو انہوں نے دیکھا نہیں پائتی پر نظریں جمائے اسی طرح بیٹھے رہے۔ خواجہ جی سوّر کی طرح گردن نہیں گھما سکتے تھے۔

اس کے بعد خواجہ جی سے ہماری یاری ہو گئی اور ہم ان کے یہاں روز آنے لگے۔ ان کے فلیٹ کے ایک کمرے پر تقریباً ہمارا قبضہ ہو گیا اور ہم نے یہاں راتیں بسر کرنا بھی شروع کر دیں۔ تازی کے ساتھ ہمارا اپنا پا ہو گیا اور وہ ہمیں بھی کہہ کر بلانے لگی۔ تازی کون تھی اور اس کے گھر والے کیا کرتے تھے اور اس کا جغرافیہ کیا تھا اس کی خبر نہ ہم کو تھی نہ خواجہ صاحب کو۔ وہ تین چار گھنٹے کے لیے ہر روز ان کے پاس آتی اور دونوں چارپائی پر لیٹ کر دیر دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔ پھر وہ اٹھ کر چائے بناتی ہمیں آواز دیتی۔ ہم تینوں چائے پیتے اور وہ برقعہ اوڑھ کر گھر چلی جاتی۔ میں نے اُسے بارہا خواجہ جی سے تحفے تحائف اور رقم وصول کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ لیتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا شوق تانے کی چادر اوپر ڈال کر خواجہ صاحب کے ساتھ لیٹنا تھا۔ یہ چادر گھر کی دھلی ہوئی ایک عام سی چادر تھی جو بڑے بڑے کی سردارنیاں اور جاگیردارنیاں لیا کرتی ہیں۔ اس پر نہ کوئی پھول کڑھے تھے نہ اس میں کوئی خوشبو تھی نہ اس کا رنگ ہی جاذب تھا لیکن اس کے نیچے لیٹنا اور اس کو اپنے بدن پر محسوس کرنا تازی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ یہ چادر خواجہ کو اس کے بیٹے نے اور کپڑوں کے ساتھ کویت سے بھیجی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے نیچے ابا جی کا ننگ وجود بھی شامیں گزارا کرے گا۔ پھر بھی اور تازی کی زندگی میں ایک مہینہ ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں کو خواجہ کے فلیٹ سے دیس نکالا مل گیا۔ خواجہ کا ایک رشتے کا پوتا اپنی بیوی کے علاج کی غرض سے کراچی آ رہا تھا اور اسے مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنے دادا کے پاس ٹھہرنا تھا۔ تازی پر جدائی کے یہ دن قیامت بن کر ٹوٹے اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں اسے اپنے ساتھ لپٹا کر تسلیاں دے رہا تھا۔ خواجہ کرسی پر بیٹھا نتھنوں میں پھونکیں مار رہا تھا اور تازی روئے جا رہی تھی۔ میں نے کسی روتی ہوئی عورت کا جسم بھی اس قدر مضبوط اور شاداب نہ دیکھا تھا۔ اس کے کندھے اور گات اور گردن جیسی فرگوسن کے بڑے ٹائر کی طرح سخت تھے لیکن ان میں لچک کا احساس موجود تھا۔

خواجہ صاحب کا پوتا مع اپنی بیوی کے آ گیا۔ اس کا جسم تندرست، قد اونچا، بال گھنگریالے اور ہاتھ مضبوط تھے۔ وہ عارف والے کی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا اور اس کے اڑنگے میں آئے ہوئے میانوالی کے جوان بھی اپنا آپ نہ چھڑوا سکتے تھے۔ اس کے ایک دانت پر سونے کا پترا چڑھا تھا اور اس کے ہونٹ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاہی مسجد کے مینار کو کسی نے تانبے کے برش سے رگڑ رگڑ کر دھو دیا ہو۔ اپنے دادے کی طرح وہ بھی شوقین مزاج نوجوان تھا اور دو ہی تین ملاقاتوں میں میرے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ ایک دن ہم دونوں خواجہ کی آنکھ بچا کر درمیانی عمر کی دو عورتوں کو سیر کرانے ہوا بندر لے گئے۔ ساحل ساحل چلتے وہ دونوں ہم سے بہت دور نکل گئے اور میں اور میری عورت ریت پر سیپیاں اور گھونگے چنتے رہے۔ اس عرصے میں کئی لہریں آئیں اور گزر گئیں۔ کئی جہاز دور سے نظر آئے اور پھر غائب ہو گئے۔ کئی گرد و سیر کے لیے آئے اور واپس چلے گئے۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئے۔ ان کے بالوں میں اور ان کے چہروں پر اور ان کی گردنوں پر خشک اور گیلی ریت چمٹی ہوئی تھی۔ حالانکہ کراچی میں کبڈی کھیلنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔

یہ نوجوان کوئی ڈیڑھ مہینہ خواجہ صاحب کے یہاں مقیم رہا اور اس عرصے میں خواجہ صاحب اپنی بہو کا خود ہی علاج کرتے رہے اور وہ صبح گاندھی گارڈن کے چڑیا گھر سے طلوع ہوئی جب اس نوجوان کی بیوی ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور اس نے غسل خانے میں جا کر قے کرنا شروع کر دی۔ اس کا بدن چھوٹے چھوٹے دھچکوں سے دہرا تہرا ہو رہا تھا اور وہ سنک کے دونوں کناروں کو پکڑ کر رو رہی تھی۔ ابکائیاں کر رہی تھی، کراہ رہی تھی، زور زور سے پاؤں زمین پر مار رہی تھی۔ نوجوان گھبرا کر اٹھا اور خواجہ جی کے کمرے میں جا کر بین کرنے لگا۔ "بابا جی اٹھو، رضیہ کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس کو قے آ رہی ہیں اور وہ مرنے لگی ہے۔ اسے کچھ دیں۔ اسے دیکھیں۔ اسے کیا کریں باباجی"؟

خواجہ صاحب نے لیٹے لیٹے اپنے خارپشت سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "جب وہ فارغ ہو جائے تو اُسے کہنا چائے کے لیے پانی رکھ دے میں آج کشمیری چائے بناؤں گا۔" نوجوان کا دل اس شفیق بوڑھے کی بات پر دو نیم ہو گیا اور اس نے غسل خانے میں جا کر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ پھر وہ دو دن اور خواجہ جی کے گھر رہے لیکن اس مدت میں نوجوان نے سنگدل بوڑھے

سے کلام تک کرنا گوارا نہ کیا۔

یہ ڈیڑھ مہینہ تازی پر بہت گراں گزرا۔ گو اس عرصے میں اس کی خواجہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن یہ ملاقاتیں ٹانسے کی چادر میں لپٹی ہوئی نہ ہوتی تھیں۔ یاسین کے فلیٹ میں پڑتل کے ایک پرانے پلنگ پر ہوتی تھیں جس کی نواڑ کے اندر بہت سے کھٹملوں کے گھر تھے۔

میں نے کسی من موہنی لڑکی کو ایسی اُجاڑ صورت اور اس طرح سے ویران حال کبھی نہیں دیکھا۔

وہ یاسین کے فلیٹ میں پہنچ کر گھنٹوں خواجہ جی کا انتظار کیا کرتی لیکن خواجہ جی کا کوئی پتہ نہ چلتا۔ پھر وہ زور زور سے رونے لگتی اور ہمارے پاس اُسے چُپ کرانے کے لیے کوئی جھنجھنا نہ ہوتا۔ وہ خاموش ہو جاتی تو اسے ہنسانے کے لیے ہمارے پاس وہ انگلیاں نہ ہوتیں جن کے پوٹے گول اور جلد چکیلی اور رسناک ہوتی۔ یاسین کے لیے وہ لڑکی مصیبت بن گئی تھی اور اس کو دیکھ کر اس کی دوسری لڑکیاں بھی متاثر ہونے لگی تھیں۔

جب خواجہ جی کا پوتا اور اس کی بہو کراچی سے گئے تو تازی کے سوکھے دھانوں پر پانی پھرا اور وہ پھر سے تروتازہ ہو گئی۔ پہلے ہی روز جب وہ خواجہ کے کمرے میں آئی تو اس کے پاس مختلف سائز کے کاغذوں کی تین پرچیاں تھیں جن پر اس نے اس ڈیڑھ مہینے کے دکھوں، طعنوں، ایلاپوں اور حسدوں کے نوٹس تیار کر رکھے تھے۔ وہ باری باری سے ہر ایک پر جواب مضمون لکھ سکتی تھی اور اسی نیت سے وہ یہ کاغذ لے کر خواجہ کے پاس آئی تھی۔ جب چارپائی پر لیٹے ہوئے خواجہ نے اُسے لیٹنے کے لیے کہا تو وہ سختی سے بولی "نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں کرسی پر۔ مہربانی۔"

خواجہ نے بڑی محبت اور ملائمت سے کہا "لیکن میری جان میرا کوئی قصور، کوئی خطا؟ ایسی ناراضی؟"

تازی نے پرچی نکال کر کہا "جس دن تمہارے مہمان آتے ہیں اس شام تم نے یاسین سے کہا تھا کہ میں کل سویرے آؤں گا تازی کو بتا دینا۔ میں آئی لیکن تم نہیں آئے۔ میں تمہارے باپ کی نوکر یا تمہارے خاندان کی غلام تھوڑی تھی کہ دن بھر تمہارا انتظار کرتی رہتی؟"

خواجہ نے اس کا فقرہ آدھا سن کر کروٹ بدلی اور منہ دیوار کی طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں جب اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں تو اس کے کان خود بخود ساتھ ہی بند ہو جاتے تھے۔ تازی نے غصے میں

پرچی کی گولی بنا کر کونے میں دے ماری۔ دونوں پاؤں ایک ساتھ اوپر اٹھا کر فرش پر دے مارے اور کرسی کو لات مار کر کھڑاک سے زمین پر گرا دیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور وہاں سے فلائنگ کک مارتی ہوئی خواجہ کے ساتھ چارپائی پر وہاں آ گری جہاں کروٹ بدلنے سے جگہ خالی ہو گئی تھی۔ تازی نے اپنے دانت پوری قوت سے خواجہ کے بازو میں گڑو دیئے خواجہ چیخ مار کر شٹل کی طرح گھوما اور پھرکی کی طرح گھومتا چلا گیا۔

اگلے چھ مہینے کے واقعات بڑے سازگار، خوشگوار اور یادگار قسم کے تھے۔ ان کی تفصیلات بہت لمبی اور ان کی جزئیات زرہ بکتر کی کڑیوں کی طرح ذہن کے وجود سے چمٹی ہوئی ہیں۔ انہیں الگ الگ کر کے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اس عرصے میں ہم تینوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے اور ہماری دوستی کے درمیان سے ہوا بھی اچھی طرح سے نہ گزر سکتی تھی۔ ایک اتوار ہم تینوں خواجہ کے فلیٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے کہ خواجہ نے تازی کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا "چن کھنو اپنا ہمزاد دیکھو گے؟"

تازی کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا۔ "کون ہے کدھر ہے کہاں ہے؟" اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کون آیا ہے؟"

خواجہ نے ہنس کر کہا "ہمزاد بے وقوفے! تیری سوکن نہیں۔ اصل ہمزاد جو حت ابو کیا جاتا ہے۔"

یہ بات کچھ اس کی سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی سر ہلا کر کہا "خواجہ جی ٹھیک سے میں بھی نہیں سمجھا۔" خواجہ نے تازی کی ران پر پٹاخ سے ہاتھ مار کر کہا "چلو اٹھو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" تازی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"او ہو آؤ تو سہی، ڈرتی کیوں ہو۔" خواجہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے تازی کی کلائی پکڑ کر اسے بھی اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ خواجہ نے الماری کھول کر اندر سے اپنی پھندنے والی رومی ٹوپی نکالی اور اسے سر پر رکھ کر بصرے کی نوکری جانے والے کی طرح بتیسی نکالنے لگا۔

ہم دونوں خاموشی سے اس کا منہ تک رہے تھے۔ پھر وہ پلٹا اور غسل خانے میں جا کر وضو کرنے لگا۔

نچڑتی ہوئی کنپٹیوں اور ٹپکتی ہوئی ٹھوڑی کے ساتھ وہ غسل خانے سے برآمد ہوا اور ہم دونوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اور ہم بھی قدم قدم اس کے پیچھے زینہ چڑھنے لگے۔ چوتھی منزل ختم ہونے پر اوپر کی چھت آ گئی۔ دھوپ چمک رہی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا۔ پانی کی ٹنکی کے لمبے چبوترے کا سایہ فرش پر پڑ رہا تھا۔ یہ سایہ کوئی دس بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کے بعد دھوپ ہی دھوپ تھی۔ خواجہ نے کچھ کہے بغیر مجھے کندھوں سے پکڑا اور چھاؤں میں اس طرح سے کھڑا کر دیا کہ میری گردن کا سایہ دھوپ اور سائے کی حد پر پڑتا تھا۔ میرا سارا وجود سائے میں تھا صرف سر اور گردن کی چھاؤں چھت کے فرش پر نظر آ رہی تھی۔

پھر اس نے میرے سر کو اس طرح سے جھکایا کہ میری نگاہیں اپنے پاؤں پر جم گئیں۔ اپنا دایاں ہاتھ میرے بائیں کندھے پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا اور پانچ دس منٹ تک اسی طرح پڑھتا رہا۔ پھر اس نے میری ٹھوڑی کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر میرا سر اوپر اٹھایا اور میں نے چمکتی دھوپ میں اپنے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ وہاں میں کھڑا تھا۔ وہی کپڑے وہی کھڑے ہونے کا انداز وہی چہرہ ویسے ہی بال۔ میں وہاں کھڑا مسکرا رہا تھا اور میں یہاں کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے مرعوب ہو کر اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کرنے کی کوشش کی اور میں وہاں کھڑا ہوا اور شدت سے اور شرارت سے مسکرانے لگا۔ پھر میں نے اسے دائیں بائیں جھولتے دیکھا جیسے وہ گنگنا رہا ہو اور میں نے یہاں یہ محسوس کیا جیسے میں کانپ رہا ہوں اور رونے لگا ہوں۔ خواجہ نے میرا سر اپنے ہاتھ سے پھر نیچے دبا دیا اور کچھ پڑھ کر تین مرتبہ تالی بجائی۔ پھر اس نے میری کمر تھپتھپائی جیسے کہہ رہا ہو "بس اب جاؤ"۔

میں نے سر اٹھا کر ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا۔ اب میں وہاں نہیں تھا۔ پھر خواجہ نے آگے بڑھ کر تازی کا بازو پکڑا اور اسے سائے کی طرف کھینچا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور خواجہ کا ہاتھ زور سے جھٹک کر "میں نہیں، میں نہیں" کہتی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ شاید وہ میرا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی تھی اور اسے خواجہ سے خوف آنے لگا تھا۔ خواجہ ایک قہقہہ مار کر ہنسا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔

خواجہ نے جادو ٹونا اور کالا علم ناگا قبیلوں سے سیکھا تھا جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر آسام گیا تھا۔ وہاں ایک ناگا عورت سے اس کی آشنائی ہو گئی تھی اور وہ اس کے بڑے بیٹے کا دوست

بن گیا تھا جو عمر میں خواجہ سے تین سال بڑا تھا۔ خواجہ بتاتا ہے کہ منگاچو بڑے قد کاٹھ کی گرانڈیل عورت تھی اور اس کی بائیں ران پر آدمی کی شکل کا ایک بڑا سا مسا تھا۔ اس کا خاوند ہاتھی پکڑنے کا کام کرتا رہا تھا اور ہاتھیوں کی بولی بڑی آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ منگاچو کہتی تھی کہ اس کے خاوند کے جوان اور جنگلی ہتھنیوں سے تعلقات تھے اور وہ اس کو دیکھ کر دور سے سونڈیں ہلانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کے لڑکے کو اپنی ماں کی یہ بات بڑی ناگوار گزرتی تھی لیکن خواجہ اس سے بڑا لطف لیا کرتا کیونکہ ایسے قصے بیان کرتے ہوئے منگاچو غصے سے اور حسد سے سبز ہو جایا کرتی اور اس کی آنکھیں ٹیڑھی ہو کر اوپر کو چڑھ جاتی تھیں۔ وہ جوان ہتھنیوں کے لیے حرامزادیاں، کٹنیاں، چڑیل بھریال کے الفاظ استعمال کیا کرتی اور ان کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت اور دکھ کے آنسو آ جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے خاوند کو یاد کر کے کبھی نہ روتی تھی۔ اس کی بے وفائی اور بے اعتنائی اور ایکسٹرا میریٹل ریلیشنز کو یاد کر کے گھنٹوں آنسو بہایا کرتی تھی۔ یہ آدمی اس نے بڑی محنت اور بڑی قربانیوں کے بعد جیتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا دل ایک بھیرن سے توڑ کر اپنی طرف کیا تھا۔ آٹھ سال تو اچھی طرح سے گزرے اور اس عرصے میں ان کے تین اولادیں بھی ہوئیں اور وہ ہل کر کھیلا کرتے اور ہاتھی پکڑتے رہے لیکن ایک چاندرات کو جب وہ تازہ پکڑی ہوئی ہتھنی کی وحشت کا خاتمہ کرنے کے لیے گڑھے میں اترا تو جوان ہتھنی نے اس کے بدن پر اپنی مست جھرجھری شروع کر دی اور خود لذت سے کانپنے لگی۔ منگاچو کنارے پر کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنے خاوند کو ہتھنی کے سامنے عاجزی اور لذت سے سر جھکاتے عجیب و غریب آوازیں نکالتے سنتی رہی پھر منگاچو سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر ہتھنی کے سر پر دے مارا۔ ہتھنی نے درد سے تو کم لیکن اپنی خلوت میں کسی کے مخل ہونے سے بلبلا کر ایک چیخ ماری اور منگاچو کے خاوند کو سونڈ میں لپیٹ کر اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ سوتن کا یہ رویہ دیکھ کر منگاچو وہاں سے روتی بین کرتی اپنے بال کھسوٹتی قبیلے کی طرف بھاگ گئی اور پھر ان میاں بیوی کے درمیان غیریت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

خواجہ کہتا ہے کہ منگاچو بتایا کرتی تھی کہ جس رات اس کا خاوند اور ایک نوجوان ہتھنی گھنے جنگل میں ایک دوسرے سے مساس کر رہے تھے ایک بوڑھا ہاتھی دبے پاؤں ادھر آ نکلا۔ اس نے مبلد کے باپ کو پھول کی طرح اپنی سونڈ میں اٹھایا اور اپنے بدن کے دھکے سے ہتھنی کو

زمین پر گرا دیا۔ حبشی ببیلا کر گئی اور اپنی سونڈ بڑھا کر منگا چو کے خاوند کو بڈھے ہاتھی سے چھڑانا چاہا۔ لیکن اُس وقت تک بدنصیب انسان مضبوط سونڈ کے تنگ ہوتے ہوئے حلقے میں چپک کر دم توڑ چکا تھا اور اس کی ساری پسلیاں چورا ہو گئی تھیں۔ نوجوان حبشی نے ہاتھی کے کان کے گرد اپنی سونڈ ڈال کر اُسے زور سے کھینچا اور بڈھے ہاتھی کا سارا کندھا خون سے لت پت ہو گیا۔ پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ جب قبیلے کے لوگوں نے منگا چو کے خاوند کی تلاش شروع کی تو گھنے جنگل میں موٹی دلدل والی جھیل کے پاس حبشی مری پڑی تھی۔ اور اس کے بدن پر چرے ہوئے فیل شکاری کے بڑے بڑے لوتھڑے چپٹے ہوئے تھے۔ اونچے درختوں پر گِدھوں کے قافلے اُتر آئے تھے اور دلدل والی جھیل کے درمیان ایک بڈھے ہاتھی کا جہاز ایسا جسم غرق ہو رہا تھا۔ بلبلے اُٹھ رہے تھے اور پتلے گارے کی تہیں بھنور بنا رہی تھیں قبیلے کے سیانے نے سارے حالات کا جغرافیائی مطالعہ کرنے کے بعد منگا چو کو یہ کہانی سُنائی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بوڑھے ہاتھی نے فتح پانے کے بعد خودکشی کیوں کر لی تھی!

جس دن ببیلا کا باپ مرا اُسی دن آدھی رات کے وقت منگا چو کی بائیں ران پر زور کی کھجلی اُٹھی اور وہ رات بھر خارش کی شدت سے چیختی اور کلبلاتی رہی۔ صبح جب اُس نے اپنی ران کھول کر دیکھی تو اس پر ایک بڑا سا سیاہ مسّا تھا جس کی صورت آدمی کے چہرے سے ملتی تھی اور یہ چہرہ ببیلا کے باپ کی شکل سے ملتا تھا۔ خواجہ بتایا کرتا تھا کہ جب میں اس چہرے پر ہاتھ پھیرتا تو منگا چو بہت خوش ہوتی اور اس کی آواز میں فاختہ کی کوکو سی پیدا ہو جاتی۔

ساڑھے تین سال خواجہ طلرنی کا لمبی گزارا رہا اور یہ ساری مدت اس نے منگا چو کے جھونپڑے میں اس کے بڑے بیٹے ببیلا کے ساتھ گزار دی۔ اچھا کھانا، اچھی شراب پینا اور رات کو منگا چو کے ساتھ لپٹ کر سو جانا۔ منگا چو قبیلے کی دوسری عورتوں کی طرح کوئی کام نہ کرتی تھی۔ اس کا پیشہ کالا علم تھا اور وہ جادو ٹونے ٹوٹکے کے لیے دُور دُور تک مشہور تھی۔ اس پیشے سے اس کو اتنی آمدنی ہو جاتی کہ وہ تینوں دن عیدوں اور راتیں شبراتوں کی طرح گزارتے اور ہر وقت نشے میں جھومتے رہتے۔

اس اثنا میں جنگ بند ہو گئی اور ایک جرمن جوڑا کسی جغرافیائی مہم کے سلسلے میں یہاں خیمہ زن ہوا۔ لڑکی دن بھر ٹائپ کیا کرتی اور اس کا ساتھی ایک چھوٹی سی گینتی اور کھاڑی لے کر جگہ جگہ سے زمین کھود کر دیکھا کرتا۔ گہرے پیلے رنگ کے خیمے کو سُرخ گوٹ لگی تھی اور بھورے

رنگ کے جمپر اور ورسٹیڈ کے سکرٹ میں سنہرے بالوں اور گلابی بدن والی لڑکی بند تھی۔ اس کے بازو کھلے تھے اور پنڈلیوں تک چمڑے کے بڑے بڑے بوٹ تھے۔ حبشی انگریزی اس کو آتی تھی خواجہ سے بہت زیادہ جانتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا کرتے اور خواجہ گھما پھرا کر ہر بات اپنے اور منگا چو کے تعلقات کی تفصیل پر لے آیا کرتا۔ وہ پنچ ڈائری نکال کر اس میں نوٹس لیا کرتی اور اس کا ساتھی گینتی اور کھاڑی کے شوق میں بہت دُور نکل گیا ہوتا۔ پھر وہ تینوں سٹو لیمپ جلا کر کالی کافی بناتے اور بغیر شکر کے پیتے۔ خواجہ نے چونکہ کالا علم نیا نیا سیکھا تھا اس لیے اس نے اپنا پہلا آزمائشی وار اس جرمن لڑکی پر کیا اور ایک ہفتے میں کامیاب ہو گیا۔ خواجہ کے اصرار پر جب منگا چو پہلی بار اس کے خیمے میں گئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ خواجہ ترجمان کے فرائض سرانجام دیتا رہا لیکن دونوں ایک دوسری کی نگاہوں کو تکتی رہیں۔ ایک دوسری کی بدن بولی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ شام کو جب خواجہ جھونپڑے میں آیا تو منگا چو نے کھکھری نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا: "مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے لیکن اس مجبوری بندریا سے ذبح نہ کروا۔"

خواجہ نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا کر کہا: "کیسی باتیں کرتی ہے من موہنی! کہاں وہ کہاں تُو! تیرے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟"

منگا چو نے کہا: "جب وہ ہم سے باتیں کر رہی تھی تو اس کی نگاہیں صرف تیری طرف تھیں اور صرف تجھی کو دیکھتی تھی۔"

"وہ اس لیے،" خواجہ نے جواب دیا، "کہ صرف میں اس کی بولی سمجھتا تھا اور جو بات سمجھتا ہو ہمیشہ نگاہیں اسی کی طرف کر کے بات کی جاتی ہے۔"

منگا چو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور زور زور سے رونے لگی۔ خواجہ اسے چُپ کرانے میں مصروف ہو گیا اور اُسے چُپ کراتے کراتے جرمن لڑکی کے خیالوں میں ڈوب گیا۔

پھر ایک شام ایسی آئی کہ جرمن لڑکی کا ساتھی دیر تک جنگل سے نہ لوٹا۔ خواجہ اور وہ لڑکی اُسے دیر تک تلاش کرتے رہے اور بہت دُور نکل گئے۔ لڑکی نے درختوں کے جھنڈ میں ایک بڑے سے گڑھے کو دیکھا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام کر کہا: "اتنے نیچے

اُتر کر دیکھتے ہیں شاید اس گڑھے کے کسی کونے میں کھُدائی کر رہا ہو۔" لڑکی جھجکی تو خواجہ اس کا بازو تھام کر نیچے پھسل گیا۔ وہ لڑکھنیاں کھاتے ہری سبز گھاس اور جنگلی ساگ پر پھسلتے کھڈے کے پاتال تک پہنچ گئے۔ لڑکی کے ننگے پاؤں اور گھٹنوں پر بہت سی خراشیں آگئی تھیں۔ خواجہ نے انہیں اپنی قمیص کے دامن سے صاف کیا اور اس کے کندھے پر اپنا گال رگڑنے لگا۔ جرمن لڑکی خوف اور لذت سے کانپنے لگی اور اس کے نرم ہونٹوں کے اندر اس کے پیر پیچھے کو مڑنے لگے۔ خواجہ نے اُسے اپنی گود میں ڈال لیا اور اس کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ جنگلی ساگ پر آرام سے لیٹی ہوئی جرمن لڑکی نے جب آنکھیں کھولیں اور اوپر دیکھا۔ تو گڑھے کے کنارے منگا جو کھڑی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے میں ایک بڑا سا پتھر لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور جرمن لڑکی کے سر کے پاس آکر زمین میں دھنس گیا۔ لڑکی نے زور سے چیخ ماری تو خواجہ بھی اچھلا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ منگا جو روتی پیٹتی بین کرتی اپنے بال کھسوٹتی قبیلے کی طرف جا رہی تھی۔

جب خواجہ جرمن لڑکی کو اس کے خیمے میں چھوڑ کر جھونپڑے پر پہنچا تو موٹے ٹھٹوں والا چھاپی منڈھا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بڑی آوازیں دیں، بہت دروازہ بجایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے کلہاڑی لے کر دروازہ کاٹنا شروع کر دیا جب چھاپی کی تہیں کٹ کر نیچے گریں اور جھونپڑے کے اندر ذرا سی روشنی داخل ہوئی۔ تو خواجہ نے دیکھا۔ گیلے فرش پر خون کا ایک تالاب ہے اور اس کے کنارے گو انڈیل منگا جو لیٹی ہے اور کلہاڑی اس کے بائیں پستان کے نیچے پسلیوں میں گڑی ہوئی ہے۔

جرمن سیاحوں کے ساتھ دنگے پر خواجہ کلکتہ میں ملٹری پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور جھگڑا ہونے کی سزا میں انبالے چھاؤنی بھیج دیا گیا۔ لیکن جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں وہ تو خواجہ اور تازی کے زمانے کی بات ہے۔ اُس وقت ان دونوں کے بدن بولتے تھے اور ان کو زبان سے ایک دوسرے کی بولی سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر خواجہ اس دنیا میں نہ رہے یا کراچی سے چلا جائے تو تازی اس کی جُدائی کس طرح سے سہار سکے گی اور زندہ رہنے کے لیے کس چیز کا سہارا لے گی۔ ایک دن میں نے حوصلہ کر کے تازی سے یہ بات پوچھ بھی لی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اور وہ سر جھکا کر بولی۔ "میرے پاس نیلے تھوتھے

کی ایک بڑی سی ڈلی ہے۔" میں سمجھتا ہوں اس علاقے میں خواجہ سے زیادہ خوش قسمت اور کوئی آدمی نہیں گزرا۔ کم از کم میری زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں آیا جس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی نے اس طرح سے محبت کی ہو۔

پھر ایک دن تازی اپنے وعدے کے خلاف بہت لیٹ پہنچی اور خواجہ جسے میں نے اپنی زندگی میں کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا بہت بے چین نظر آیا۔ وہ پُرسکون صاحب عزم و ہمت استقلال کا مجسمہ کبھی چارپائی پر لیٹتا کبھی اٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی کھڑکی سے سر نکال کر سڑک پر دیکھنے لگتا۔ کبھی گھڑے سے پانی پیتا۔ کبھی سگریٹ سلگاتا اور پھر آکر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تازی آئی اور اپنے برقعے کے بند کھولتے ہوئے مسکرانے لگی۔ اس نے ایک آنکھ میچ کر خواجہ کی طرف دیکھا اور نعرہ مار کر کہا۔ "سو رہے ہو بجھو؟" خواجہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ "بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ خواجہ کے پہلو میں دراز ہوگئی اور اسے گدگدی کر کے کہنے لگی۔ "دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں" خواجہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ تھا اور اس لفافے میں خواجہ کے لیے قمیص کا بادامی کپڑا تھا۔ "پسند ہے؟" اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

"کس کے لیے ہے؟" خواجہ نے لاتعلقی سے کہا۔

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا؟" تازی نے جل کر کہا "قمیص کا کپڑا ہے مجھے پسند آگیا میں نے لے لیا۔"

"یہ تو کم ہے۔" خواجہ نے معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے تو اب چودہ گز لٹھا چاہیے۔"

"چودہ گز لٹھا! اکیلے؟" تازی نے بڑا مان کر کہا۔

"ہاں۔" خواجہ بولا۔

"پھر تو ہمیں اٹھائیس گز لینا پڑے گا۔ مجھے بغیر کفن کے دفن کرو گے؟"

خواجہ نے کہا۔ "بس رہنے دے۔"

پھر ان کے درمیان کچھ اچھی باتیں نہ ہوئیں۔ دونوں طرف سے جلے کٹے سے جملے ابھرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے رہے۔ اس تناؤ میں خواجہ جنسی کی ڈوری کو ڈھیل دیتا

رہا اور وہ بھنسی ہوئی روح کی طرح تڑپتی اور تنتی رہی۔ پھر وہ قمیص کا لفافہ وہیں پھینک کر بڑبڑاتی ہوئی فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

شام کو میں اور خواجہ فلم دیکھنے گئے۔ اس نے میرے ساتھ کئی باتیں کیں۔ مختلف قسم کی عورتوں کو رام کرنے کے طریقے بتائے۔ لیکن اپنی ہی باتوں میں وہ خود موجود نہیں تھا۔ ریکارڈ کی طرح بول رہا تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں گو پردے پر مرکوز تھیں لیکن اس کے ذہن کے اندر کوئی اور پروجیکٹر چل رہا تھا۔

ایک شام کھوکھے پر چائے پیتے ہوئے خواجہ نے مجھے بتایا کہ تازی کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ میرے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے میری پیالی زمین سے اٹھا کر لڑکے کو آواز دی اور پھر کہنے لگا۔ "جب عورت تم سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے بجائے کندھوں پر سے یا پہلو کی طرف سے نظریں گزار کر بات کرنے لگے تو سمجھ لو وہ سٹیشن بدلنے لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑو یار خواجہ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تازی اور اس کو کسی سے عشق ہو جائے۔ تمہارے ہوتے ہوئے!"

خواجہ نے کہا۔ "ہر انسان کے اندر ایک میٹر ہوتا ہے۔ کیا مرد کیا عورت سبھی میٹر پڑھ کر بتا سکتے ہیں کہ محبوب کا رُخ کس طرف ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ میٹر کالے علم کا ہوگا۔ ہر ایک کے پاس تو نہیں ہوتا۔"

وہ میری بات سُن کر جھنّا گیا اور جل کر بولا۔ "اُلو کے پٹھے اس میں کالے علم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ میٹر ہر شخص کو فٹ کیا کرایا ملتا ہے۔ جھک کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود ہی سگنل دیتا ہے۔ خود ہی فریکوئنسی سیٹ کر دیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خواجہ یہ سب تیرے وہم ہیں۔ اب تُو واقعی بُڈھا ہوتا جا رہا ہے۔"

اس نے لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

میں نے خفیہ طریق پر یہ بات تازی کو بتا دی۔ پہلے اس کا چہرہ غصے سے لال ہوا پھر ایک دم پیلا ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "سچ بتا بھئی اس کو کیسے معلوم ہوا؟"

یہ فقرہ سُن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میرے سامنے کھڑی ہوئی تازی ایک دم معدوم ہو گئی۔ پھر آ موجود ہوئی۔ پھر دُھواں سا بن کر رفو ہو گئی۔ پھر پتلی مجسمے کی طرح سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ایک دم زرد ہو کر نقطہ سا بن گئی۔ اچانک زوم اِن ہو کر میری ناک سے آ لگی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک مسام چھوٹے چھوٹے چوہوں کی طرح پانی سے بھر گیا۔ میں نے کہا۔ "تم نے کیا کہا تازی؟"

تازی نے کہا۔ "وہ بندر روڈ پر کتابوں کی ایک دُکان میں اکاؤنٹنٹ ہے اور ایف اے پاس ہے۔"

"کون؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"میں اس سے شادی کرانا چاہتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن خواجہ؟" مجھے اس سے آگے کوئی اور لفظ نہ سوجھا۔

وہ رونے لگی اور میرے ساتھ چمٹ کر بولی۔ "میں خواجہ سے پیار کرتی ہوں۔ اس کو اپنی جان سمجھتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے ماں باپ یہ شادی طے کر رہے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور زور زور سے رونے لگی۔

روتی ہوئی عورت سے بات کرنا، اس کی بات سمجھنا، اس کے لفظوں کو پہچاننا اور اس کی سوچ تک پہنچنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں زور زور سے اس کو جھنجھوڑنے لگا۔ جوں جوں میں اس کو ہلاتا تھا وہ اور زور زور سے رونے لگتی تھی۔ پھر میں تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔

میں نے وہ لڑکا نہیں دیکھا اور نہ اس سے کبھی ملا لیکن تازی کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک شام جب وہ خواجہ سے مل کر واپس آ رہی تھی اور راستے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی، تو رکشا تلاش کرنے میں اس لڑکے نے تازی کی مدد کی تھی۔ جب وہ رکشا میں بیٹھ چکی تھی تو اس لڑکے نے رکشا ڈرائیور کو "ذرا ٹھہرو" کہہ کر روکا تھا اور تازی کے کیچڑ میں لپٹے ہوئے پلّو کو زمین سے اٹھا کر نچوڑا تھا اور پھر اس کو تازی کے پاؤں کے پاس رکھ کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

"خواجہ میری زندگی کی پہلی محبت ہے۔ میرا پہلوٹی کا عشق ہے۔" تازی رونے لگی۔ "لیکن الطاف ہمدرد ہے۔ دل رکھنے والا ہے۔ خاموش ہے۔"

"اور جوان ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا ہم عمر ہے۔"

اس نے میرے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مارا اور چیخ کر بولی۔ "تم ہر ایک کو اپنے جیسا مرد ہی

سمجھتے ہو کہ انسان کے بجائے صرف جوانی سے محبت کرتا ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور یہ خاموشی بڑا طول کھینچ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میری کلائیاں پکڑ لیں اور سسکار کر بولی۔ "بتاؤ بھی میں اب کیا کروں؟ کس دیوار سے سر ماروں اور کہاں جا کر مروں۔"

میں نے کہا: "اس میں مرنے کی کیا بات ہے۔ خواجہ کو چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ کوئی تم نے ٹھیکہ تو نہیں کیا۔"

"لیکن وہ مر جائے گا" اس نے غمزدہ ہو کر کہا۔ "وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے گا۔"

"کچھ نہیں ہوتا" میں نے یقین کے ساتھ کہا۔ "وہ کھیلا کھایا آدمی ہے۔ کوئی ایک تیرے ساتھ ہی تو وابستہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں اس کے بہت سے یارانے ہیں اور بڑی عورتوں سے اس کا تعلق ہے، لیکن اس کی وابستگی صرف میرے ساتھ ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میرے وجود نے۔"

"تمہارے وجود کے اندر کوئی میٹر لگا ہے؟"

"ہاں لگا ہے۔"

"پھر؟"

"بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا کوئی حل نہ مل سکے گا۔"

"تم آہستہ آہستہ خواجہ کو چھوڑ دو۔"

"میں آہستہ آہستہ ہی اس کو چھوڑ رہی ہوں۔"

"اور اس بات کا تمہیں رنج ہے؟"

"اب تو نہیں لیکن بعد میں شاید ضرور ہو گا۔"

"بعد سے کیا مطلب؟"

"بعد سے میری مراد وقت گزر جانے سے ہے۔"

"کیسا وقت؟"

وہ پھر خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

خواجہ کے فلیٹ میں میں اندر چائے بنا رہا تھا۔ تازی اپنی مخصوص چارپائی پر لیٹی تھی اور اس نے اپنے کھڑے زانو پر دوسری ٹانگ کی پنڈلی جما رکھی تھی۔ تکیہ پیٹ پر رکھا تھا اور پیچھے پر دونوں ہاتھوں کی کنگھی ڈال ہوئی تھی۔ خواجہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور پیر ایک دوسرے سے جوڑ رکھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا: "اس سے کچھ نہیں ملے گا تازی کچھ بھی نہ مل سکے گا۔"

"مجھے اس سے سب کچھ ملے گا۔ وہ ہمدرد ہے، رحم دل ہے، مددگار ہے، مہربان ہے۔"

"یہ سب صفتیں تو خدا میں موجود ہیں تازی" خواجہ نے کہا۔ "اس سے کسی کو کیا ملتا ہے؟"

"وہ تم جیسا نہیں" تازی نے چمک کر کہا۔ "وہ انسان ہے۔"

"میں اس جیسا بننے کی کوشش کروں گا" خواجہ نے رو کر کہا۔

"اب وقت گزر گیا خواجہ" تازی نے ہولے سے کہا۔ "تم اس جیسے کیسے بن سکو گے؟"

"میں بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ تم مجھے ایک چانس تو دو۔"

"میں نے تم کو بڑے چانس دیئے لیکن تم وہی رہے جو پہلے تھے۔"

"ایک چانس۔ آخری چانس۔ آخری موقع۔"

"اب بہت مشکل ہے۔"

"حرامزادی کتی۔ بے وفا" خواجہ غصے سے کرسی سے اٹھا اور اس نے اپنی ہوائی چپل اٹھا کر تازی کے گال کی طرف تانی۔ پھر وہ دیوانہ وار اس کے کھڑے پاؤں کو چومنے لگا اور زور زور سے رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی اوٹ میں سے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح تازی کا پاؤں چوم رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ہوائی چپل تھی۔ تازی ہنس رہی تھی اور ہنسنے سے اس کا سارا بدن ہل رہا تھا اور وہ زور زور سے کہہ رہی تھی: "خدا کے لیے خواجہ اللہ کے واسطے۔ ٹھہرو مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔ میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ ایک منٹ میری بات تو سنو۔ میرے تلووں سے تمہاری ٹھوڑی لگ رہی ہے۔ مجھے

بڑی ہنسی آ رہی ہے۔ خدا کے لیے اللہ رسولؐ کے لیے۔" پھر اس کی ہنسی بند ہو گئی اور کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

میں چائے کا ٹرے لے کر ان کے کمرے میں گیا لیکن دروازے سے ہی پلٹ آیا۔ وہ اس حالت میں تھے کہ ابھی چائے نہ پی سکتے تھے۔

۱۰ مئی کو تازی کی شادی تھی۔ خواجہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے محلے میں گیا اور ہم بڑی دیر تک اس کے گھر سے دُور اس شادی کا نظارہ کرتے رہے۔ باہر رنگ برنگ بچے نیلے پیلے کپڑے پہنے کھیل رہے تھے۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ مرد کرسیاں اور مونڈھے ڈال کر گلی میں بیٹھے تھے۔ ایک طرف دو دیگیں پک رہی تھیں۔ اکا دکا مہمانوں کے رکشے آ آ کر رک رہے تھے۔ جب بارات آئی تو خواجہ نے کہا: "آؤ چلیں۔"

میں نے کہا: "ابھی دو گھڑی اور ٹھہرو۔ یہ آخری نظارہ بھی دیکھ لیں۔"

اس نے مجھے ماں کی گالی دے کر کہا: "اب چل۔ کافی نظارے دیکھ لیے۔ جا کر کھانا بھی کھانا ہے۔"

ہم نے ایک ٹیکسی لی اور کیفے جارج کھانا کھانے چلے گئے۔ موسم کے آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔

پھر دن آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ خواجہ اپنے تجربے کے بل پر اور کالے علم کے زور پر مجھ سے کہا کرتا: "تم دیکھ لینا، تازی آئے گی اور ضرور آئے گی۔ وہ مجھے بھلا دے تو بھلا دے لیکن اس ٹاٹ کی چادر کو نہ بھلا سکے گی جس کے نیچے ہم دونوں لیٹا کرتے تھے۔"

علم کا سہارا بھی بڑا کمزور سہارا ہے۔ ایک تیراک اپنے علم اور تجربے کے زور پر بپھرے ہوئے دریا اور بجرے کراں پار کر جاتا ہے اور اسی علم اور تجربے کی بنا پر جھیل کے بند پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ کبھی کھل جا سم سم کہنے سے بند دروازے کھلنے لگتے ہیں اور کبھی اسی ورد کے وظیفے سے دروازوں کے آگے پتھر گرنے لگتے ہیں اور سنگین دیواریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

پورے سولہ دن بعد تازی خواجہ کے فلیٹ میں آئی۔ اس نے قرمزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور دوپٹے کو پیچھے گوٹے کا دو دو انگل چوڑا حاشیہ لگا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی، بے رونقی

اور اُداسی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنا پرس چارپائی پر لیٹے ہوئے خواجہ کے سرہانے رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور سینڈلوں والے پاؤں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ خواجہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکالا اور آرام سے سُلگا کر بولا: "کیسی ہو تازی؟"

"اچھی ہوں۔"

"اچھی کہ بہت اچھی؟"

"بس ٹھیک ہے۔"

"کیسا ہے تمہارا خاوند؟"

"ٹھیک ہے۔"

"خوب فٹ فٹوس رہے اتنے دن؟"

"ہاں جی۔"

"بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"شکریہ۔"

"میکے کے ہیں یا سسرال کے؟"

"سسرال کے۔"

"میرا تو خیال تھا تم جلد آؤ گی۔"

"میرا بھی یہی ارادہ تھا، لیکن الطاف نے دکان سے چھٹی لے رکھی تھی۔"

"الطاف نام بہت اچھا ہے۔"

"ہاں جی۔"

"کتنی عمر ہو گی اس کی؟"

"مجھ سے چھ سال بڑا ہے۔"

"پھر تو بڑا جوان ہو گا۔"

"ہاں جی۔"

"آؤ" خواجہ نے ایک طرف ہو کر کہا "لیٹ جاؤ۔"

"نہیں جی شکریہ۔"

"تم تھک گئی ہوگی۔"

"نہیں جی کوئی ایسی خاص تھکی بھی نہیں۔"

"پھر بھی لیٹ تو جاؤ۔"

"اب میں چلتی ہوں جی۔" اس نے آگے بڑھ کر اپنا پرس اُٹھا لیا۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور لگانے لگی تو خواجہ نے ایک ہی جھٹکے سے اس کو چارپائی پر گرا لیا۔ تازی رونے لگی۔ کچھ اس کو اپنے بہلول کے عشق کی موت کا غم تھا۔ کچھ اپنے مستقبل کا خوف، کچھ پُرانی یادوں کا دُکھ، کچھ نئی زندگی میں داخل ہونے کا قلق، کچھ الطاف سے دُوری کا رنج۔ بڑے بڑے موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر تیزی سے پھسلنے لگے۔ خواجہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے پرے دھکیل دیا۔ پھر ان دونوں کے درمیان چھینا جھپٹی اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ وہ رو رہی تھی، کراہ رہی تھی اور اپنے بڑے ناخن خواجہ کی کلائیوں میں گاڑ رہی تھی۔ خواجہ ہانپ رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور غصے میں بول رہا تھا۔ "ایک مرتبہ، بس ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار، آخری بار۔" اور تازی "نہیں نہیں نہیں" کہہ کر اس سے جان چھڑا رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں تازی کو اس کے چنگل سے نکل جانے کی کھڑاک سُنی۔ اُس کا سر دروازے سے اور اس کا پرس کرسی سے ٹکرایا تھا۔ خواجہ اس کے پیچھے اُبھرا، لیکن وہ دروازہ کھول کر نکل چکی تھی۔ تازی مینشن کی سیڑھیاں تیزی سے اُتر رہی تھی اور خواجہ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ "تازی! تازی!" تازی کی آوازیں کھوکھلی ہوئی سیڑھیوں کے درمیان دیوار کے ساتھ چکر لگاتی اور ریلنگ کی سلاخوں کے درمیان سے بتدریج نیچے گرتی جاتی تھیں۔

میں نے جاکر خواجہ کو دونوں کندھوں سے تھاما اور واپس لا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرمندگی سے مسکرایا اور سگریٹ سُلگا کر بولا "ایسے ہی ایک شام منگھو مجھے۔ وہ اس جرمن لڑکی کو دیکھ کر بھاگ گئی تھی اور اس نے اپنے جھونپڑے میں جاکر خودکشی کر لی تھی۔"

میں نے کہا "خواجہ یہ بھی مجھے ناخوش دکھائی دیتی ہے۔"

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگا کر کہا "آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ شادی میں پہلے پہل یہی ہوتا ہے۔"

اگلے روز سہ پہر کے قریب میں خواجہ کا دروازہ دیر تک بجاتا رہا لیکن اس نے اندر سے کنڈی نہ کھولی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اُٹھنے لگے اور میں نے خوفزدہ ہو کر دروازہ اور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ ساتھ کے فلیٹ سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکل کر بولی "وہ آج سویرے کا نکل گیا ہے۔"

"لیکن دروازہ تو اندر سے بند ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ، دوسرے والے کو تالا لگا کر گیا ہے۔ چھوٹے والے کو۔" عورت نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا خواجہ کے فلیٹ کا دوسرا چھوٹا دروازہ جو کبھی نہ کھلا تھا باہر سے تالا بند تھا۔ میں دل ہی دل میں خواجہ کے بارے میں سوچتا اس کے مختلف ٹھکانوں کی کھوج میں سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ تیسرے روز جب ہم کو خواجہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی تو اس میں لکھا تھا کہ موت نیلا تھوتھا کھانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

سیف الملوک کے پہاڑوں کی گونج نرالی ہے۔ بڑی آہستگی سے کہی ہوئی بات بڑی دیر کے بعد ویسی کی ویسی لوٹ آتی ہے۔ عشق کی بات اپنی مسافت طے کر کے لوٹ رہی تھی۔ بوڑھے کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے ملاپ کا خواہشمند ہو۔ اس کا اظہار کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا، طعنے نہیں دیتا۔ چُپ چاپ سُن لیتا ہے اور پی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے، اپنی خوراک سے، اپنے لباس سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور ایک دن اپنے کپڑے اُٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جاکر خاموشی سے مر جاتا ہے۔

ہم پھر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دہلیز پر قربان کر دی تھی۔ اس وقت وہ لیڈر کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل رہا تھا اور اس کے ہر قدم کے

ساتھ سوچ کی زنجیریں بج رہی تھیں۔ سوچ، یاد، خیال، حافظہ صرف ذہن کے کھونٹے سے نہیں بندھے ہوتے۔ ان کی ایک ڈور چلنے سے بھی بندھی ہوتی ہے۔ فلموں میں سوچنے والے آدمی کو آگے پیچھے چلتے دکھاتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ فلاں کی عقل گٹوں میں ہے لیکن حقیقت میں شاید ان کی سائنس دریافت کر چکی ہے کہ عقل کا اور سوچ کا ٹخنوں سے گہرا تعلق ہے۔ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا انسان خاموش اور پُرسکون ہوتا ہے لیکن جب اس کی سوچ کے گرد اس کے شعور اور لاشعور کا عمل الیکٹرون اور پروٹون کا پیٹرن بنانے لگتا ہے تو اس کا پاؤں اس کا گھٹنا یا پوری ٹانگ آپ سے آپ ہلنے لگتی ہے اور سارے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ارتعاش اور آرگن بازم کا ارتعاش ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ایک ہائی فائی ہوتا ہے اور دوسرا لو فریکوئنسی کا۔ انسانوں نے جب سے ٹانگوں کا استعمال کم کر دیا ہے اور چلنے کے عمل کو محدود بنا دیا ہے۔ اس وقت سے ان کی جبلی سوچ میں مکانکی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ روبوٹ کی طرح مسائل حل کر دیتے ہیں لیکن دوسرے جانداروں کی طرح مسائل کی فطرت اور ان کی رُوح سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کے مسائل کے درمیان ایک رشتہ پیدا نہیں ہوتا۔ آپس میں نیو ندر ابھاجی کا برتا نہیں ہوتا۔ میں اعداد و شمار تو پیش نہیں کر سکتا لیکن اپنے مشاہدے کی بنا پر ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لفٹ میں سوار ہو کر پندرھویں منزل پر جا کر اپنی محبوبہ سے ملنے والا لاتا ان اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو کوٹھے ٹاپ کر اور اپنے گھٹنے گوڈے چھلوا کر محبوبہ کے بالا خانے میں پہنچتا ہے جو اپنی پیش قدمی میں اپنی ٹانگیں استعمال کرتا ہے اور انہیں اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسی طرح کار میں سوار ہو کر وقتِ مقررہ اور مقامِ مقررہ پر پہنچنے والا عاشق جب اپنی محبوبہ سے ملتا ہے تو اس کے ذہن اور بدن کا عمل اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو نہر کنارے کیکروں کے درختوں میں بھاگتا ہوا پرانی پلی کا چکر کاٹ کر ویران آوے کے پیچھے سے ہو کر کھیت میں ساگ توڑتی محبوبہ سے ملتا ہے۔

قدم اور ذہن کا ساتھ بہت پرانا ہے اور وہ جو ہم میں سے ایک قدم قدم چڑھائی چڑھ رہا تھا جس کا سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے جس کی باہر کو نکلی ہوئی ٹنگری پر جھولتا ہوا امیوریک بج رہا تھا، بڑی تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ فرزانہ نے سولہ سال کی والہانہ محبت کو ہتھیلی پر مسل کر پھونک مار کر کس طرح اڑا دیا۔ اس سے آنکھیں ملانے تمسخر سے ہنسنے اور ہنسانے کی قوت کیسے

حاصل کر لی اور اپنی خاموش سلگتی ہوئی محبت کو چٹکی بجا کر پھلجڑی میں کیسے تبدیل کر لیا اور پھر پیچ پیچ گنڈیریاں دو تیریاں دو میریاں کرتی ہوئی بے دھا عورتوں کے گروہ میں کس طرح شامل ہو گئی۔ جوں جوں اس کے قدم آگے کو بڑھتے اور اوپر کو اُٹھتے تھے وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ اس دن کی طرف جب انہوں نے اپنے درمیان اظہارِ محبت کا ایک کوڈ سگنل قائم کیا تھا کہ جب ہم میں سے کوئی دوسروں کی موجودگی میں الفت کی شدت سے دیوانہ ہو جائے اور اظہار کا کوئی ذریعہ نہ پائے تو وہ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھول کر پپوٹوں کو آہستگی سے بند کرے اور ٹھنڈی سانس کو اندر ہی جذب کر کے خاموش ہو جائے۔ اس سگنل کے کوئی چھ ماہ بعد ایک اور سگنل وضع ہوا کہ جب فرزانہ رات کو اسے خدا حافظ کہے اور ہمارا دوست پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اپنے ویران گھر کا رُخ اختیار کرے اور اس کی روانگی کے پورے اسی گننے کے بعد فرزانہ اپنے کمرے کی بتی تین مرتبہ بجھائے اور تین مرتبہ روشن کرے اس کے پھاٹک سے نکلنے پر دونوں اپنی اپنی جگہ دل ہی دل میں یہ مہارنی شروع کر دیتے۔ سائٹھ پر پہنچ کر ہمارا یار مڑتا۔ جیبوں سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھتا اور ٹکٹکی باندھ کر روشن کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتا۔ بتی بجھتی پھر جلتی، پھر بجھتی پھر جلتی، پھر بجھتی اور جلنے لگتی۔ یہ واقعہ کوٹھیوں کے درمیان ٹوٹے ٹیبوں والی بنجر قدیم زمین میں سرکنڈے کے اس ٹوبھے کے پاس پیش آتا جو جلا ہوا تھا اور جس کی کالک سرمئی ہو کر آہستہ آہستہ ہم رنگِ زمین ہو رہی تھی۔ ہمارا دوست اس ٹوبھے کے پاس بیٹھ کر خاکستر سے مسح کرتا اور پھر جلتی ہوئی روشنی کی طرف منہ کر کے دو رکعت نفل ادا کرتا۔ سلام پھیر کر ہلکا پھلکا سا اٹھتا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔

سردیوں کی ایک شام اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو فرزانہ کے گھر والوں کے ساتھ آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور فرزانہ اس کو مالٹا چھیل کر دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک پھانک لیتا صوفے پر ساتھ پڑی ہوئی پرچ سے نمک مرچ چھواتا اور گھوری سی منہ میں رکھ لیتا۔ فرزانہ نے تین پھانکیں چھیل کر ہمارے دوست کو بھی دیں جس نے انہیں اسی پرچ سے لتھیڑ کر کھایا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ فرزانہ اور اس کے گھر والے اس نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ ہمارے دوست نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک لمبی سی جمائی لے کر فرزانہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ فرزانہ نے مالٹوں کے

لفافے کی گردن مروڑ کر لفافہ تپائی پر رکھا۔ پنج اس نوجوان کے پہلو سے اُٹھا کر لفافے کے پاس رکھی اور جواباً تین مرتبہ آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ اس عمل میں آج پہلی مرتبہ کوئی پندرہ سیکنڈ کی دیر ہوئی لیکن ہمارے دوست کا دل خوشی سے مفرح ہو گیا اور اس نے فرزانہ کے بہنوئی کو وہ لطیفہ سنانا شروع کیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ لطیفے کے خاتمے پر گھر کے سب لوگ کھلکھلا کر ہنسے لیکن اس نوجوان نے مسکرانے پر اکتفا کی۔ فرزانہ بھی ہنسی لیکن اتنا زیادہ نہیں جس قدر اسے ہنسنا چاہیے تھا۔ ہمارا دوست پھر دردناک ہو گیا۔ باتوں کا سلسلہ سیاست سے نکلا تو فیشن کے گرد گھوما اور پھر مقامی لوگوں کی زندگیوں پر محدود ہو گیا۔ اس اثنا میں رات کے دس بج گئے۔

فرزانہ کی امی نے رائے دی کہ اب سونا چاہیے۔ آپا نے کہا ابھی تھوڑی دیر اور بیٹھا جائے۔ فرزانہ نے کہا آپا ٹھیک کہتی ہیں پانچ منٹ اور بیٹھا جائے۔ مالٹے والے نوجوان نے کہا پانچ منٹ زیادہ ہیں تین منٹ اور بیٹھا جائے کیوں کہ کل مجھے انٹرویو دینے جانا ہے۔

فرزانہ نے کہا تین منٹ ٹھیک ہیں۔

ہمارے دوست نے کہا: "مجھے تو اجازت دیجیے مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔"

اس جملے پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنسے اور مالٹے والے نے کہا: "تین منٹ جلد پہنچ کر آپ کیا کر لیں گے؟"

ہمارے دوست نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ فرزانہ کا بہنوئی اور اس کی آپا بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں اسے پھاٹک تک چھوڑنے آئے اور جب وہ اسے شب بخیر کہہ کر پھاٹک سے نکلا تو اس کی مہارانی اپنی رفتار بھول گئی۔ سانس گنتے گنتے وہ چلتے ہوئے بُرجے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر روشن کھڑکی کی طرف منہ کیا ہاتھ سینے پر باندھے اور انتظار کرنے لگا۔ بارہ سے اور تراوسے کے درمیانی وقفے میں بتی بجھی پھر جلی پھر بجھی پھر جلی پھر بجھی اور جلنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور جلدی جلدی دو رکعت نفل ادا کر کے تیزی سے گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

مالٹے والا انٹرویو دینے آیا تو پھر وہیں رہ گیا۔ ایک مہینہ دو مہینے اوپر کئی اور ان گنت دن۔

اس عرصے میں فرزانہ بڑی خوبصورت ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے اچھی اچھی خوشبو آنے لگی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا اور وہ جو ایک گڑھا سا اس کے گال میں تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اس عرصے

میں وہ ہمارے دوست کے ساتھ اور توجہ سے اور التفات سے پیش آنے لگی اور محبت کے اظہار میں پہلے سے نذر ہو گئی۔

ایک دن ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس نے ہمارے دوست کے سر پر پت سے ہاتھ پھیرا اور صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر کہنے لگی: "تم اس طرح سے سڑے کیوں رہتے ہو؟"

"رہتا ہوں میری مرضی۔" اس نے جل کر کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"یہی تو بات ہے۔" اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اس پر فرزانہ قہقہہ مار کر ہنسی اور ہمارے دوست کے سر پر ہلکا سا ٹھوکا مار کر کہنے لگی: "تم بالکل کاگے ہو۔ چھوٹے سے کاگے۔"

"ہاں میں کاگا ہوں لیکن تمہیں اس سے کیا۔"

وہ یہ بے ہودہ جواب سُن کر اور زور سے ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"ہنسے جاؤ، ہنسے جاؤ۔" ہمارے دوست نے سر جھکا کر کہا: "اب تم نے ہنسنا ہی ہے۔"

فرزانہ اس کے سامنے آ کر رکوع میں کھڑی ہو گئی اور ہنستے ہنستے بولی: "بھائی صاحب ہنسنا کوئی جرم ہے؟"

"نہیں جرم کیوں ہونے لگا۔ بڑی نیکی ہے لیکن پہلے تو ایسی ہنسی میں نے تمہارے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔"

"پہلے تم نے میرا چہرہ ہی کب دیکھا تھا۔"

"دیکھا تھا دیکھا کیوں نہیں تھا۔ سو مرتبہ دیکھا تھا۔"

"تو میں ہنستی نہیں تھی۔"

"ہنستی تھی لیکن اس طرح سے نہیں ہنستی تھی۔"

"پہلے کیسے ہنستی تھی بھلا؟"

"اُلو کے پٹھوں کی طرح حرامزادوں کی طرح۔"

"توبہ توبہ۔ گالیاں۔" اس نے باری باری دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور دوپٹہ منہ میں ٹھونس

کر ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ہمارے دوست کا بیان ہے کہ وہ فرزانہ سے ہر بات کی توقع رکھ سکتا تھا لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کو میرے ہوتے ہوئے کسی اور سے محبت ہو سکتی تھی۔ ہم نے کہا شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو اس کو کسی اور سے محبت نہ ہوئی ہو اور وہ تمہارا ہی دم بھرتی ہو۔"

اس نے کہا: "یہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ میں ٹھیک سمجھتا ہوں۔ ہم نے کہا تمہارے پاس ٹھیک سمجھنے کا ثبوت ہے۔

اس نے کہا: میرے پاس کوئی ثبوت نہیں لیکن میں خدا کو برحق سمجھتا ہوں۔"

ہم نے کہا: خدا کا تصور تو تمہیں تمہارے والدین نے دیا ہے تمہارے معاشرے نے دیا ہے۔"

اس نے کہا: "یہ تصور میرے اندر نے دیا ہے میرے وجود نے دیا ہے۔"

ہم نے کہا: "تمہیں اندر سے کوئی آواز آتی ہے؟"

اس نے کہا: "بالکل نہیں۔"

ہم نے کہا: "پھر؟"

کہنے لگا: "مجھے نہ اندر سے آواز آتی ہے نہ باہر سے نہ زمین سے نہ آسمان سے لیکن آتی ہے۔"

ہم نے کہا: "یہ پھر آتی کہاں سے ہے؟"

اس نے کہا: "فرزانہ سے آتی ہے اس کی ہنسی سے آتی ہے اس کی رفتار سے آتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے کہا: "کہتا کیا ہے۔ وہی کہتی ہے جو میں سنتا ہوں۔"

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا: "اس سالے کے جوتے مارو۔"

اس نے ہمارے چہروں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر رونے لگا۔ ہم میں سے کسی نے اس کو چپ کرانے کی کوشش نہ کی۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی اور پھر وہ خود ہی خاموش ہو گیا۔ آنسو پونچھ کر مسکرایا اور مسعود سے کہنے لگا: "یار مجھے ایک گلاس پانی تو پلا۔" مسعود ایک گلاس پانی لے آیا اور ہم اسے پانی پیتے دیکھنے لگے۔ پھر اس نے ہنس کر کہا: "یار حد ہو گئی۔" اور گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ ذرا سا جھک کر اس نے فرش پر اپنے جوتے سیدھے کیے اور پھر ہنسنے

لگا۔ اس کے ہنسنے کی آواز کافی بلند ہو گئی تو مسعود نے کہا: "ہوا کیا؟" اس نے اس طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ عورت ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔"

مفتی نے کہا: "الحمد للہ ہوتی ہے خدا سے خوش رکھے۔"

"لیکن یہ تو بہت ہی بے وفا نکلی۔" اس نے حیرت کے ساتھ کہا: "کل شام تو اس نے حد ہی کر دی۔"

ہم سب کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ پھر مسکرایا اور ہنسنے لگا۔

مسعود نے کہا: "اب بکے گا بھی یا اسی طرح ہنستے جائے گا۔"

مفتی نے کہا: "ٹھیک ہے ٹھیک ہے یار اس کو ہنسنے دو۔ کم از کم ایک چیز تو سیکھ لی ہے اس نے اپنی گل پیاری سے۔"

"میں اس کی طرح ہنستا ہوں مفتی؟ اس کی طرح سے۔" وہ چیخا: "اس مکاری سے اس عیاری سے۔ لعنت ہو تم پر۔"

"لیکن حد کیا ہوئی؟" مسعود نے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار دفع کرو۔ یہ ذات ہی ایسی ہے کوئی اور بات کرو۔"

"اس سے اچھی اور کیا بات ہو گی؟" مفتی نے کہا۔

"تو دفع دفع۔" اس نے دونوں زانو زور سے ہلاتے ہوئے کہا: "دفع دور مردود نہ فاتحہ نہ درود۔"

پھر ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور کافی دیر تک زبردستی خاموش رہے۔

"حد ہو گئی یار۔" اس نے اپنے آپ سے کہا: "ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں؟"

"کیسے؟" مسعود نے پوچھا۔ "یہی فرزانہ جیسے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کیا اس نے؟" مسعود مرا جا رہا تھا۔

"کرنا کرانا کیا تھا۔" مفتی نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: "ہم پر آ کر خالی دے گئی۔"

"توبہ توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا: "چالاکی صاف چالاکی گندی چالاکی۔"

جب ہم نے اس فقرے کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی کہنے لگا: "جب میں کل شام اُن کے گھر سنک کے پاس کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھ جھاگ سے لتھڑے ہوئے تھے تو وہ آہستگی سے آئی۔ حد ہو گئی یار۔ کمال ہو گیا۔ میں کھڑا ہوں اور وہ مالٹوں والا سلیپر ذرا ٹنگ کے دم

میں بیٹھا ہے اور وہ لوگ تاش کھیل رہے تھے اور یہ ان کے لیے پلیٹ میں بسکٹ ڈال کر لے جا رہی ہے اور وہ لوگ چائے پی رہے ہیں اور میں جیسے اس دُنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔"

"اور اس نے سارے بسکٹ لے جا کر بانٹنے والے کو دے دیے۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔

"لکھ لعنت تم پر مسعود" مُفتی نے تالی بجا کر کہا۔ "او کم بخت سُنتا نہیں یہ کہہ رہا ہے، وہ آہستگی سے آئی اور اس کے آگے پلیٹ کر کے بولی۔ "لو بسکٹ کھاؤ۔" کیوں بھئی یہی کہا تھا ناں اس نے۔ یہ قوم بڑی چالاک ہوتی ہے جب دونوں ہاتھ بندھے ہوں۔ رسی سے یا ہتھکڑی سے یا صابن کے جھاگ سے پھر عورت ضرور کچھ نہ کچھ آفر کرتی ہے۔ کیوں بھئی؟ اور جو سیانے ہوتے ہیں میرے جیسے وہ صابن سمیت بسکٹ اُٹھا لیتے ہیں اور جو سیریل ہوتے ہیں اس جیسے فیس فی ڈیش وہ انکاری ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس رستے میں پھسلن سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ کون صابن تھا؟"

ہمارا دوست پھر ہنسا اور سر جھٹک کر بولا۔ "حد کر دی یار اس نے۔"

مُفتی نے کہا۔ "مسعود جی ہمارے پرانے بزرگ سن لائیٹ صابن زیادہ پسند کرتے تھے۔ میں اس صابن پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ بڑے بڑے واقعات مجھے یاد ہیں۔"

مسعود نے کہا۔ "پہلے اس کی بات تو سُن لو مُفتی جی۔"

"سُن لی سُن لی" مُفتی نے سر ہلا کر کہا۔ "سمجھ لی۔ اب اس میں رہ کیا گیا ہے۔"

اس نے ہمیں جھٹلا کر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔ "حد ہو گئی یار۔ میں سنک کے پاس کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھ صابن سے لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ بسکٹوں کی پلیٹ لے کر آہستگی سے میرے پاس آئی اور میرے بائیں گال کو زور سے چوم کر بولی۔ "یہ کیا سڑی ہوئی شکل بنا رکھی ہے۔" اور پھر تیزی سے پلیٹ لے کر چائے پینے والوں کے پاس چلی گئی۔"

مسعود نے زمین سے اپنی چپلی اٹھا کر کہا۔ "اس حرامزادے کے جوتے مارو ابھی رو رہا تھا سور۔"

اس نے پھر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔ "حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی ایسی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ کبھی اس کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ اس نے کیوں کیا؟ میرے ساتھ ایسی چالاکی کیوں کی؟ سُندھی چالاکی۔"

پھر اس کا چہرہ مغموم ہو گیا اور فرزانہ کی بے وفائی کا دھواں اس کے گال پر پھیلنے لگا۔

جب مُفتی نے اس حادثے پر تنقید نہ کی تو مسعود نے اپنی چپلی پھر فرش پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر خاموشی

رہی پھر وہ کہنے لگا۔ "اس نے میرا دل کھٹا کر دیا یار۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" مُفتی نے آہستگی سے پوچھا۔

"آج شام پھر اس کے یہاں جا رہا ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

جب انسان کا دل کھٹا ہو جاتا ہے تو وہ دل کھٹا کرنے والے کی یاد کا سوڈا منٹ ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہے۔ تنہائی میں بھی یہ گولیاں چوستا ہے اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی ان سے زبرنگ کرتا رہتا ہے۔ سوڈا منٹ کی یہ سپلائی ایک طویل مدت تک ختم نہیں ہوتی اور بے وفا لوگوں کی دل کھٹا کر دینے والی باتیں سُنتا ہوا یہ انسان معدے اور ذوق دونوں میں السر لے کر چپ چاپ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔

جھیل سیف الملوک کا کوئی اثر آثار نہ تھا اور ہم آہستگی سے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہم سب سے آگے تھا اور تقریباً اس کے ساتھ ہی لیڈر۔ پھر میں اور میرے ساتھ عماد، مسعود، اعظمی اور مُفتی ذرا پیچھے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے ساتھ پرانی یادیں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کی ٹانگوں سے سوچنے کا عمل جاری تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو عماد! اس سالے کی ٹانگوں سے اب بھی یاد کی بیڑیاں بندھی ہیں اور ان کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔"

"اُف شاہ جی" عماد پورے زور سے چلایا۔ "میں ابھی یہی بات یہی فقرہ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا کہ آپ بول پڑے۔ صرف بیڑیوں کی جگہ میں شیکلز کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔"

پھر اس نے پلٹ کر کہا۔ "مُفتی جی دو ذہنوں میں ایک خیال ایک ہی وقت میں کیسے آ جاتا ہے؟"

اعظمی نے کہا۔ "صلح ہو تو اس کو شاعری میں توارد کہتے ہیں، ناراضگی ہو تو سرقہ۔ ویسے اس طرح سے کبھی ہوا نہیں، واہیات بات ہے۔"

"ہوتا ہے ہوتا ہے کیوں نہیں" مسعود نے ذوق سے کہا۔ "ٹیلی پیتھی کا نام نہیں سُنا۔ یہی تو وہ چیز ہوتی ہے جس سے خیال ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔"

مُفتی نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اُتار دو یار اُتار دو مجھے۔ پھر جاہلوں نے ایسی بات شروع کر دی جس کے بارے میں ال کا نام گر کو نہیں جانتے۔"

کپتان نے مُفتی کو اپنی پیٹھ سے اُتار کر نیچے کھڑا کر دیا اور کافی دیر تک مُفتی کا انتظار بند اس

کی ٹانگوں کے درمیان جھولتا رہا۔ اس نے ہم کو ٹیلی پیتھی اور سائیکو کائنیسز پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا اور پیرا سائیکولوجی کی اصطلاحات میں الجھا دیا۔ مسعود نے کہا: "مفتی یار تمہاری سائیکولوجی بھی گشتی عورت کی طرح ہے۔ کبھی کسی کی بغل گرم کرتی ہے، کبھی کسی کا دل لبھاتی ہے۔ قابو میں کسی کے نہیں آتی۔"

مفتی نے کہا: "یہ علم ہی گشتی ہے، کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اب تک تحلیل نفسی ہی کا کوئی حتمی اور آخری فیصلہ نہیں ہوا۔"

"ریشہ خطمی کا فیصلہ البتہ ہو گیا ہے۔" اعظمی اپنے مخصوص انداز میں بولا اور عماد چڑ کر کہنے لگا: "اس کو لفظوں کے الٹ پھیر کا چسکا ہے، مطلب چاہے نکلے نہ نکلے۔"

"کیوں مطلب کیوں نہیں نکلتا؟" اعظمی سنجیدہ ہو کر بولا۔ "فرائیڈ کا سارا فلسفہ ریشہ خطمی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں مفتی جی؟"

مفتی نے اعظمی کو ایک مہذب سی گالی دے کر کہا: "سالا ٹھیک بکواس کرتا ہے۔"

ہم پھر چلنے لگے تو کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور مفتی نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا: "خان بابا! ابھی میں چند قدم چل سکتا ہوں، تکلف مت کرو۔"

اب پہاڑ پر راستہ تنگ ہو گیا تھا اور دونوں طرف اُگی ہوئی جھاڑیوں کی قسمیں بدل گئی تھیں۔ سب کی شاخیں مختلف تھیں، پتے مختلف تھے، پھول مختلف تھے اور ان کا جسم نیچے رہ جانے والی جھاڑیوں سے مختلف تھا۔ ہم میں سے ہر ایک تھک چکا تھا لیکن زبان سے کوئی بھی اقرار نہ کرتا تھا۔ پاؤں تو راستے پر ٹھیک پڑتے تھے لیکن ٹانگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔

ہم اپنی قوت کے بل پر نہیں بلکہ قوتِ ارادی کے بل پر چل رہے تھے۔ قوتِ ارادی کے بل پر چلنے والے منزل تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کی شکلیں اور شخصیتیں انسانوں کی سی نہیں رہتیں۔ فتح مند اور کامیاب لوگوں کی شکلیں بل ڈاگوں کی سی ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں لال، چہرہ بھرکم اور بازو مضبوط ہوتے ہیں اور ان کی زبانیں ہر وقت ان کے منہ سے باہر لٹکا کرتی ہیں۔ راہ میں تھک کر سو جانے والے خرگوش بڑے نرل ہوتے ہیں۔ وہ منزل تک تو نہیں پہنچ سکتے لیکن ان کی پوستین بڑی نرم، کان بے حد ٹھنڈے اور آنکھیں بڑی شانت ہوتی ہیں۔ وہ مہاتما بدھ کے بھکشو ہوتے ہیں جنہوں نے خواہش کو مار کر اپنے آپ سے صلح کر لی ہوتی ہے اور ان کے اندر

سبزہ زار ہو چکا ہوتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک ایسا ساتھی بھی تھا جو آج سے کئی سال پہلے جب نیا نیا آزاد کشمیر ریڈیو پر ملازم ہو کر آیا تھا تو نوجوان تھا اور تازہ تازہ کالج سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ تھا اور ویسی ہی خوشبو رکھتا تھا۔ اس کے بال بنانے اور کپڑے پہننے کا انداز ہم سب سے نرالا تھا۔ وہ ہم سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن جایا کرتا تھا اور رات کو سب سے بعد میں لوٹا کرتا تھا۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے وہ ایک خاص قسم کی سیٹی بجایا کرتا جس کا میوزک باغوں اور بہاروں والا سے ملتا جلتا تھا۔ ہم نے ابتدا میں اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی اور اس نے ہماری پیش قدمی کا جواب محبت اور خوش خلقی سے دیا بھی اور عین ممکن تھا وہ صرف ہمارے جوگا ہو کر رہ جاتا کہ اچانک اس پر ایک حملہ ہوا۔ اندھیری رات کی یلغار، برف کا شبخون، گوریلے کا حملہ۔ پہاڑی اوٹ سے ایک عورت گہرے سبز رنگ کا لانگ کوٹ اور جوگیا دوپٹہ سر کے گرد لپیٹے نمودار ہوئی اور اس سے چمٹ گئی۔ کچی تازہ بھربھری برف میں دونوں گرے اور نیچے تک پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا سکرپٹ لکھ رہا تھا اور باہر شدید برفباری ہو رہی تھی۔ نمی کی وجہ سے سگریٹ بار بار سلگانا پڑتی تھی اور ماچس ختم ہو گئی تھی۔ میں نے کنٹین والے کو آواز دی کہ ہاف سیٹ چائے اور ایک ماچس بھیجو۔ لڑکا تھا اناڑی، چائے کا ٹرے ایک ہاتھ پر اٹھا کر کنٹین سے میرے کمرے کو یوں چلا جیسے تار پر لیڈی چلا کرتی ہے۔ پاؤں پھسلا اور گرم گرم چائے والی برف پر گری اور میرے دیکھتے دیکھتے کئی فٹ برف کے اندر دھنس گئی۔ لڑکے نے اس کو نکالنے کی احمقانہ کوشش کی تو اردگرد سے بھربھری برف کا ایک ڈھیر وہاں پھسل آیا۔ کنٹین والے نے آواز دے کر کہا: "رہنے دو۔ اب اس سالی چائے والی کو اور واپس تشریف لے آ۔ اب یہ گرمیوں میں نکلے گی۔"

ہمارا ساتھی اور سبز کوٹ والی جب برف پر گرے ہوں گے تو اپنی حدت کی وجہ سے کئی گز اندر دھنس گئے ہوں گے۔ اس وقت ہم نے نہیں دیکھا صرف مفتی نے دیکھا تھا اور چونکہ وہ ہم سب میں سے دانا اور عمر میں زیادہ تھا اس لیے کنٹین کے لونڈے کی طرح اس جوڑے کو برف سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا اور احمقانہ کوشش میں اس نے ہمارے دوست کو اس کے ساتھ اگلی گرمیوں تک کے لیے دفن کر دیا۔

وہ خاتون ہمارے دوست سے کوئی بارہ برس بڑی تھی۔ لمبا قد، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی

آنکھیں، ذہرا بدن اور پختہ ارادہ۔ ہمارا غزالِ رعنا اس شیرنی کے ساتھ کلیلیں بھرنے کا عادی ہو گیا تھا اور اس کے جبڑوں پہ اپنی تھوتھنی رگڑ رگڑ کر لبِ لعلیں میں رنگ بھرتا رہتا تھا۔ یہ بات سٹیشن پر اتنی عام ہوئی کہ پاٹ صاف کرنے والے جمعدار بھی ہر وقت مزے سے اسی کا تذکرہ کیا کرتے اور ہم کو غسل خانوں میں جاتے ہوئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک شام مسعود نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: "اڑتالیس اعشاریہ چار میٹر پہ ہم آزاد کشمیر ریڈیو سے بول رہے ہیں۔ شام کے ساڑھے سات بجے ہیں، جمیلہ اختر سے ایک ارگ گیت سنیئے۔" پھر اس نے فیڈ کھولا لیکن کوئی آواز نہیں۔ وہ کنٹرول روم کی طرف بھاگا۔ کوئی نہیں۔ سٹوڈیو میں دیکھا جمیلہ اختر موجود ہے۔ اشارہ نہیں آیا۔ ایک منٹ گزر گیا۔ سارے سٹیشن پہ پھر تو تھرتھلی مچ گئی۔ سٹینڈ بائی ڈسک فیڈ آن کر دی گئی۔ ہم اِدھر اُدھر بھاگے کوئی اتا پتا ہمارے ساتھی کا معلوم نہ ہوا۔ مفتی پریشان تھا، مسعود خوفزدہ تھا، عمر کانپ رہا تھا اور نیچے سے سٹیشن ڈائریکٹر کے فون پہ فون آ رہے تھے۔

جمعدار چھوٹی پہاڑی کے پیچھے نجاست گرا کر آ رہا تھا اور ملٹری کا گندہ پاٹ بجا بجا کر گا رہا تھا۔

"اوہناں پریتاں دی عمر ہو چکی پانی شیر دی جوہ دا پیندیاں نیں"۔ مفتی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "للو کدھر ہیں؟"

للو نے ہاتھ کے اشارے سے کہا: "ادھر۔"

"دونوں؟" مفتی نے پوچھا۔

"ہاں جی دونوں۔"

"ان کو بلا کر لاؤ جلدی سے۔"

"یہ مشکل ہے مفتی جی۔" للو نے ہنس کر کہا: "شیرنی نے ہرن کو پنجوں میں پکڑا ہوا ہے اور اس کی گردن سے خون چاٹ رہی ہے۔"

پھر یہ معاملات حد سے بڑھ گئے اور اس خاتون کے خاوند اور ہمارے دوست کے درمیان ڈوئیل فائیٹ کرنے کی نوبت آ گئی۔ دونوں نے پہلے اپنی اپنی دلیلوں کی تلواریں نکالیں پھر ٹیکنیکل کے خنجر چلے۔ پھر چیلنج کے پستول چلے اور آخر یہ فیصلہ ہوا کہ معاملہ خاتون پر چھوڑ دیا جائے۔ اس خاتون نے بڑے مشفقانہ انداز میں اپنی ہرنی کی تھوتھنی چاٹی اور اسے کہا کہ پہلے اپنے گھر والوں کو جا کر راضی کرے۔ ہمارا دوست ہوا کے گھوڑے پر سوار گھر پہنچا۔ اپنی والدہ سے تمام قصہ بیان کیا۔ اس کے

سامنے گھٹنے ٹیک کر دامن پھیلایا اور ممتا کی ساری بھیک اس میں ڈالنے پر زور لگانے لگا۔ ماں کا دل بچے کے لیے محبت سے لبریز ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کو سینے سے لپٹا لیا اور اس کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ جب دونوں ماں بیٹا آدھی رات تک اپنے آنسوؤں کا خزانہ ختم کر چکے تو ماں نے اپنے دوپٹے سے بیٹے کے چہرے پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کے نشان صاف کیے اور آہستگی سے کہا: "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیرا ساتھ دوں گی اور تیری شادی میں شامل ہوں گی۔" بیٹا ایک لفظ کہے بغیر سسکیاں بھرتا ہوا ماں کی گود میں سو گیا۔ اگلے دن اس کی ماں نے حسبِ وعدہ اپنی بھانجی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا جو ایف اے کے آخری سال میں تھی۔ ہمارا ساتھی اپنی دلہن کو ساتھ لے کر پہاڑ پر واپس آ گیا اور ہم نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے مکان تلاش کرنے لگے۔ سب سے اچھا اور سستے کرائے کا مکان جو ملا وہ اس خاتون نے ڈھونڈا تھا جو سبز رنگ کا کوٹ پہنتی تھی اور سر پہ جوگیا رنگ کا دوپٹہ لپیٹتی تھی۔

مرد کا کام عورت کو سمجھنا نہیں اُس کو محسوس کرنا، اُس کی حفاظت کرنا اور اُس سے محبت کرنا ہے۔ عورت کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ مرد اُس کو سمجھنے لگا ہے یا اُس کے جذبات کو جانچنے کا راز پا گیا ہے تو وہ فوراً آپ کو جان دے دے گی۔ آپ عورت کے ساتھ کتنی بھی عقل و دانش کی بات کریں، کیسے بھی دلائل کیوں نہ دیں، اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو وہ اس منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔ اس کے ذہن کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا ہوتا ہے۔ وہ اسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی اسی لیے وہ کسی عقل و دانش اور دلائل کے معاملے میں مانگے کی روشنی پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد اور آخری حل ہوتا ہے۔

ایک بڑے سے پتھر پہ پاؤں رکھ کر تسمہ باندھتے ہوئے ہمارے اس دوست نے مڑ کر دیکھا اور کہا: "دوستو! اگلے مہینے ایک ایک ہفتہ اپنی مصروفیات سے نکال کر رکھنا۔ تمہارے بھتیجے کی شادی ہے۔"

"شادی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا: "اتنا بڑا ہو گیا؟"

وہ زور سے ہنسا اور پیچھے کو لڑھک گیا۔

"بُھلّے ہو مفتی جی۔" اس نے سر ہلا کر کہا: "شاہ جی ابھی تک اپنے آپ کو جوان سمجھ رہے ہیں۔"

"میں کچھ کھسیانا سا ہو گیا اور بات ٹالنے کی غرض سے بولا: "کہاں ہو رہی ہے شادی؟"

"آپ کے لاہور میں۔ گلبرگ مترّی کے کنارے ماڈل ٹاؤن کی طرف۔"

"کون لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس سالے کو کیا پتہ ہے کون لوگ ہیں؟" مسعود نے توضیحاً کہا: "اس نے لڑکی تلاش کر کے دی ہے ہیرے کوٹ والے نے۔"

"اس کے ساتھ اب بھی مراسم ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں شاہ جی۔" ہمارے دوست نے سکون کی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "وہ تو کب کا سیز فائر ہو چکا۔"

پھر کافی دیر تک خاموشی رہی۔ اندر اور باہر چین ہی چین لکھا ملا۔ راستے کے ارد گرد پھولوں کی بہتات ہو گئی تھی۔ یہ پھول سیب کے بٹن کی طرح چھوٹے اور شکل و صورت سے لونگ کے قریب تھے۔ کوئی نیلا تھا کوئی گلابی کوئی سفید کوئی اودا۔ ہمیں ایک پن چکی والے نے بتایا تھا کہ اوپر تم کو چھوٹے چھوٹے پھول ملیں گے انہیں توڑنا مت، وہ شہزادی بدیع الجمال کا ہار سنگھار ہیں۔ اگر ان میں سے دو پھول بھی کم ہو جائیں تو اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سنگھار کے معاملے میں عورت کو پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر اس کے پاس کوئی چیز کم ہو جائے تو وہ زندہ تو رہتی ہے لیکن چھپی چھپی ذری ذری ہوئی سی جیسے اپاہج آدمی محبت اور خوش اخلاقی سے ملتا ہے لیکن اس کی خوش اخلاقی کے اندر خوف اور شرمندگی کا تونبہ بج رہا ہوتا ہے اور وہ نہ مسکرانے والی بات پر بھی مسکراتا رہتا ہے۔ عمر نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گردن گھمائی اور پھر ایک زور کی ہانک لگا کر کہا: "اوئے یہ اعظمی کدھر مر گیا؟" ہم سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بڑے سے پتھر پر اعظمی مرا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں سفید سی ہو گئی تھیں۔ مسعود نے کہا: "اُٹھو یار اس طرح بیٹھنے لگے تو یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو گا۔"

"میں نے راستہ ختم کر دیا۔" اعظمی نے منہ ہماری طرف کر کے جواب دیا: "اب میں خلوت کے ساتھ بیٹھا ہوں اور میرا اس کی کمپنی سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"تیری خلوت کی ایسی تیسی۔" عمر چڑک کر بولا: "اس کو ساتھ لانا تھا تو ہمارے ساتھ کیوں آئے تھے؟"

"حد ہو گئی۔" اعظمی نے آنکھیں بند کر کے چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا لیا اور کہنے لگا: "کمال کے قافلہ سالار ہو۔ ہمارے ساتھ ہمارے حرم کو آنے سے روکتے ہو۔ اس کا کچھ بار تم لوگوں پر نہیں ہے۔ ہم اس کا خیمہ الگ لگاتے ہیں، اس کی پاسبانی خود کرتے ہیں، سارے مصارف خود برداشت کرتے ہیں۔ پھر تم ہم کو اس کی محبت سے جدا کیوں کرتے ہو؟"

"یہ کس کی محبت کا ذکر ہو رہا ہے؟" مفتی نے اپنے کوہستانی کو روک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں یار مفتی جی! محبت کا ذکر ہو رہا ہے اور بھائی لوگ ناراض ہوتے ہیں۔" اعظمی کی آنکھیں ویسے ہی بند تھیں۔

"چلو چلو۔" لیڈر بولا: "چلو دفع کرو اس کو۔ مرنے دو۔ ختم ہونے دو۔ ویرانی میں گمنامی میں مر جائے گا تو کوئی اس کو پوچھنے بھی نہیں آئے گا۔ چلو میرے شیرو شاباش۔"

مفتی نے کہا: "اور اگر تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ میرے مر جانے کے بعد کیا ہو گا تو سوچو کہ تم سے پہلے جو مر گئے ان کے چلے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"واہ مفتی واہ۔" مسعود نے سر ہلا کر کہا اور اس کا سر پوست کے ڈوڈے کی طرح دیر تک ہلتا رہا۔

"یہ فقرہ مفتی جی کا نہیں۔" عماد آہستگی سے بولا۔ "ذوالنون مصری کا ہے کیوں جی؟"

لیکن مفتی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں اپنی موت کے غم میں دکھ سے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ یعنی مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ریڈیو سٹیشن لاہور کا نیا ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے گا اور اس کی پہلی، دوسری اور تیسری نشریات کی ابتدا اخلاق احمد دہلوی، عزیز الرحمٰن اور نسرین محمود اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں، اسی خاص لہجے میں، وہی کپڑے پہنے ہوئے۔ کتنے ظلم کی بات ہے۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے۔ میرے دل نے کہا اور مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ باہر کے لوگوں کے بارے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لاہور کے لوگ اس کمی کو ضرور محسوس کریں گے۔ شدت سے کریں گے اور پھر دیر تک کرتے رہیں گے۔ شاید کئی سالوں تک۔ بہت ممکن ہے ساری عمر

آخر میرا مر جانا اور ختم ہو جانا اور اس جہان سے چلے جانا کوئی معمولی بات تھوڑی ہوگی۔ ایک عام ادیب اور فن کار مر جاتا ہے تو ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ میں تو پھر کئی حلقوں کا محبوب ہوں، قارئین کا محبوب، سامعین کا محبوب، ناظرین کا محبوب۔ یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح سے زندہ رہ سکیں گے اور راتوں کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر جھاڑ کر اور اپنے تکیے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سو جایا کریں گے بھلا؟

پھر مجھے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں چل رہا ہوں یا کھڑا ہوں، بیٹھا ہوں یا پتھر سے ٹیک لگا کر سوچ رہا ہوں، گھر میں ہوں یا راستے پر ہوں۔ سفر ہے یا حضر ہے۔ وجود مٹ گیا اور اہمیت کا بُت ایستادہ رہ گیا۔ بہت بڑا بُت تانبے رانگ اور پیتل کی دھات کا مرکب، براسو سے چمکا ہوا، دھوپ میں چمکتا ہوا۔ برگد کے کئی سو سالہ پیڑ کے نیچے جرنیلی سڑک سے میل سوا میل دُور درختوں کے ایک وسیع جھنڈ کے پاس۔

ابھی مجھے اس جہان سے گزرے دو گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ خبر سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن پہنچے گی۔ شام کا وقت ہوگا اور سٹیشن کے اندر اور باہر بڑی خاموشی ہوگی۔ پروگرام سٹاف کے لوگ جا چکے ہوں گے۔ ٹرانسمشن ڈیوٹی کا سٹاف سٹوڈیو کی طرف مصروفِ عمل ہوگا۔ چودھری بشیر کسی ضروری کام سے دفتر آئے ہوں گے یا نہیں آئے ہوں گے لیکن اکرم بٹ اپنے کمرے میں موجود ہوگا اور اس کے لیے یہ خبر کافی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ اپنے ان تمام دوستوں کو فون کرے گا اور ہر ایک سے ایک ہی بات کہے گا کہ "سنا ہے اشفاق صاحب ہمارے ساتھ کیا ظلم کر گئے۔" اور پھر اس کے بعد اسے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آتے جائیں گے جب ہم پرانے سٹیشن پر گیراج کینٹین میں، سٹوڈیو میں، اپنے اپنے کمروں میں، برآمدوں میں، لان پر، ڈی سی پی کے اندر ریہرسل سے پہلے اور ریہرسل کے بعد بیٹھا کرتے تھے، ملا کرتے تھے، بولا کرتے تھے اور بحثیں کیا کرتے تھے اور ہمارے اندر کمال محبت کے باوجود دُوری کا احساس رہا کرتا تھا۔

پھر ڈیوٹی روم میں راولپنڈی سے مسعود کا فون آئے گا اور چپڑاسی بھاگا بھاگا اکرم بٹ کو بلا کر لے جائے گا اور ان دونوں کے درمیان بڑی درد بھری باتیں ہوں گی۔ مسعود چونکہ مجھے پہلے سے جانتا ہے اور ہماری دوستی کے سالوں کا وقفہ طویل ہے اس لیے ایک سینئر کی حیثیت سے

وہ اکرم بٹ پر حاوی رہے گا۔ وہ مری اور آزاد کشمیر اور راولپنڈی کے قیام کی باتیں زیادہ کرے گا اور اکرم بٹ اس کا ماتحت ہونے کی حیثیت سے اور دوسرے اس کے مقابلے میں مجھے کم مدت کے لیے جاننے کی وجہ سے دبا دبا سا رہے گا اور "بس جی مسعود صاحب بس جی۔۔۔ حد کر گئے خان صاحب۔۔۔ کمر توڑ گئے" وغیرہ ہی کہتا رہے گا۔ پھر ان دونوں کے درمیان شام سوا آٹھ بجے خصوصی پروگرام کی بات ہوگی اور اکرم کہے گا "میں نے بندوبست کرنا شروع کر دیا ہے۔ گاڑی ابھی آتی ہے اور میں لوگوں کو جمع کرتا ہوں۔ کتنا وقت رکھیں؟" "پندرہ منٹ کافی ہیں" مسعود کہے گا۔

"ہاں جی پندرہ منٹ تو کچھ بھی نہیں مسعود صاحب، خان صاحب ادیب بھی تھے، براڈ کاسٹر بھی تھے، سرکاری ملازم بھی تھے، پایہ کے دوست بھی تھے۔ پندرہ منٹ تو بہت کم ہیں۔"

"تو پھر سوچ لو ہم تو یہاں پندرہ منٹ کا پروگرام ہی کر رہے ہیں۔ تین منٹ کا چنک شہاب صاحب کا ہے جو ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ ساڑھے آٹھ منٹ کی تقریر مفتی صاحب کی ہے۔ بڑے انوکھے انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے انہوں نے۔ تین ساڑھے تین منٹ میرے ہیں۔ باقی وقت عمر اور کلیم نے لیا ہے۔"

"کلیم کون جی؟"

"او یار عطا حسین کلیم، اس کے ساتھ بھی بڑے تعلقات تھے اشفاق کے۔"

"ہم تو پھر آدھ گھنٹہ لیں گے مسعود صاحب۔ لاہور سٹیشن کا بڑا ستون تھا 'تلقین شاہ' اس کے لیے تو آدھ گھنٹہ بھی ناکافی ہے۔"

"ٹھیک ہے دیکھ لو۔ زیڈ اے بخاری سے زیادہ ٹائم نہ مل جائے ورنہ اعتراض ہوگا، یہ بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"وہ تو سب مانتا ہوں مسعود صاحب لیکن ہمارا بھی تو دل ہے۔ یہاں لوگ ان کی عزت ہی نہیں کرتے تھے ان سے محبت بھی کرتے تھے۔"

"کیا کہنے یار اس کے، اب ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔ نظامی صاحب گئے، محمد حسین چلا گیا، اب یہ بھی دھوکا دے گیا۔ ویسے یار اکرم بٹ ہمارے ساتھ کے لوگ جا رہے ہیں، ایک ایک کر کے۔"

"ہاں سر، اب اندر گھنٹی سی بجنے لگی ہے اور دوسری بات یہ ہے۔۔ مسعود صاحب کہ۔۔"

"اچھا میں بھول نہ جاؤں تمہارے پاس اس کی آواز کا کوئی ٹیپ تو ہو گا؟"

"لعنت ہو جی مسعود صاحب ان نئے نئے پروڈیوسروں پر سارے ٹیپ ای ریز کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ کونسی چیز کس وقت کے لیے سنبھال کر رکھنی ہے۔ میرے پاس ایک ذاتی ٹیپ ہے جس میں اشفاق صاحب کی آواز محفوظ ہے۔ کوئی ڈسکشن تھی۔ ہماری ثقافت قسم کی۔ اس میں کافی بولے ہیں اور اچھا چنک ہے۔"

"تو پھر ہم کو بھی لائنوں پر ریکارڈ کرا دو۔"

"آپ ٹرانس کرپشن سے لیں مسعود صاحب، ان کے پاس خان صاحب کا دو گھنٹے کا پروگرام محفوظ ہے۔ ایک افسانہ پڑھا ہے انہوں نے اپنی آواز میں۔ اور میری اپلیکیشن کر ایسے نہیں پھینک دینا مسعود صاحب میں نے ایک کاپی ڈائرکٹ اسی لیے آپ کے نام بھیجی ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا میاں، یہ کوئی وقت ہے۔ تم بس ایک پروگرام کر دو اچھا سا۔ یادگار، ہمارا یار تھا اس کے لیے اتنا بھی نہ کر سکے تو پھر لعنت ہے ہم پر۔"

"آپ بے فکر رہیں جی ایک مرتبہ تو لوگوں کے آنسو نکل آئیں گے۔"

"شاباش لاہور سٹیشن کی روایت قائم رہنی چاہیے۔۔۔ اچھا بھئی۔"

"ایک منٹ سر۔۔ مسعود صاحب۔۔ ہیلو۔۔ ہیلو۔۔ ہاں جی۔۔ نیوز میں اشفاق صاحب کی خبر آ رہی ہے یا نہیں؟"

"آ رہی ہے۔ آنی کیوں نہیں تھی۔ یہ اس کا حق ہے۔ نیشنل نیوز بلیٹن میں آئے گی۔۔ جی ایم اثر اس کا یار ہے۔ اس نے بڑی اچھی سٹوری بنائی ہے۔ بہت رو رہا تھا بیچارہ۔"

"خان صاحب تو اس کے شاگرد بھی رہے ہیں شاید۔"

"شاگرد کیا، وہ بھی ٹھیک ہے، لیکن بڑے گہرے دوست تھے۔ قبلی۔ نہایت قریبی۔ اچھا بھئی۔"

"اچھا سر خدا حافظ۔"

پھر اکرم بٹ کو، ریاض محمود کو، ظہیر صدیقی کو اور تدبیر ملک کو پروگرام تیار کرنے کی بھرتی

پڑے گی۔ جب وقت کم ہو اور پروگرام زیادہ فیڈ کرنا ہو تو ہمیشہ مشکل پڑ جایا کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کافی پریشان ہوں گے اور لوگوں کی بے وقت موت پر ہم اسی طرح پریشان ہوا کرتے تھے۔ صوفی تبسم بیچارے سمن آباد سے آ جائیں گے۔ فیض صاحب اگر یہاں ہوئے تو وہ بھی چند جملے کہنے کے لیے ضرور آئیں گے۔ ندیم قاسمی چونکہ سمن آباد ہی میں رہتے ہیں اس لیے صوفی صاحب کو لانے والی گاڑی انہیں بھی ساتھ ہی لیتی آئے گی۔ اے حمید بھی سمن آباد رہتا ہے، لیکن جب وہ یہ خبر سنے گا تو دکھ سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ ریڈیو پر گفتگو کرنے پر لعنت بھیجتا ہوا آنے سے انکار کر دے گا اور پھر وہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرنے لگیں گے جب قدسیہ اور میں پہلی مرتبہ ان کے گھر پرانی میوہ منڈی کے قریب گئے تھے۔ بانو نے ریحانہ سے ان چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی بڑی تعریف کی تھی جن میں اے حمید نے ہمیں کشمیری چائے پلائی تھی اور اے حمید نے الماری سے ساری پیالیاں نکال کر انہیں اخباری کاغذوں میں لپیٹ کر بانو قدسیہ کے حوالے کر دی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا "بس بس اب بولیں نہ بالکل" اور بانو نے بھرائی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

آفتاب احمد کو جب ٹیلیفون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کے روئے گا اور پھر رات بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ ہو گا۔ محمد حسین کے فوت ہونے پر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی آرزو ہو گی کہ ٹی وی پر جو پروگرام ہو وہ قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جائے لیکن دوسرے لوگوں کو اس میں تامل ہو گا۔ اصل میں وہ اس تامل میں حق بجانب ہوں گے۔ ایک علاقائی ادیب یا علاقائی ٹی وی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنا مناسب بھی نہیں۔ اس سے ایک پریسیڈینٹ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے علاقوں کے لوگ تقاضا کریں گے کہ اشفاق نیشنل فگر تھا اس لیے اس کا پروگرام جائز طور پر قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جانا چاہیے۔ دوسرے لوگ جو ان سے اتفاق نہیں

کریں گے اپنی دلیل میں شدت اختیار نہیں کر سکیں ۔۔۔

کو شدت سے کنڈیم کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آخر فیصلہ یہ ہوگا کہ ٹوٹیکے والی خبروں کی تصویریں حسب میں ذرا سا حصہ اس پروگرام کا بھی دکھا دیا جائے جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد بھی میرے حامی ماہران میں اندر کری ڈوریں کانی دیر تک یہ کہتے پھریں گے۔ یہ سب اس ۔۔ حرامی کی شرارت ہے۔ جب وقت پڑتا تھا تو گیا وسنت بستہ سکرپٹ لینے اور ڈرامہ لکھوانے چلا جایا کرتا تھا اور اب انکاری ہو گیا ہے۔

اُردو بورڈ کے ملازمین بھی یہ خبر سُن کر سکتے میں آجائیں گے۔ ریاض کا افضل کا اور سُلطان صاحب کا بُرا حال ہوگا۔ شریعت دین غم زدہ ہوگا۔ لیکن اس کو فکر ہوگی کہ یہ خبر تمام اخباروں میں نمایاں جگہ پر لگ جائے۔ اس کے پاس چونکہ میری پاسپورٹ سائز کی بہت تصویریں مختلف پوزوں میں ہیں اس لیے وہ دفتر پہنچ کر اپنی الماری سے مختلف تصویریں نکالے گا اور ان کی پشت پر اپنی منحنی لکھائی میں اخباروں کے نام لکھے گا۔ اُردو اور انگریزی میں سانحہ جانکاہ کا مضمون بنا کر انہیں نفاست سے ٹائپ کرے گا اور اپنے پلے سے کرایہ لے کر پہلے یہ حافضل کے گھر جائے گا اور پھر وہ دونوں اخباروں کے دفتروں کے چکر لگائیں گے۔

امجد حسین کو فکر ہوگی کہ یہ خبر چھپنے کے اندر چھوٹی تصویر کے ساتھ فرنٹ پیج پر آئے۔ اگر ادریس وہاں ہوا تو وہ زور دے گا کہ نیوز کم از کم دو کالمی ہونی چاہیے۔ نور آرٹسٹ اگر اتفاق سے دفتر میں ہی ہوا تو وہ ادریس کی تائید کرے گا۔ شاہد بھی نیوز تیار کریں گے۔ یا نیوز نیا شریعت الدین اور افضل فراہم کریں گے۔ میٹر کمپوز ہو جائے گا۔ لیکن اسلام آباد سے اگر ایک ٹرنل کی ایک خبر آجانے پر مجبوراً میری خبر کو اخبار کے آخر میں دینا پڑے گا۔ آخری وقت میں میک اپ کے وقت پھر مشکل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ تیسری دنیا کی ایک خبر جو بیک پیج پر کیری اوور ہوئی ہوگی وہ میرے لیے وقت جگہ پر حق شفع کر دے گی اور امجد حسین جھلا کر اور مجبور ہو کر میری خبر کو اندر تیسرے صفحے پر لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہوگی تو پتوکی جھنگ ساہیوال مرز کنڈا، علمدار کے علی اور ملک وغیرہ کے لوگ کہیں گے: لو جی ایہہ وی ختم ہو گیا۔ بڑا سیانا بندہ سی نکیا یقین شاہ۔

دا روپ بھریا سی۔ اور بڑی بڑھیاں یہ خبر سُن کر کہیں گی: بابا یقین شاہ فوت ہو گیا اے ہُن ایہہ پروگرام کون کریا کرو؟

حیدر علی نمبر دار کہے گا: ہُن اسیں کی کریئے۔ ایہہ گورنمنٹ دے کم ایں چودھری مرضی ڈیوٹی لگا دیوے۔

ٹھیک اے نمبر دارا کم تے چلدے ای رہندے ایں۔ اُنج بڑا سیانا بابا سی۔

رات کو جب ٹی وی پر خبر نامہ میں یہ خبر نشر ہوگی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہوگا۔ بہت سے ناظرین آرزو مند ہوں گے کہ میرے کسی پُرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ خاص طور پر نکھار پروگرام کی جس میں مہمان امانت علی ہے اور میزبان میں ہوں۔ ٹیلی ویژن والوں کی اس کوتاہی پر ناظرین اپنے اپنے گھروں میں نکتہ چینی بھی کریں گے لیکن پھر دوسری باتوں میں اُلجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں جہاں لکھنے لکھانے اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا کام ہوتا ہے میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ لیکن اچھا انسان نہیں تھا۔

ٹی وی پر نیوز سُننے کے بعد کچھ لوگ گہری سوچ میں ڈوب جائیں گے کہ دیکھیں اب اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کس کو ملتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کی بیویاں کہیں گی: سب قسمت کی بات تو یہ ہے کہ یہ چانس آپ کو ملنا چاہیے۔ آخر آپ نے ساری عمر اُردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان سے محبت کی ہے۔

خاوند ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا۔ بیگم آج کل خدمت اور محبت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ سب کانٹیکٹس کی بات ہے۔ اب مرحوم کو اُردو سے کہاں محبت تھی اور اس نے کس طرح سے اس زبان کی خدمت کی تھی۔ یہ تو تعلقات کی بات ہے۔

بیوی کہے گی: لیکن ڈرامے بڑے اچھے لکھتا تھا اور باتیں بھی بڑی مزیدار کرتا تھا۔

بالکل ٹھیک ہے۔ میاں ایمانداری کے ساتھ جواب دے گا۔ اس کے ہم بھی معترف ہیں لیکن اس کے لیے اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کہاں تک جائز ہے؟ یہ سوال ہے جو معاشرے کے حاکمانِ وقت سے پوچھا جانا چاہیے۔ یہ سب دھاندلیاں ہیں بیوی اور اس دور میں سچے لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔

پھر بڑی دیر تک بڑے گھروں میں اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کا ذکر ہوتا رہے گا۔ کچھ ایسے لوگوں کے نام یاد کرنے کی کوششیں ہوں گی جن کے براہِ راست حفیظ پیرزادہ سے تعلقات ہوں۔ ایک آدھ ٹیلی فون پی آئی اے کے دفتر بھی ہوگا کہ صبح پہلے جہاز سے اسلام آباد کے لیے سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔

اس ننھی سی خبر سے گھر میں کہرام ہوگا۔ ادبی حلقوں میں مستقل تنقید ہوگی۔ ریڈیو سننے والے دیہاتی حلقوں میں غم ہوگا۔ دوستوں کے درمیان آئندہ کی فکر ہوگی۔ علمی حلقوں میں ہلچل اور منصوبہ بندی ہوگی۔ اُردو بورڈ کے ملازمین کو تشویش ہوگی پھر صبح ہوگی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لیے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔

شاہ عالمی میں ایک کراکری مرچنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھی دکاندار کے پاس جا کر کہے گا: "یار یہ دیکھا تم نے تلقین شاہ مر گیا بیچارہ۔"

"کب؟" ساتھی دکاندار بھونچکا ہو کر پوچھے گا۔

"تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا یہ دیکھو اس کی تصویر۔ ایک مرتبہ آئے نہیں تھے ہماری دکان پر سٹور کی چابی خریدنے وہ اور اس کی بیوی۔"

"وہ اس کی بیوی تھی نیلے سوٹ والی۔"

"ہاں وہ بھی ڈرامے لکھتی ہے۔ اس نے ٹیلی ویژن پر گھوڑے والا ڈرامہ لکھا تھا۔"

"وہ تو اس کا ڈرامہ تھا تلقین شاہ کا اپنا۔ اس کی بیوی کا دوسرا تھا جس میں ایک آدمی خفیہ طور پر دوسری شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ سال تک اس کے بیوی بچوں کو علم ہی نہیں ہوتا۔"

"بڑا ظلم ہوا یار، ابھی تو جوان ہی تھا، پچاس سال کا بھی نہیں تھا۔"

"پاکستان میں اتنی عمر ہی ہوتی ہے شیخ صاحب، پچاس سال کا آدمی دوسرے کنارے پر لگ جاتا ہے۔ کوئی قسمت والا ہی دس سال اُوپر گزارتا ہے۔"

"پہلے زمانے میں عمریں کافی لمبی ہوتی تھیں۔"

"اس زمانے کی خوراکیں بھی تو دیکھو خالص گھی، خالص آٹا، دودھ دہی لسی، سادہ غذا، شیر جوان جیسے لوگ ہوا کرتے تھے کیا مرد کیا عورتیں۔"

"ولایت سے لوگ اب بھی لال سُرخ ہوتے ہیں۔"

"وہاں بے فکری ہے بھا جی۔ کوئی بے ایمانی نہیں، رشوت نہیں، بک بک نہیں، سب کام سرکار کرتی ہے۔ لال سُرخ تو آپ ہی ہونا ہوا۔"

"وہ میم پھر نہیں آئی پُرانے سیٹ خریدنے والی۔"

"کمینی ہے سالی آئی تھی ٹوٹی ہوئی پیالی لے کر کہنے لگی تم نے ٹوٹی ہوئی پیالی رکھ دی پیکنگ میں اس کو تبدیل کرو۔"

"تم نے انکار کر دینا تھا۔"

"کوئی دیسی عورت ہوتی تو میں انکار بھی کر دیتا۔ ہمارے ملک کا سوال تھا۔ میں نے کہا لاؤ میم صاحب پیالی تبدیل کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے سارے دکاندار ایسے نہیں ہوتے ہم لوگ بڑے ہی مہمان نواز ہیں۔"

"بڑے مہمان تھے بھئی سبحانی کے لڑکے کی شادی پر کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے لا کر۔"

"بلیک کی ہی تو برکت ہے شیخ صاحب ایک مال، دوسرے عزت، تیسرے تعلقات۔"

"ہم نے بلیک نہ کر کے کیا بنا لیا۔"

"کچھ نہیں جی کچھ نہیں، ایسے ہی مر جائیں گے دس دس جوڑتے۔"

اس کے چند گھنٹوں بعد دوستوں کے درمیان ٹیلی فون پر باتیں ہوں گی۔ مجھے یاد کیا جائے گا۔ ہر کوئی مجھ سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے گا اور دوسرے کو خفیف کرے گا کہ باوجود مجھے اچھی طرح سے جاننے کے وہ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ تابش کے بال اور بکھر جائیں گے۔ آنکھیں اور خاموش ہو جائیں گی۔ زبان بالکل گنگ ہوگی۔ ریاض محمود اپنا زرعی پروگرام ریکارڈ کرنے کے لیے سٹوڈیو میں موجود ہوگا اور انجینئروں کی خوشامد کر رہا ہوگا۔ تلقین شاہ لکھنے والے کا پینسٹھ ٹی سیٹ چائنے میں سے تین پیالیاں نکال کر - کے ٹو سگریٹ پی رہے ہوں گے اور اُردو بورڈ کا عملہ پریشان ہوگا کہ اگلی تنخواہ کے لیے بلوں پر کون دستخط کرے گا۔ پھر ان میں سے دو تین مل کر اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بینک جائیں گے اور وہاں سے فارم لیں گے کہ ڈرائنگ اور ڈسبرسنگ آفیسر کے فوت ہو جانے کی صورت میں منسٹری کے سیکرٹری کے دستخط کیے جائیں اور تنخواہ نکالی جا سکے پھر اُردو

بورڈ کے ملازمین شریف الدین کو شام کی گاڑی سے اسلام آباد روانہ کریں گے تاکہ وہ ڈاکٹر اجمل کے پے سی ون سگنیچر لا سکے اور بینک سے تنخواہ ڈرا کی جا سکے۔ بیچاروں کو کافی تردد کرنا پڑے گا لیکن شریف الدین کی حکمتِ عملی سے مشکل راہیں آسان ہو جائیں گی اور ان کو وقت پر تنخواہ ملنے کی اُمید بندھ جائے گی۔ اس اُمید بندھنے کے بعد جب انہیں اطمینان ہو جائے گا تو وہ مجھے یاد کریں گے فضلِ ربانی، محمد علی سلطان صاحب، طاہر اور بابو خان دل کھول کر مجھے یاد کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اپنے ساتھیوں کے خوف سے کچھ تعریف نہ کر سکیں گے کیونکہ ان پر مرحوم ڈائریکٹر کے چمچہ ہونے کا الزام لگ جائے گا اور نئے آنے والے ڈائریکٹر سے ان کی شکایت ہو جائے گی کہ یہ پرانے ڈائریکٹر کو دل سے چاہتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فن کار اور شوبزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی چوک سے لے کر میو ہسپتال کے چوک تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچوان گھوڑوں کو ڈنڈے اور قریبی کوچوان کو ٹھیٹھ لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا، بجلی کا بل آتا رہے گا۔ فقیر سوتا رہے گا۔ چوہے ٹائی مارتے بیٹھے استاد پڑھاتے رہیں گے۔ ریکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ قوال گاتے رہیں گے۔ رنڈی ناچتی رہے گی۔ ڈاکیہ چلتا رہے گا۔ سوئی گیس نکلتی رہے گی۔ تقریریں ہوتی رہیں گی۔ خبریں لکھی جاتی رہیں گی۔ سوئی میں دھاگہ پڑتا رہے گا۔ قتل ہوتا رہے گا۔ زچہ سسکتی رہے گی۔ بچہ پیدا ہوتا رہے گا۔

برانڈرتھ روڈ کی دکانوں پر نئے مکان بنانے والی بیگمات دیسی ٹونٹیوں اور نلکوں کے نمونے دیکھ رہی ہوں گی۔ ان کے پرسوں میں سو سو کے نوٹ ہوں گے۔ ان کے جسم بڑے بڑے اور سینے موٹے موٹے ہوں گے اور ان کے خاوند اپنے اپنے مرکزوں پر روپے بنا رہے ہوں گے۔ کرشن نگر کی لڑکی نے ساری رات لگا کر باریک باریک لفظوں کی کشیدہ کاری سے ایک محبت نامہ لکھا ہوگا اور ہسٹری کی کتاب میں رکھ کر برقعہ اوڑھ کر اسے پوسٹ کرنے جا رہی ہوگی۔ شاید ان کی لڑکی ٹیلیفون پر اپنے محبوب سے گفتگو کر رہی ہوگی اور آپریٹر درمیان میں سن رہا ہوگا۔ مرچ کے باہر بڈھے گھوڑوں کے نعل لگ رہے ہوں گے اور گھوڑا ہسپتال میں نو عمر بچھڑے آختہ کیے جا رہے ہوں گے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی لڑکیاں تاریک محلوں میں جا کر چھلے اور نرودھ مفت تقسیم کر رہی ہوں گی اور رجسٹر میں اندراج کر رہی ہوں گی۔ ان میں سے کسی ایک کی پچھلے مہینے کی تنخواہ کا بل بابو نے نہیں بنایا ہوگا اور ان کے چھوٹے بھائی کو سکول سے اٹھا کر خرادیے کے پاس بٹھا دیا ہوگا۔ بڈھے عرضی نویس کا پیشاب بند ہوگا اور اس کے پوتے اسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لا رہے ہوں گے۔ خراسی ناول کی گٹھیوں میں سوراخ کر کے دھاگے پرو رہے ہوں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے مائیں لڑکیوں سے پوچھ رہی ہوں گی کہ ان کے لیے کون سی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ چلہ کاٹنے والے دعائے حزب البحر پڑھ کر اپنے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اوپر کی طرف اٹھا رہے ہوں گے۔ لڈو بناتا ہوا حلوائی اٹھ کر سامنے والی نالی پر پیشاب کر رہا ہوگا۔ لبرٹی مارکیٹ میں دو نوجوان ایک لڑکی کے پیچھے گھوم رہے ہوں گے۔ دلہنوں کے جہیز سے آج ایک اجنبی مہک بھی اٹھ رہی ہوگی۔ نیچے گلی میں کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں گے اور قریبی مکان میں ایک ماں اپنے بچے کو پیٹ رہی ہوگی جس کا خاوند ایک اور عورت کے ساتھ جہانگیر کے مقبرے کی سیر کر رہا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں کھلے پائنچوں کی شلواریں پہن کر لڑکوں سے یونین کی باتوں میں مصروف ہوں گی اور چیف سیکرٹری لاٹ صاحب کے دفتر میں اپنی ریٹائرمنٹ کے خوف سے پریشان ہو رہا ہوگا۔ کچھ جمعدار ان کے باتھ روم میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ کچھ جیپس کے غسل خانوں میں نہا رہے ہوں گے۔ کچھ مسجدوں کے سقاووں میں پاک ہو رہے ہوں گے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک ادیب اور فن کار نے ساری عمر پھوٹی پھوٹی کر کے اپنی شہرت اور نیک نامی کا تالاب بھرا ہوگا اور دن رات ایک کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہوگا اور اس ایک چھوٹے سے حادثے سے وہ سارے دلوں سے نکل گیا ہوگا۔ ہر یاد سے محو ہو گیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے جنم دیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے سچ مچ یاد کیا تھا اور اس دل سے بھی جس نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے دلی محبت کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز اتوار کے دن حلقۂ اربابِ ذوق ادبی میں میرے لیے ایک قراردادِ تعزیت پاس کی جائے گی۔ عین اسی وقت حلقۂ اربابِ ذوق سیاسی میں بھی ایک قراردادِ تعزیت پیش کی جائے گی۔ سب متفقہ طور پر اسے منظور کریں گے لیکن اس کے آخری فقرے پر بحث

کا آغاز ہوگا کہ حلقہ اربابِ ذوق کا یہ اجلاس حکومت سے پُرزور اپیل کرتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین کے لیے کسی وظیفے کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حاضرین دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک اس کے حق میں ہوگا کہ یہ فقرہ رہنے دیا جائے کیونکہ مرحوم ایک صاحبِ حیثیت ادیب تھا اور اس کی اپنی ذاتی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں موجود ہے۔ پھر کوٹھی کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ کچھ اسے دو کنال کی بتائیں گے کچھ تین کنال کی۔ کچھ دبی زبان میں کہیں گے کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی خاتون ہے وہ نوکری بھی کر سکتی ہے اور لکھنے لکھانے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ ریڈیو آنے جانے والے ایک ادیب سامعین کو بتائیں گے کہ بالکل ذاتی آمدنی ریڈیو ٹی وی سے دو ہزار سے کم نہیں۔ میرے ایک دُور کے رشتہ دار ادیب اعلان کریں گے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا فرد تھا اور اس کا اپنے باپ کی جائیداد میں بڑا حصہ ہے جو اسے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پھر کوئی صاحب بتائیں گے کہ ولاتا کو بورڈ سے گریجویٹی بھی ملے گی۔ سٹیٹ لائف انشورنس کے ایک ادب نواز کلرک جو حلقے کی میٹنگوں میں باقاعدگی سے آتے ہیں بتلائیں گے کہ اس نے اپنے تینوں بچوں کی انشورنس بھی کرا رکھی تھی۔ گو ان کی رقم بیس بیس ہزار سے زائد نہیں۔ طویل بحث کے بعد اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ ہوگا کہ آخری فقرہ کاٹ دیا جائے؛ چنانچہ آخری فقرہ کٹ جائے گا۔ پھر مجھ پر آٹھ منٹ کے تین مقالے پڑھے جائیں گے اور آخری مضمون میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ میں اصل پنجابی زبان کا ایک ادیب اور شاعر تھا اور مجھے پنجاب سے اور اس کی ثقافت سے بے انتہا پیار تھا۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد دن ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونے لگیں گے اور میری پہلی برسی آ جائے گی۔ یہ کشور ناہید کے لیے آزمائش کی گھڑی ہوگی کیونکہ ہال کی ڈیٹس پہلے سے بک ہو چکی ہوں گی اور میری برسی کے روز آل پاکستان ٹیکنیکل سکولز کے ہنرمند طلبا کا تقریری مقابلہ ہوگا۔ کشور کو پاکستان سنٹر میں میری برسی نہ منا سکنے کا دلی افسوس ہوگا اور وہ رات گئے تک یوسف کامران کی موجودگی میں کفِ افسوس ملتی رہے گی۔ لوگ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس کو ایک ایشو بنا لیں گے اور وہ لوگ جو عمر بھر مجھے جائز طور پر ناپسند کرتے رہے تھے وہ بھی کشور ناہید کے برخلاف دھڑے میں شامل ہو جائیں گے۔ مجھ سے محبت کی بنا پر نہیں کشور کو ذلیل کرنے کی غرض

سے پھر ذوالفقار تابش کی کوششوں سے گلڈ کے بڑے کمرے میں یہ تقریب منائی جائے گی اور عتیق اللہ، شکور بیدل، ریاض محمود، غلام قادر، سلیم افراز مجھ پر مضمون پڑھیں گے۔

کس قدر دکھ کی بات ہے کہ زمانہ ہم جیسے عظیم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ہم کو بھلا دے گا۔ میں ہوا، نپولین ہوا، شہنشاہ جہانگیر ہوا، الفرج رونی ہوا، ماوراء النہر کے علماء ہوئے، مصر کا ناصر ہوا، عبدالرحمن چغتائی ہوا کسی کو بھی ہماری ضرورت نہ رہے گی اور اتنے بڑے خلا پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح بھر جائیں گے۔ ہماری اتنی بڑی قربانیوں کا کہ ہم فوت ہوئے اور فوت ہونا کوئی آسان کام نہیں لوگ یہ صلہ دیں گے۔ افسوس زمانہ کس قدر بے وفا ہے اور کس درجہ فراموش کار ہے۔

"اوئے مرنا ہے گدھے!" میں نے اپنے سینے پر لیڈر کی سوٹی کی روک محسوس کی اور آنکھیں کھول کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کدھر چلے جا رہے تھے؟" اس نے رُک کر پوچھا۔ "اگر میں بھاگ کر سوٹی آگے نہ کرتا تو اس کھڈ میں جا گرتے۔"

"میں سوچ رہا تھا۔" میں نے خفیف ہو کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"زندگی اور زندگی کی خوبصورتیوں کے بارے میں۔"

"اور چلے جا رہے تھے موت کی طرف۔"

مسعود نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا ۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

پھر جیسے کوہستان نے ممتاز مفتی کو اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ اچانک رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ رُک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی بھوری ڈاڑھی کو خجالت کے ساتھ کھجا کر کہا: "اب تم نیچے آؤ۔"

"یہ سالا تو مر جائے گا تمہارے نیچے آ کر خان۔" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "کوئی اور خدمت بتاؤ۔" اس نے کوئی اور خدمت نہ بتائی تو مفتی بولا: "ہم شاید اس کا مطلب نہیں سمجھے یہ کچھ اور

چاہتا ہے۔"

"اور کیا چاہے گا۔" مسعود قہقہہ مار کر بولا۔ "اب تم نیچے کا مطلب صاف ہے یہ کون سی فارسی بول رہا ہے۔"

"کیا بات ہے خان؟" عماد نے سنجیدگی سے پوچھا تو خان خاموش رہا۔

مُفتی نے کہا: "ٹھہرو یار میں نیچے ہی اُترتا ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ یہ کیا چاہتا ہے۔"

مُفتی کوہستانی کی پیٹھ پر سے پھسل کر نیچے کھڑا ہُوا تو کوہستانی منہ زور بچھڑے کی طرح ترائی کی طرف بھاگ گیا اور پچیس تیس فٹ نیچے اُتر کر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔

"لو بھئی حد ہوگئی۔" اعظمی نے کہا: "یہ سالا ہم میں سے پہلا آدمی ہے جس کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔"

"واقعی یار۔" لیڈر غمزدہ ہو کر بولا۔ "ہم میں سے کسی نے پیشاب ہی نہیں کیا۔ حد ہوگئی۔"

"لیکن مُفتی جی تو ہر آدھ گھنٹہ بعد پیشاب کیا کرتے ہیں۔" عماد نے کہا۔

"آج کچھ یاد ہی نہیں رہا۔" مُفتی نے دماغ پر زور دے کر کہا: "آج کا دن تو ایسے ہی گزر گیا۔"

"چل چل۔ بھاگ بھاگ۔" لیڈر نے چھڑی گھما کر کہا: "ابھی جا اپنی سواری کے پیچھے۔"

"نہ نہ خدا کے لیے یہ تیس فٹ نیچے اُتر گیا تو پھر اسے واپس کون لائے گا۔ ایسے ہی چلتے وہ جھیل پر پہنچ کر کرالیں گے۔"

"ویسے جھیل ابھی کتنی دُور ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو سب نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا "ہنوز دلّی دُور است!"

کوہستانی پیشاب کر کے واپس لوٹ آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھلا ہُوا آزاربند تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ وٹوانی کر رہا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ دونوں پاؤں چوڑائی کے رُخ کھول کر پتھروں پر رکھتا تھا تاکہ نجاست سے محفوظ رہے اور اس کے آزاربند میں کوئی چھینٹا نہ لگے۔ کوہستانی کی شلوار پر بکری کے دودھ کے اور اس کے ٹخنے سے بہنے والے خون کے نشان تھے۔ اس کے پھٹے ہوئے پائینچے سے جسے اس نے گانٹھ دے رکھی تھی بکری کی تین چار مینگنیاں چمٹی ہوئی تھیں غلاظت اور گندگی سے شلوار کا رنگ مٹیالا ہو رہا تھا۔ گھاٹی سے اُوپر آکر وہ کڑک مرغی کی طرح مُفتی کے

"ہاں ہاں خان۔" مُفتی نے کہا: "پہلے تم اپنا کام ختم کرلو پھر اُٹھانا۔"

"کام تو ختم ہوگیا صیب۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"نہیں یار ابھی کہاں ختم ہُوا ہے۔" مُفتی نے کہا: "ابھی تو آدھا ختم ہُوا ہے۔"

"بیٹھو بیٹھو۔" اس نے خشمگیں لہجے میں کہا: "ابھی اور اُوپر جانا ہے۔"

مُفتی ڈر کے مارے کچھ کہے بغیر پھر اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور کوہستانی مزے سے وٹوانی کرتا ہُوا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مُفتی اس کی پیٹھ پر سوار تھا اور اس نے نظریں اُوپر آسمان کی طرف اٹھا رکھی تھیں۔ اعظمی نے کہا: "کوئی بات نہیں مُفتی جی نگاہیں نیچی کرلو۔ کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔" مُفتی شرمندہ سا ہوگیا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر سر ہلانے لگا۔ کوہستانی دونوں ہاتھوں سے مصروف ایک کھڑی چٹان پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے تار پر لیڈی چلا کرتی ہے۔ اس کے کندھوں پر مُفتی خوف، شرمندگی اور اکتاہٹ کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ اب کوہستانی اُسے نیچے اُتار ہی دے تو اچھا ہے۔ کئی مرتبہ اُوپر چڑھا ہُوا انسان نیچے نہ اُتر سکنے کے خوف سے اور اُوپر چڑھنے لگتا ہے جو اور اُوپر نہیں چڑھ سکتا وہ سربلندی کے ساتھ چپک کر وقت گزارنے لگتا ہے اور اس کی ساری عمر اسی دہشت میں گزرنے لگتی ہے کہ ابھی اسی وقت ایک جھکڑ آئے گا اور اسے بلندی کے سینے سے چمٹے ہوئے پاکر نوچے گا۔ ہواؤں میں اُچھالے گا اور پھر گہری اور اندھیری غاروں میں گرادے گا۔ سربلندیوں کے ساتھ چپکے ہوئے لوگ جھکڑوں کے خوف سے راتوں کو بھی نہیں سو سکتے ان کی ساری عمر جاگتے رہنے اور چپکے رہنے میں بسر ہو جاتی ہے۔ پست لوگ جو عام طور پر زمین پر رہتے ہیں اور زمینوں پر چلنے میں جھکڑوں سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا اور پست تھا اور زمین پر چلتا تھا، اس وقت میری سب سے بڑی لگژری بگولوں کے پیچھے بھاگنا تھا۔ اپنی جوتی میں پیشاب کر کے اگر بگولے کے اندر پھینکیں تو کھنکھناتے سکوں کی بڑی اُونچی آواز آتی ہے۔ یہ آواز سننے کے لیے ہم بگولوں کے پیچھے میلوں دُور بھاگا کرتے تھے۔ اس وقت ہمیں روپے کی طلب نہ تھی۔ اس کی جھنکار سے لطف اندوز ہونے کی آرزو تھی جس طرح موسیقی کا رسیا لفظوں سے آشنا نہیں ہوتا لے اور سُر میں ڈوبا رہتا ہے۔

مسعود بڑی دیر سے کوہستانی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بایاں کندھا نیچے جھکا کر کہا: "مُفتی جی یہ امرود پرستی کا سلسلہ کب سے شروع ہُوا ہوگا؟"

"یہ پرانا سلسلہ ہے چن جی" مُفتی نے اپنی نگاہیں آسمان سے ہٹائیں اور انہیں مسعود کے چہرے پر مرکوز کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کا رُخ تبدیل تو کیا۔

"مَیں سمجھا نہیں امرود پرستی" عماد نے کہا "اگر یہ شاعری والا قصہ ہے تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر اس سے تمہاری مراد لواطت سے ہے تو مَیں مُفتی جی کا بیان شوق سے سُننے کے لیے تیار ہوں۔"

"دیکھا دیکھا" اعظمی نے آنکھیں نچا کر کہا "اس انجینئر کی سوچ ملاحظہ فرمائی آپ نے جس سرکٹ میں ٹرانسفرنٹ نہ ہو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں جناب کو۔"

"خدا کے لیے" مسعود نے چڑ کر کہا "تو ہر معاملے میں فقرے بازی نہ کیا کر اعظمی۔"

"تو اور کیا بازی کیا کروں" اعظمی تڑپ کر بولا۔ اس پر لیڈر زور سے ہنسا اور ہمیں اپنا ساتھی نہ پا کر کھٹ سے پہلو بدل گیا۔

"تو دھرم سالے کس سن میں آیا تھا مُفتی؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"۱۹۴۵ء میں۔"

"۴۵ء میں" لیڈر نے حیران ہو کر کہا "اس وقت تو مَیں بھی سکول میں پڑھتا تھا تُو نے مجھے دیکھا کیوں نہیں؟"

مُفتی نے کہا: "وہاں سینکڑوں طالب علم تھے۔ سال بہ سال اور آ جاتے تھے مَیں کس کس کو یاد رکھتا بھلا۔"

"واہ بھئی واہ" لیڈر ناراض ہو کر بولا "مَیں تو اپنے سکول کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا۔ مجھے کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔"

"مجھے خوبصورت لڑکوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی" مفتی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"لے بھئی" اعظمی نے سر ہلا کر کہا۔ یہ جو لیڈر نے کھٹ سے پہلو بدلا تھا اور ہم اسے پہلو بدلنا سمجھ رہے تھے دراصل موضوع کو اپنی طرف گھیر کے لانا تھا۔"

"تم کو کس نے بتایا کہ تم خوبصورت تھے؟" عماد نے سنجیدگی سے پُوچھا۔

"دھرم سالے کے انگریز ایس پی نے" لیڈر نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

"وہ مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔"

"لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہُوا؟"

"اس نے مجھ کو اپنی کوٹھی میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔"

"شاید وہ تم سے برآمدے میں جھاڑو دلوانا چاہتا ہو؟"

"بالکل نہیں۔ اس نے مجھے آنکھ بھی ماری تھی۔"

"انگریز لوگ تو آنکھ مارنے کے یونہی عادی ہوتے تھے۔ ان کا آنکھ مارنا دیسی آنکھ مارنا تو نہیں تھا۔"

"وہ ہمارے سکول بھی آیا کرتا تھا۔"

"انگریز کے زمانے میں کوئی بھی گورا کسی وقت بھی سکول کا معائنہ کر سکتا تھا۔"

"وہ سکول کے اندر تھوڑی آتا تھا" لیڈر نے چڑ کر کہا "وہ تو چھٹی کے وقت گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہارے لیے گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا؟"

"وہ اس لیے کہ جب مَیں سکول سے نکلتا تو ہولے ہولے میرے پیچھے چلنے لگتا۔"

"شاید وہ کسی تفتیش کے سلسلے میں وہاں آتا ہو اور اس کا تم پر شک ہو؟"

"مجھ پر کیا شک ہو سکتا تھا بھلا۔ مَیں تو اس وقت ساتویں میں پڑھتا تھا۔"

"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تمہارے والد مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔"

"مسلم لیگ کا ایس پی سے کیا تعلق؟"

"واہ۔ اُس زمانے میں ہر سیاسی آدمی اور اس کے بچے پر انگریز افسر کو شک ہوتا تھا۔"

"نہیں نہیں بکواس" لیڈر نے جھلا کر کہا "وہ مجھ پر عاشق تھا۔"

"اوہ! لیکن کچھ پتہ بھی چلے کہ اس کے عشق کا طریقۂ واردات کیا تھا؟"

"بس بس" اعظمی نے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا "زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ہر حال میں لیڈر کے حال پر نگاہ رکھنی ہے اس کے ماضی پر نہیں۔"

مفتی نے بڑے شریفانہ انداز میں کہا: "یارو تم تو لیڈر کا سر ہی صیب رہے ہو۔ جب اس نے کہہ دیا ہے کہ انگریز اس پر عاشق تھا تو تم تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ہاں ہمارے لیے اس سے بڑا فخر کا مقام اور کون سا ہو سکتا ہے کہ ہمارے لیڈر پر انگریز حکمران عاشق رہے ہیں۔" اعظمی نے منہ پچکا کر کہا۔

"دیکھو دیکھو مفتی،" مسعود چیخا، "یہ اعظمی جان بوجھ کر جمع کا صیغہ استعمال کر رہا ہے۔"

عماد ابھی تک اس معاملے میں سنجیدہ تھا اور بات کی تہہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا رک کر اپنا چہرہ لیڈر کی طرف پھیرا اور پوچھا: "اس ڈی ایس پی کا نام کیا تھا؟"

"ڈی ایس پی نہیں حرامی ایس پی تھا۔" لیڈر نے تنک کر کہا۔

"دیکھا دیکھا،" اعظمی دکھ بھرے لہجے میں بولا، "یہ جان بوجھ کر لیڈر کا مرتبہ کم کر رہا ہے۔ یارو تا ایس پی کو ڈی ایس پی بتا کر لیڈر کی بے عزتی کر رہا ہے۔"

اس پر ہم سب نے یک زبان ہو کر احتجاج کیا تو عماد نے معافی مانگ لی اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اس کا مقصد لیڈر کی تحقیر کرنا نہیں تھا بلکہ وہ بھول گیا تھا کہ ایس پی تھا یا ڈی ایس پی۔

مفتی نے کہا: "خیر یار کوئی بات نہیں۔ ایس پی ہو یا ڈی ایس پی لیکن تھا انگریز اور ایک دیسی بچے کے والدین کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ ان کے صاحبزادے پر ایک انگریز عاشق ہے۔"

مفتی کی یہ بات سن کر لیڈر کو قدرے سکون ہوا اور وہ سر اوپر کر کے چلنے لگا۔

کوہستانی نے ڈھیلہ پرے پھینک کر ازار بند باندھتے ہوئے کہا: "یہ انگریز بچہ حرامی تھا صیب۔"

"اے لو، خان سب سمجھ گیا ہے،" اعظمی نے کہا: "کیوں خان سب سمجھ رہا ناں جو کچھ ہمارے لیڈر کے ساتھ ہوا؟"

"کچھ سمجھا صیب کچھ نہیں سمجھا لیکن انگریز بچہ حرامی تھا۔"

"تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی؟" مسعود نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں صیب لیکن وہ بڑا پکا حرامی تھا۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟" عماد نے پوچھا۔

"مجھے میرے والد سے بتایا صیب۔"

"تمہارے والد کو کیسے علم ہوا؟"

"بس ہو گیا صیب۔ علم تو ہو گیا میرے باپ کو سب معلوم تھا۔"

"کیا کرتا تھا تمہارا باپ؟"

"کیا کرے گا صیب۔ کوہستان میں کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ پتھر ہی پتھر ہے۔"

"پھر بھی آخر،" لیڈر نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "کوئی کام تو کرتا ہو گا۔"

"بس ایسا ہی کام کرتا تھا جیسا ہم کرتا ہے۔"

"تم کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں صیب ہم کیا کرے گا۔ ہمارے پاس کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔"

"تم لوگ کھیتی باڑی نہیں کرتے؟" لیڈر نے پوچھا۔

کوہستانی نے خشمگیں نگاہوں سے لیڈر کی طرف دیکھا اور پھر چلنے لگا۔

"عجیب آدمی ہے۔ میری بات کا جواب ہی نہیں۔" لیڈر شرمندہ ہو کر بولا۔

"آہستہ بات کرو،" اعظمی نے کہا: "اس کے ہاتھ میں ڈھیلا ہے۔"

"وہ تو اس نے کب کا پھینک دیا،" مفتی نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا اور پھر کوہستانی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا: "کیا عمر ہو گی تمہاری خان؟"

"پتہ نہیں صیب۔ ساٹھ اوپر چھ سات سال ہو گی۔"

"شرم کرو مفتی،" اعظمی نے کہا: "اپنے سے پانچ سال چھوٹے بچے پر سواری کر رہا ہے۔"

"اترو۔ اترو۔ اترو،" ہم سب گیدڑوں کی طرح کورس میں چلانے لگے اور کوہستانی حیران ہو کر پوچھنے لگا: "کیا بات ہے صیب ہمارا عمر میں غلطی ہو گیا؟"

"نہیں خان نہیں۔ کوئی غلطی نہیں،" مسعود نے کہا: "تمہاری کوئی غلطی نہیں ہماری غلطی ہے۔ ہم زبردستی تمہاری پیٹھ پر سوار ہے، حالانکہ ہم کو تمہارا بوجھ اٹھانا چاہیے۔"

کوہستانی بیچارا حیران و پریشان راستے میں کھڑا تھا اور مفتی بڑی شرافت کے ساتھ اس کی پیٹھ سے پھسل کر نیچے اتر رہا تھا۔ مفتی کے اتر جانے کے بعد لیڈر نے اپنا میوریک کوہستانی کی

پیٹھ پر لاد دیا اور کہا: "یہ اٹھا لو۔ اس کا بوجھ کم ہے۔"

"یعنی اس کی پیٹھ پر کچھ نہ کچھ لادنا ضروری ہے۔" اعظمی نے مصنوعی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور اپنا کیمرہ اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔

ہم ابھی دس بارہ قدم ہی اوپر چڑھے ہوں گے کہ مسعود نے بڑی محبت کے ساتھ کہا: "یار لیڈر! تمہارا ایس پی جوان تھا یا ادھیڑ عمر کا؟"

"جوان ہی تھا۔" لیڈر نے کہا: "چالیس پینتالیس کا ہوگا۔"

"پینتالیس برس کا آدمی جوان ہوتا ہے گدھے؟" عماد نے پوچھا۔

"بھئی وہ انگریز تھا عماد۔" مفتی جی نے کہا: "انگریز تو پینتالیس برس کی عمر میں جوانی چڑھتا ہے۔ وہ تو اس کا پیک پیریڈ ہوتا ہے۔"

"نہیں مفتی جی میں نہیں مانتا۔" مسعود نے کہا: "انگریز ہو یا دیسی پینتالیس کے بعد اترنے کا سفر شروع کر دیتا ہے۔"

"اس نے پھر انگریز دیکھے ہی نہیں۔" لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا: "اس کے گال تو ایسے تھے جیسے پکے ہوئے آڑو۔"

اعظمی جو ان سب کی باتیں غور سے سن رہا تھا سر جھٹک کر بولا: "اس لیڈر کو جوتے مارو سالے کو کیا خوش فہمی سے اپنے صاحب کا ذکر کر رہا ہے۔ حالانکہ مسعود اس کے ساتھ بڑی صفائی سے ہاتھ کر گیا ہے۔"

"کیا ہاتھ کیا ہے اس نے میرے ساتھ؟" لیڈر نے غصے سے پوچھا۔

"سنا نہیں تم نے؟" اعظمی نے کہا: "اس نے ایس پی کو پھر ڈی ایس پی کہا اور جان بوجھ کر کہا۔"

"کیوں مسعود؟" لیڈر نے ڈانٹ کر پوچھا: "یہ سچ کہتا ہے؟"

"بھئی مجھے یاد نہیں اگر میں نے..."

اعظمی نے بات کاٹ کر کہا: "لو ابھی ایک منٹ پہلے کی کہی ہوئی بات یاد نہیں۔ بڑا مکار ہے بھئی تو۔ خدا کی پناہ۔ کہہ تو اپنے باپ کو حاضر ناظر جان کر کہ تو نے ڈی ایس پی نہیں کہا؟"

مسعود نے مسکرا کر کہا: "میں نے جان بوجھ کر نہیں کہا سہواً میرے منہ سے ڈی ایس پی نکل گیا ہو تو

اس کی قسم نہیں کھاتا۔"

"اور سہواً تیرے منہ سے ایس پی کیوں نہ نکلا؟" مفتی نے پوچھا۔

"وہ تو اس کے منہ سے کبھی نہیں نکلے گا۔" اعظمی نے کہا: "بے عزتی جو مقصود ہے لیڈر کی۔ اس کو مار لیڈر! اس نے جان بوجھ کر اس کا رتبہ گرایا ہے۔"

"اس کا رتبہ کون گرا سکتا ہے۔" لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا: "وہ تو آئی جی پولیس ہو کر ریٹائر ہوا تھا۔"

"آئے ہائے اسے ریٹائر ہوتے بھی دیکھ لیا بڈھے کو۔" اعظمی نے شوشہ چھوڑا۔

"میں نے تو بہت دیکھا۔" لیڈر نے کہا: "یہاں آ کر خبر سنی تھی پاکستان میں... لیکن وہ بڈھا کب تھا۔" اس نے اپنی سوٹی زور سے اعظمی کے بازو پر ماری اور ہنس کر پرے ہو گیا۔

عماد نے زور کی ہانک لگائی اور کہا: "شاہ جی اب کہاں ہو اس وقت..."

میں نے کہا: "کہیں نہیں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"باہر کے سفر میں تو ہمارے ساتھ ہو شاہ جی۔" مفتی نے کہا: "لیکن اندر کے سفر میں کہاں تک پہنچ گئے ہو؟"

"اندر کے سفر میں؟" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا: "کچھ خاص دور نہیں اپنے پروفوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کس کے بارے میں؟" اعظمی نے پوچھا۔

"پروفوں کے بارے میں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا: "جب میں دفتر سے چھٹی لے کر ادھر آ رہا تھا تو میری میز پر تاریخ فیروز شاہی کے پروف آ رہے تھے۔"

"یہ تاریخ فیروز شاہی کیا چیز ہے؟" عماد کی تاریخی رگ پھڑکی۔

میں نے کہا: "تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے اور ہم نے حال ہی میں فارسی سے اس کا اردو ترجمہ کروایا ہے۔ یہ تاریخ بلبن کے عہد حکومت سے ۱۲۶۶ء سے شروع ہوتا ہے سلطان فیروز شاہ کے ابتدائی دور تک یعنی ۱۳۵۸ء تک کے زمانے پر محیط ہے گویا یہ بانوے سال کی مدت ہے جس کے حالات اور واقعات کو ضیاء الدین برنی ایک ہم عصر کی

حیثیت سے گواہی دیتا ہے۔"

"میں نے تو نہیں دیکھی یہ تاریخ۔" عماد نے سر ہلا کر کہا۔ "حالانکہ پُرانی پُرانی سب تاریخیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔"

"آپ نے غور نہیں فرمایا۔" اعظمی نے کہا۔ "شاہ صاحب بتا رہے تھے کہ یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے اور فارسی بڑے بڑے حکیموں کے قابو میں نہیں آتی۔ آپ تو پھر سلطنتِ خداداد کے ایک خداداد قسم کے انجینئر ہیں۔"

"لیکن اس وقت اور ایسے خوشگوار موسم میں پروفوں کا یاد آنا کوئی صحت مند بات نہیں۔" مسعود نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اصل میں آپ ابھی جو باتیں کر رہے تھے امرود پرستی اور ڈی ایس پی وغیرہ کی ان سے میرا خیال ادھر منتقل ہو گیا ہے۔"

"دیکھا دیکھا۔" اعظمی چلایا۔ "شاہ صاحب بھی اس کرڈی ایس پی میں مبتلا رہے ہیں۔"

"ان سب کو بکنے دو اعظمی۔" لیڈر نے کہا۔ "یہ جلتے ہیں۔"

"لیکن میں سمجھا نہیں۔" مُفتی نے اپنا مُچڑا ہُوا دامن جھٹک کر کہا۔ "ہماری گفتگو سے تمہارے پروفوں کا تعلق کیسے پیدا ہو گیا؟"

میں نے کہا۔ "مُفتی جی جب پروف ریڈر کی طرف سے پروف میری میز پر پہنچے تو ان پر جا بجا سُرخ نشان لگے تھے اور سارے صفحے گولوں، کانٹوں اور تیروں سے اَٹے ہوئے تھے۔ میں نے پریس کو اس کے تساہل پر سرزنش کی غرض سے ایک نوٹ لکھنا چاہا اور ان پروفوں کو بغور دیکھنے لگا۔ تاریخ فیروز شاہی کا یہ باب سُلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔"

"کیا بات تھی قطب الدین کی۔" لیڈر نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ اس کی لاٹھ تو اس عظیم مسجد کا ایک مینار تھی۔ وہ جو بنانے والا تھا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا۔۔۔"

لیکن عماد نے اس کی بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور چڑ کر بولا۔ "او گدھے یہ قطب الدین ایبک کا ذکر نہیں ہو رہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کا ذکر ہے جو علاؤ الدین خلجی کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا۔"

عماد کی یہ بات سن کر سب خاموش ہو گئے کیونکہ علاؤ الدین خلجی اور اس کے بعد کے دَور کی پلیس منٹ ان کے ذہنوں میں نہ ہو رہی تھی۔

"ہاں جی۔" عماد نے کہا۔ "قطب الدین مبارک شاہ کے دَور کی کیا خصوصیت تھی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اس کے بعد کا دَور مسلمانانِ ہند کے لیے ایک عبرت کا دَور تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ اگر تائیدِ غیبی شاملِ حال نہ ہوتی تو اس وقت برِصغیر میں ایک بھی مُسلمان نہ ہوتا اور یہ جو پاکستان ہے جو کاغان اور اس پہاڑ پر جو ہمارے وجود جھیل کی طرف ڈال ڈوال ہیں اور جو اذانیں سُنائی دیتی ہیں اور جو درود و سلام محبوب پر بھیجا جاتا ہے۔ ان سب کا کوئی وجود نہ ہوتا اور اگر برِصغیر میں دیپال پور نہ ہوتا تو نہ یہاں اسلام ہوتا، نہ پاکستان ہوتا نہ مسلمان ہوتے۔"

"یہ اپنا دیپال پور منٹگمری والا؟" مُفتی جی نے پوچھا۔

"ہاں جی۔" میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "اس قصبے کو حقیر نہ جانیے یہ برِصغیر میں اسلام کی کل کی حیثیت رکھتا ہے جیسے اولیاؤں میں قطب الاقطاب ہوتا ہے۔"

"یہ بات کچھ صوفیانہ رنگ کی ہو گئی۔" اعظمی نے کہا۔ "تمہارے لیے غور کا مقام ہے مُفتی۔"

مُفتی نے کہا۔ "بکواس مت کرو گدھے۔"

میں نے کہا۔ "اس عہد کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت گھومتا رہتا ہے اور مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ میں قصرِ ہزار ستون جو سُلطان قطب الدین مبارک شاہ کا محل تھا اس کا ایک دربان ہوں۔ میرے ہاتھ میں نیزہ، سر پر خود، بازو پر سُلطان کا چرمی نشان اور گلے میں اس کی غلامی کا پٹہ ہے۔ میں قصرِ ہزار ستون کے اندر باہر آزادی سے گھوم سکتا ہوں۔ مجھے دارالحکومت دہلی کے کوچہ و بازار کی ایک ایک خبر ہے اور قصرِ ہزار ستون کے اندر ہونے والی بات کا علم ہے۔ میں قصر کے اندر کی عشرتوں اور قصر کے باہر کی سازشوں سے بخوبی واقف ہوں۔"

اعظمی نے کہا۔ "یہ تو راوی نمبر ایک ہُوا اب راوی نمبر دو بولے۔"

"بس اب بکواس بند کرو۔" سب نے یک زبان ہو کر اعظمی کو ڈانٹا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے

"ہاں شاہ جی۔" عماد کا تجسس اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے ضیاء الدین برنی کے اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن میرے حافظے پر اس کی

عبارت کا ہر پیراگراف مرتسم ہے اور میں اپنی فوٹوگرافک میموری سے متن کی اچٹتی ہوئی عبارتیں آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ یہ باب مجھے کئی ہفتے تک ہانٹ کرتا رہا ہے۔"

"اب آگے بھی چلو۔" مسعود نے چڑ کر کہا: "ہمیں بغیر واقعے کے ہی ہانٹ کر رہے ہو۔"

میں نے کہا: "جب سلطان قطب الدین تخت پر بیٹھا تو ہوا پرستی سے مغلوب ہو کر عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے تخت نشینی کے دن ہی حکم دیا کہ سلطان علاؤ الدین کے زمانے کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد سترہ اٹھارہ ہزار تھی رہا کر دیا جائے۔ اپنی تخت نشینی کے شکرانے کے طور پر اس نے سارے لشکریوں کو چھ ماہ کی تنخواہ انعام کے طریقے پر دی اور ملوک اور اُمراء کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ بہت سے علاقے اور زمین جو علاؤ الدین کے زمانے میں شاہی جاگیر میں داخل ہو گئی تھیں قطب الدین نے مالکوں کو واگزار کر دیں۔ اب گلیوں اور کوچوں میں گھروں کے اندر اور باہر سونا اور چاندی دکھائی دینے لگے اور لوگوں کو اس خوف اور ہراس سے نجات مل گئی کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، یہ کھاؤ اور یہ نہ کھاؤ۔ اس طرح بیٹھو اور اس طرح سے نہ بیٹھو۔ چنانچہ مختلف تفریحات عیش و عشرت اور شاہد و شراب اور غلام اور لونڈے از سرِ نو نظر آنے لگے۔ زمانے کا کاروبار بدل گیا۔ اکثر لوگوں نے توبہ توڑ دی۔ نیکی اور پارسائی کو خیرباد کہہ دیا۔ عبادات کو خیرباد کہہ دیا۔ عبادات میں کمی آ گئی۔ ہر کوچے اور ہر بازار میں نئے نئے لونڈے نظر آنے لگے۔ سب خوب رو اور نازک اندام گانے والے دُور دُور سے سمٹ کر شہر میں آنے لگے۔ اس وقت کم عمر غلام خوبصورت خواجہ سرا اور حسین کنیز کی قیمت ہزار اور دو ہزار تنکے تک پہنچ گئی۔

چونکہ علاؤ الدین خلجی سخت گیر آدمی تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر موت کی سزا دے دیا کرتا تھا اس لیے اس کے عہد میں اونچے اونچے عہدوں والے اور اعلیٰ مرتبوں والے آنکھ میں ڈالے پھر بھی نہ رہ سکتے تھے۔ غریب آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور صاحبِ حیثیت ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ پر علاؤ الدین خلجی کے مزاج کا ایسا ردِ عمل ہوا کہ اس نے ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی عطا کر دی۔ اس کی اس چھوٹ کا سب سے پہلا مضر اثر تاجروں اور سوداگروں پر ہوا۔ اب وہ اپنا سامان اپنی مرضی کے مطابق فروخت کرنے لگے اور مکاری اور دھوکہ دہی سے لوگوں کو حسبِ مراد لوٹنے لگے۔ رشوت، رسوخ اور خیانت کے دروازے کھل گئے۔ محصولوں کی کمی کی وجہ سے مزدوروں کی زندگی اچھی گزرنے لگی اور ان کے پاس دولت کے انبار جمع ہونے شروع ہو گئے۔ وہ ہندو جو کھیتوں سے گری پڑی بالیاں اکٹھی کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے کبھی ٹھیک سے کپڑے نہ پہنتے تھے۔ زمین پر سوتے تھے۔ اب باریک کپڑے پہننے لگے اور تیر کمان سجا کر گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ مسلمانوں میں فسق و فجور پیدا ہو گیا اور ہندوؤں میں تمرّد اور سرکشی کا مادہ پیدا ہونے لگا۔

برنی کہتا ہے کہ سلطان قطب الدین کو اپنی چار سال اور چار ماہ کی مدتِ حکومت میں شراب پینے، گانا سننے، عیش و عشرت میں وقت گزارنے اور نفس پرستی کی داد دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں مغلوں کا لشکر آ جاتا یا ملک کے کسی بڑے حصے میں بغاوت ہو جاتی یا کوئی اور فتنہ کھڑا ہوتا، تو اس کی غفلت بے خبری عیاشی اور بے پروائی دارالحکومت دلّی میں کیا رنگ لاتی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں نہ مہلک قحط پڑا، نہ مغلوں کے حملے کی مصیبت آئی، نہ کوئی آسمانی بلا نازل ہوئی، نہ کوئی بغاوت یا سرکشی یا عظیم فتنہ برپا ہوا۔

اس کے عہد میں گجرات اور دیوگیر میں بغاوت کا ایک شدید طوفان اٹھا لیکن اس طوفان کے ایک ہی دن میں فرو ہو جانے کی وجہ سے اس میں خود سری اور بے صبری کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ دیوگیر اور گجرات میں بغاوت کے سرغنوں کی بیخ کنی کے بعد سلطان جب دلّی پہنچا تو جوانی، حکومت، مال اور دولت، اصیل گھوڑوں اور ہوا پرستی اور شراب کی مستیوں پر فتح و نصرت، ضبط و نظم، استقامت اور امرائے قدیم کی اطاعت و فرمانبرداری نے اس کو مزید بے باک، لاپروا، ظالم اور جابر بنا دیا۔ وہ اپنے مقربوں اور قریب رہنے والوں سے فحش کلامی کرتا ان کو گالیاں دیتا اور بھرے دربار میں ان کی تذلیل کرتا۔ اس کے گرد خام طبع نودولتیے، ناتجربہ کار، مغرور اور ظالم نوجوان محرموں اور مشیروں کے ٹولے میں جمع ہو گئے۔ شرم و حیا اس کی آنکھوں سے جاتی رہی۔ وہ عورتوں کے کپڑے اور زیورات پہن کر مجمع میں آ جاتا اور لوگوں سے ٹھٹھول کرتا۔ عین الملک ملتانی کو جو اس کے عہد کا امیر الامرا تھا اور ملک قرابیگ کو جو چودہ عہدے رکھتا تھا مسخری کرتا اور فاحشہ عورتوں سے ان کو گندی گالیاں دلواتا۔ امرا اور شرفا کی محفلوں کے لیے اس نے گجرات سے توبہ نامی ایک مسخرے کو بلا رکھا تھا جو بھری محفل میں آ کر ملکوں اور دوسرے امیروں کو بیوی اور ماں کی گالیاں دیتا تھا۔ یہ مسخرہ اپنے پیشاب کی جگہ کو آگے کر کے آ جاتا اور امرا کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور ہوا خارج کرتا۔ بعض اوقات بالکل برہنہ ہو کر مجمعِ عام میں آ جاتا اور فحش کلامی شروع کر دیتا۔"

اتنے میں ایک امریکن عورت برمیز شیر اور سکرٹ پہنے پہاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوئی۔ وہ جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی اور اس نے اپنا پیلا سویٹر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزر گئی تو ہم سب گھوم کر اس کی برہنہ کمر دیکھنے لگے۔ ڈھلوان کی وجہ سے اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے تھے اور وہ بریکیں لگا لگا کر چل رہی تھی۔ اس بریک بندی کی وجہ سے اس کی دونوں بکھیوں میں باری باری بھنور بنتے تھے اور باری باری پُر ہو رہے تھے۔

ہم نے دیکھا لیڈر ایک جھاڑی کے قریب سے نیچے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مسعود نے اُونچی آواز میں کہا: "او لیڈر!"

تو عمّاد نے قہقہہ مار کر ہانک لگائی: "اوئے تو بنا ہی سمجھ سے اتنی دُور پیشاب کرنے کیوں جا رہا ہے؟"

ہم لیڈر کے انتظار میں کچھ دیر وہاں رُکے رہے۔ اعظمی پتھروں کے پیچھے اور چٹانوں کی دراڑوں میں جنگلی پھول تلاش کرتا رہا اور مسعود ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنی رانوں پر تھپکیاں مارتا رہا۔ مسعود جب چلتا ہے تو ایک طرف کو جھولا کھاتا ہے۔ اوائلِ شباب ہی سے اس کا سینٹر آوٹ ہے اور اس کے ٹائی راڈ پر بڑی خطرناک گھاسیں پڑ گئی ہیں۔ یوں تو اس کی صحت ہم سب سے اچھی ہے۔ اکہرا بدن، کھنچا ہوا چہرہ، مضبوط رگ و ریشے، لیکن ہم سب اندر ہی اندر جانتے ہیں کہ جس دن اس کا ٹائی راڈ کھل گیا وہ ہمارے درمیان نہیں رہے گا اور پھر ہم کو اگلا سفر اس کے بغیر ہی کرنا ہوگا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سارے ساتھی اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے اور ہمارے بعد صرف راستے اور راستوں کے جنگلی پھول رہ جائیں گے۔

جب لیڈر اپنی چھڑی گھماتا ہوا واپس آ گیا تو ہم سب اس کے خوف سے آگے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا: "ابھی کچھ دیر یہاں قیام کریں گے اور پھر آگے چلیں گے۔"

"یہ کیوں؟" مُفتی نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ ابھی اس بکواسی کا قصہ ختم نہیں ہوا۔"

عمّاد نے کہا: "قصہ ہمارے ساتھ چلتا رہے گا۔"

"قصہ خواں نہ بھی چلے" اعظمی نے کہا: "تو بھی قصہ ہمارے ساتھ چلتا رہے گا۔ دیکھو ناں قصہ خوانی بازار سارا دن چلتا رہتا ہے حالانکہ کوئی بھی قصہ خواں وہاں موجود نہیں ہوتا۔"

"لیکن جا ہو" مسعود نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا: "مسافت لمبی ہے اور وقت کم ہے اور ہمیں واپس بھی لوٹنا ہے۔"

"سُنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں" لیڈر کڑک کر بولا: "ابھی تھوڑی دیر رکو۔ پھر میں لیسٹ خود ہی نکال لوں گا۔"

اس لیسٹ نکالنے کے خوف سے سب کے چہرے لٹک گئے۔

مسعود پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عمّاد نے اپنے لیے ایک پتھر ڈھونڈ لیا۔ اعظمی نے چٹان کے ساتھ ٹیک لگائی۔ مُفتی اور اس کی سواری راستے میں چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔ لیڈر اور میں کریں چھوڑ کر ایک اور پتھر پر بیٹھ گئے اور عمّاد نے اپنے بوٹ کی ٹو پر چھڑی مارتے ہوئے کہا:

"شاہ جی دیپالپور میں آپ کی زمین تو نہیں؟"

میں نے کہا: "نہیں۔"

"تو پھر آپ اس قصبے کی اتنی تعریف کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں اس کی تاریخی اہمیت کا ذکر کر رہا ہوں بھائی جی۔ اس وقت کے قصبے کی تعریف نہیں کر رہا۔"

"یعنی تاریخی اعتبار سے یہ دہلی، سورت، دکن، سامانہ، لکھنوتی اور بنگالہ سے بھی اہم ہے؟"

"بات ہوئی ناں۔" اعظمی چہک کر بولا: "تاریخی مطالعہ اس کو کہتے ہیں۔ تم سالا لوگ اکیلے دیپالپور کو لیے بیٹھے ہو۔"

"اصل میں یہ ذات کا خاص سکریپٹ رائٹر ہے اشفاق احمد" مسعود ہنس کر بولا: "اور جان بوجھ کر مقامی قصبوں کو شریف الاصل اور اعلیٰ درجے کے ثقافتی مراکز پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ بڑا متعصب ہے۔"

"متعصب بھی ہے متشفی بھی" مُفتی نے سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کہا: "یہ دیپالپور کے باجرے سے چڑیاں اُڑانے والی غلیل لے کر ہندوستان کا لشکر فتح کرنا چاہتا ہے۔"

"خاموش" لیڈر نے کڑک کر کہا "ہمیں قصہ سُننے دو۔ ہاں جی"

میں نے کہا "ہاں جی کیا؟"

لیڈر نے کہا "وہیں سے بیان کرو جہاں تم نے یہ قصہ ابھی چھوڑا تھا"

"بھلا کس کا قصہ تھا لیڈر؟" اختر نے شرارت سے پُوچھا تو لیڈر کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے اختر کو دیکھا اور کہا "قطب الدین مبارک شاہ کا، خلجی خاندان کے آخری بادشاہ کا۔ اس کے بعد تغلق بادشاہوں کا دَور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی تغلق بادشاہ تھے جنہوں نے اپنے دَور میں . . ."

"بس بس بس" عماد نے تقریر کاٹ کر کہا "ہم تاریخ میں بھی تمہاری لیڈری کے قائل ہوگئے، لیکن اس وقت ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے اس سے نمٹ لینے دو . . . . .

ہاں شاہ جی"

میں نے ایک تابع فرمان، اصل اور شریف صاحب کی طرح کہنا شروع کیا۔ دوستو! یُوں تو بہت سے بادشاہوں کی زندگیاں فسق و فجور اور لہو و لعب میں گزریں اور ان کے مظالم سے بستیوں کے در و دیوار خونِ ناحق سے رنگین ہوتے رہے اور اس کے باوجُود ان کے عہد کی وسعتوں میں کمی نہ ہوئی اور ان کے ادوار کئی کئی سالوں پر محیط رہے لیکن مردانِ درویش اور مقربانِ الٰہی کی بے ادبی کرنے والے بادشاہوں کے اوقات ان پر جلد ہی تنگ ہوگئے اور تاریخ کے اوراق ان پر بڑی تیزی کے ساتھ سمٹ گئے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ پر جب فضلِ ایزدی کے دروازے بند ہوئے تو اُس نے اچانک حضرت نظام الدینؒ اولیاء کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ اعلانیہ اُن کی مخالفت کرتا اور دربار سے منسلک ملوک کو منع کرتا کہ شیخ کی زیارت کے لیے ہرگز نہ جایا کریں۔ بارہا مستی کی حالت میں انتہائی بے باکی اور بے شرمی کے ساتھ کہا کرتا کہ جو بھی نظام الدینؒ اولیاء کا سر کاٹ کر ہمارے حضور میں لائے گا اُس کو سونے کے ہزار ٹنکے دُوں گا اور اُس کا مرتبہ بلند کروں گا۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ کے سوئم پر سلطان قطب الدین کا حضرت نظام الدینؒ اولیاء سے آمنا سامنا بھی ہُوا لیکن اُس نے نہ صرف شیخ کا واجبی احترام کرنے سے احتراز کیا بلکہ اُن کے سلام تک کا جواب نہ دیا اور

سب کے سامنے عدم التفاقی کا مظاہرہ کیا۔

خسرو خاں جو سلطان کی ناک کا بال اور اُس کی آنکھ کا تارا تھا دراصل ایک مرتد تھا اور ہندوستان سے مسلمانوں کے خاتمے اور علائی خاندان کو تاراج کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ ایک براوو بچہ تھا اور اس کا خاندان اور قبیلہ بہت وسیع تھا۔

"براوو کیا؟" لیڈر نے پُوچھا۔

مَیں نے کہا "مجھے اس قوم اور نسل کے بارے میں پُوری تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوم ساؤتھ انڈیا میں بستی تھی۔ اور کول، دراوڑ اور بھیلوں سے ذرا اُونچے رتبے کی تھی۔ ان کا عام مندروں میں داخلہ ممنوع نہ تھا اور یہ اعلیٰ پایہ کے ہندوؤں اور برہمنوں کے ساتھ واجبی سا میل جول رکھ سکتی تھی۔ کاما سوترا میں جنوبی ہندوستان کے جن لوگوں کا مذکور ہے کہ وہ جنسی اور جسمانی لذت فراہم کرنے میں اپنا ثانی نہیں شاید وہ اسی قوم براوو سے تعلق رکھتے تھے۔ گجرات، معبر اور دیوگیر میں شاہی مراعات حاصل کرنے کے لیے اس قوم کے لوگ بظاہر مسلمان ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے نام بھی تبدیل کر لیے تھے۔ خسرو خاں کا اپنا نام حسن تھا۔ اس کے ماموں راندھول نے اپنا نام حسام الدین رکھا ہُوا تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے ظفر خاں نائب گجرات کے قتل کے بعد اُس کو گجرات کا حاکم بنا دیا تھا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ خسرو خاں کا یہ ماموں ایک خبیث اور بدکردار براوو بچہ تھا جو طاقت کے نشے میں بڑا منہ زور اور بے حد بے باک ہوگیا تھا اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے یہ ولدالزنا مرتد ہوگیا تھا۔

"اُس نے گجرات میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو جمع کیا اور گجرات کے سب مشہور براووں کو اپنے ساتھ کر کے عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور فتنہ بپا کر دیا۔ لیکن امرائے گجرات قوت و شوکت اور حشم و خدم رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور سلطان قطب الدین کے پاس بھیج دیا۔ سلطان قطب الدین جو اس کے بھانجے خسرو خاں پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور اُس کی ایک ایک لچک اور ایک ایک مٹک پر مر مٹا تھا، راندھول کو حکومت علائی کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے پر یہ سزا دی کہ اُس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور اُس کی رہائی کے احکام صادر

فرما دیئے اور اُس کو اپنی درگاہ کا مقرب بنا لیا۔ گجرات کے امراء نے جب یہ سُنا تو وہ ڈر گئے اور سلطان کی طرف سے اُن کے دلوں میں خوف اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

"جُوں جُوں وقت گزرتا گیا سلطان قطب الدین خسرو خاں کی آتشِ عشق میں اور دیوانہ ہوتا گیا۔ وہ ہر وقت اُس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا اور اُس کے ایک ایک نخرے پر جھوم جھوم جاتا۔ خلوت کے لمحوں میں خسرو خاں اپنے ___ ایک مخالف کا ذکر سلطان سے کرکے یا تو اُسے قتل کروا دیتا یا علاقہ بدر کروا دیتا۔ مخالفین کو اس طرح ختم کرنے کے بعد خسرو خاں اپنی ساری قوت کے ساتھ بغاوت کے کام میں لگ گیا۔ گو اُس نے کچھ علائی سرداروں کو جو سلطان سے ذاتی رنجش رکھتے تھے اپنے ساتھ ملا لیا، پھر بھی اُس کو اپنے گرد ایک ایسے حصار کی ضرورت تھی جو اُس کی قوم کے سرفروش جانبازوں پر مشتمل ہو؛ چنانچہ ایک دن اُس نے سلطان سے دست بستہ عرض کی کہ مَیں خداوندِ کریم کی حکومت ہی میں پلا بڑھا ہوں اور حضور کے زیرِ سایہ ہی زندگی گزار رہا ہوں تمام ملوک و امراء کے عزیز و اقارب اور خاندان دِلی میں موجود ہیں لیکن میرا کوئی نہیں اگر اجازت ہو تو مَیں اپنے ماموں کو بہل وال اور گجرات کے علاقوں میں بھیج دُوں کہ میرے چند عزیزوں اور رشتہ داروں کو عنایاتِ سلطانی کی اُمید دلا کر یہاں لے آئے۔ اُن کی بستی بسا دی جائے اور مَیں جب سلطان سے اجازت پاؤں تو کبھی کبھار اُن کو جا کر مل آیا کروں۔ سلطان قطب الدین نے مستی اور شہوت کی حالت میں اُس کو دل و جان سے اس بات کی اجازت دے دی۔ اس ترکیب سے اُس نے مشہور براووں کو گجرات سے اپنے پاس بُلوا لیا اور اُن کو روپے، گھوڑے، آلاتِ حرب، جاگیریں اور خلعتیں عطا کرنے لگا اور اُن کی قوت اور شوکت میں اضافہ کرتا رہا۔

"اُن دنوں میں خسرو خاں بغاوت کے سلسلہ وار منصوبے بناتا رہا اور اُس کے براوو رشتہ دار اُن منصوبوں میں برابر کے شریک ہوتے رہے۔ پہلے انہوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ جب سلطان شکار کی غرض سے سرساوہ کے مقام پر جائے تو براوو لوگ اس کے ہم رکاب چلیں اور اُس کی حضوری کا دم بھرتے جائیں۔ شکار گاہ میں عین اُس وقت جب شکار پر زغنہ ڈالا جانے تو سلطان کو قتل کر دیا جائے؛ لیکن چند دوسرے باغیوں نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا کہ اگر ہم نے سلطان کو شکار گاہ میں قتل کر دیا تو ممکن ہے سارا لشکر فوراً اکٹھا ہو جائے اور ہم میں سے ہر ایک کو شکار کے میدان میں ہی قتل کر دیا جائے۔ پھر ایک غوغا ہو اور ہمارے خلاف جنگ شروع ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ براوو لوگ کہاں جا سکیں گے جن کو گجرات سے بُلایا ہے۔ وہ تو سارے تہ تیغ ہو جائیں گے اور ہماری سازش دھری رہ جائے گی؛ چنانچہ یہی طے پایا کہ سُلطان کو اُس کے محل قصرِ ہزار ستون کی بالائی منزل میں قتل کیا جائے اور اُسی محل میں بنا ڈال دی جائے۔ ملوک کو اُن کے گھروں سے بُلایا جائے اگر وہ ہمارا ساتھ دیں تو خوب نہیں تو انہیں بھی وہیں قتل کر دیا جائے۔

سلطان سرساوہ کی شکار گاہ سے جلدی واپس آ گیا اور شہر میں آ کر پھر عیش و عشرت میں غرق ہو گیا ___ ایک روز خسرو خاں نے ایسی حالت میں جو اُس کے اور سلطان کے درمیان گزرا کرتی تھی سلطان سے کہا کہ میں ساری رات آپ کے پاس گزار کر صبح کے وقت جاتا ہوں۔ اس وقت محل کے دروازوں میں قفل لگے ہوتے ہیں؛ چنانچہ میرے وہ عزیز جو اپنا وطن چھوڑ کر میری خاطر یہاں آ گئے ہیں نہ تو میرے پاس آ سکتے ہیں اور نہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عقبی دروازے کی کُنجی میرے آدمیوں کو دے دی جائے تاکہ جب بھی میرے عزیز و اقارب چاہیں اس دروازے سے محل میں داخل ہو کر میرے پاس پہنچ جائیں۔ سلطان نے جو مستی کی وجہ سے مدہوش اور غافل تھا حکم دے دیا کہ عقبی دروازے کی چابیاں خسرو خاں کے رشتہ داروں کو دے دی جائیں تاکہ وہ جب چاہیں اپنے عزیزوں سے ملاقات کر لیا کریں اور ان کے درمیان کوئی رخنہ حائل نہ ہو۔

سُلطان کے اس حکم کے بعد ہر شب، ایک پہر یا دو پہر رات گزرنے پر تین چار سو ہتھیار بند براوو محل کے عقبی دروازے سے داخل ہوتے اور اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ محل کے پہرے داران ہتھیار بند براووں کو قصرِ ہزار ستون میں اس طرح گھومتے پھرتے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے۔ پھر اُن میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ آج یا کل خسرو خاں بغاوت کر دے گا، لیکن سلطان کی بد مزاجی اور جبروت کے سامنے کھُل کر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ تجربہ کار اور دانشمند بڑے بزرگ آپس میں کہتے تھے کہ جس طرح سلطان جلال الدین کو دولت کی ہوس اور روپے کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا اس طرح سلطان قطب الدین کو شہوت کے غلبے اور مستی

اور بے خبری نے اندھا کر دیا ہے۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سلطان قطب الدین سے کہتا کہ خسرو خاں کی بغاوت کا منصوبہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ ان براووں میں سے جو ہر رات ہتھیار بند ہو کر محل کے اندر آتے ہیں کسی ایک کو پکڑوا کر تحقیق کرے تاکہ وہ خسرو خاں کے ارادوں کا حال تیرے سامنے بیان کر دے۔ محل کے تمام بزرگ خسرو خاں کی بغاوت سے متعلق شور سنتے تھے اور براووں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اندر ہی اندر غصہ کھاتے تھے لیکن سلطان کے بے ہودہ برتاؤ سے ڈرتے تھے کیونکہ اس میں اپنی جان کا زیاں تھا۔

آخر ایک روز سلطان کے محل کے کلید بردار قاضی ضیاء الدین نے دل کڑا کر کے سلطان سے صاف صاف اور کھل کر کہہ دیا کہ خسرو خاں کے گھر میں ہر روز رات کے وقت براوو لوگ جمع ہوتے ہیں اور ہتھیاروں سے لیس اور مستعد رہتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ خسرو خاں بغاوت کی فکر میں ہے اور حضور کی جان کے درپے ہے۔ میں چونکہ ایک اعتبار سے سلطانِ عالی کا اُستاد بھی ہوں کہ میں نے آپ کو خطاطی سکھائی ہے اور پھر میں بادشاہ کے کرم پر اعتماد رکھتا ہوں اس لیے میں جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں معروض کر دیتا ہوں۔ اگر خداوندِ عالم اس معاملے کی تفتیش کریں کہ اس کا تعلق خداوندِ عالم کی جان سے ہے تو حضور کی حکومت کو کیا نقصان پہنچے گا اور خسرو خاں کی محبت میں کیا کمی آ جائے گی۔ اگر تفتیش کے بعد کچھ نہ نکلے اور ہم غلاموں کا وہم غلط ثابت ہو تو خسرو خاں پر سلطان کو ہزار گنا زیادہ اعتماد ہو جانا چاہیے اور اگر تفتیش سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو سلطان کی جان محفوظ رہ جائے گی اور ہمیں اپنی نمک حلالی پر فخر ہو گا۔

"قاضی ضیاء الدین کلید بردار کی یہ بات سن کر سلطان قطب الدین سخت خفا ہوا اور اُس کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ عین اُسی وقت خسرو خاں بھی وہاں پہنچ گیا اور بدنصیب سلطان نے جو حلق تک خواہشاتِ نفسانی میں ڈوبا ہوا تھا، قاضی ضیاء الدین کی ایک ایک بات خسرو خاں کو سُنا دی اور قاضی کو ذلیل و رسوا کر کے وہاں سے چلتا کیا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ بدکردار خسرو خاں، مردوں کے نیچے لیٹنے والا اور ناجوان مردوں کی اولاد یہ باتیں سُن کر رونے اور ٹسوے بہانے لگا اور فرضی آہ و بکا کرنے لگا۔ اُس نے سلطان سے کہا کہ چونکہ خداوندِ عالم مجھ پر حد درجہ

مہربان ہیں اور دوسرے ملوک اور امراء سے میرا مرتبہ بلند کر دیا ہے اس لیے سب بزرگانِ مملکت اور مقربینِ درگاہِ سلطانی مجھ سے جلنے لگے ہیں اور میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ مجھ کو قتل کروا دیں۔ سلطان قطب الدین پر اُس نازک بدن براوو بچہ کے نازانگیز گریہ وزاری سے شہوت کا تازہ جنون سوار ہو گیا۔ اُس نے اُس کو بغل میں لے کر چمٹا لیا۔ چند بوسے اُس کے لبوں کے لیے اور نیچے گرا لیا اور پھر کیا جو کچھ کیا۔ اس اثنا میں جب کہ جان پر بازی لگانا آسان ہو جاتا ہے، سلطان نے اُس سے کہا کہ اگر سارا جہان زیر و زبر ہو جائے اور میرے سارے مقربین یک زبان ہو کر تیرے خلاف مجھ سے کہیں تب بھی میں تجھ پر ایسا عاشق اور دیوانہ ہوا ہوں کہ تیرے ایک بال پر اُن سب کو قربان کر دوں گا۔ تو اطمینان رکھ کہ کوئی شخص بھی ہو میں تیرے متعلق اُس کی باتوں کو تنکے برابر بھی اہمیت نہیں دوں گا۔

جب ایک چوتھائی شب گزر گئی اور پہلے پہر کا گھنٹہ بج گیا اور غیر نوبتی ملوک و امراء محل سے چلے گئے تو کلید بردار قاضی ضیاء الدین حسبِ معمول محل کے اندر گشت لگا کر چوکیداروں اور ہر پہر کے نوبتی عہدہ داروں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس وقت قصر کی بالائی عمارت میں سلطان کے خلوت خانے میں خسرو خاں کا ماموں رانذھول جو چند براووں کے ساتھ چھپا ہوا تھا گشت کرتے ہوئے قاضی ضیاء الدین کے پاس گیا اور بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ اُس کی خدمت میں پان کا ایک بیڑہ پیش کیا۔ جس وقت قاضی، رانذھول سے پان کا بیڑہ لینے میں مشغول تھا عین اُسی لمحے "جاہریا" نامی ایک براوو نے قاضی ضیاء الدین کے قریب پہنچ کر ایک تیغہ اپنی چادر کے نیچے سے کھینچا اور قاضی پر مارا جس سے وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ قاضی ضیاء الدین کے قتل سے قصر ہزار ستون میں شور و غوغا پیدا ہو گیا۔

اب ہزار ستون براووں سے بھر گیا تھا اور محل کی زیریں منزل پر قدم قدم پر دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ مارنے والوں اور مرنے والوں کی للکاروں اور فغانوں سے ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ جب اس شور و غوغا کی آواز قصر ہزار ستون کی بالائی منزل پر پہنچی تو سلطان نے خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے جو نیچے ہو رہا ہے۔ اُس زرخشپ نے اپنے آپ کو بادشاہ کے بازوؤں سے نکالا اور باہر جا کر منڈیر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عین اُس کی سازش اور اُس

سے بنائے ہوئے دستورالعمل کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک وہاں کھڑا اپنے بھائی بندوں اور اپنے قبیلے کے آدمیوں کو چوکیداروں اور پہرہ داروں پر ٹوٹتے ہوئے اور انہیں قتل کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ منڈیر سے پلٹ کر وہ واپس سلطان کے خلوت کدے میں آیا اور ہنس کر کہنے لگا: "بڑا دلچسپ کھیل ہے۔ خاصہ کے گھوڑے کھل گئے ہیں اور صحن میں بھاگ رہے ہیں۔ اہلکار اور شاہی اصطبل کے کارندے اُن کو پکڑنے کے لیے اُن کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور شور و غل مچا رہے ہیں۔" سلطان نے اُس کی یہ بات سُن کر پھر اپنی آغوش وا کر دی اور خسرو خاں کو اُس میں لپیٹ لیا۔

عین اُسی وقت جاہریا چند اور براووں کی معیت میں ہزار ستون کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ اُنہوں نے خلوت خانے کے محافظینِ خاص ابراہیم اور اسحاق کو کٹاری کے وار سے موقع پر ہی ٹھکانے لگا دیا اور نعرے مارنے لگے۔ اُن لوگوں کے غلبے سے سلطان سمجھ گیا کہ بغاوت ہو گئی ہے۔ وہ اُٹھ کر حرم کی طرف بھاگنے لگا تو خسرو خاں ملعون نے اُس کو بالوں سے پکڑ کر اس کے جعد مشکیں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹ لیا۔ سلطان نے اُس کو نیچے گرا لیا اور اُس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اُس حرامزادے زرِ خسپ نے سُلطان کے بال کسی صورت بھی نہ چھوڑے اور نیچے لیٹا لیٹا جاہریا اور اپنے ماموں راندھول کو آوازیں دینے لگا۔ جاہریا نے فوراً کٹارا سلطان کے سینے پر مارا اور اُس کے بال پکڑ کر اُسے برہنہ خسرو خاں سے جُدا کر لیا۔ پھر اُس نے سلطان کو زمین پر گرا دیا اور جلدی سے اُس کا سر کاٹ لیا۔

بہت سے لوگ قصرِ ہزار ستون کی زیریں اور بالائی منزلوں میں اور اُس کی چھت پر براووں کے ہاتھوں مارے گئے۔ محل کی بالائی منزل میں تمام براوو لوگ بھر گئے۔ چوکیدار اور محافظ یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے۔ براووں نے چاروں طرف ڈیوٹ روشن کر دیئے۔ قطب الدین مبارک شاہ کے دھڑ کو بالائی منزل سے نیچے پھینک دیا۔ لوگوں نے اُس کو دیکھا اور پہچان لیا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کرنے کے بعد خسرو کا ماموں راندھول، جاہریا اور خود خسرو خاں ملعون سلطان قطب الدین کے حرم میں گھس گئے اور وہاں شاہزادیوں اور حرموں کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جس کے سُنانے کی تاب نہیں۔ اب محل کے اندر اور باہر ہر جگہ

براووں کا غلبہ تھا۔ اُنہوں نے بہت سی مشعلیں اور بڑے بڑے چراغ روشن کیے اور اُسی وقت دربار مرتب کیا۔ اُس آدھی رات کے وقت اُنہوں نے ملک عین الدین ملتانی، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہاء الدین دبیر وغیرہ کو اُن کے گھروں سے طلب کیا۔"

یہاں پہنچ کر میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور لیڈر کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "ملک فخر الدین جونا کا نام یاد رکھنا۔"

"کیوں؟" اُس نے غصّے سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بھی اہم مقام رکھتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" لیڈر نے تنک کر کہا: "ہم نے آج تک اُس کا نام نہیں سُنا۔" دراصل لیڈر کو سُلطان قطب الدین کے قتل کا گہرا رنج تھا اور اُس کے مُنہ سے نارمل بات نہ نکلتی تھی۔

عمر نے اپنی ٹھوڑی چھڑی پر سے اُٹھا کر کہا: "یار عمر یہ ملک فخر الدین جونا وہی آدمی ہے جس کو تاریخ محمد تغلق کے نام سے جانتی ہے۔"

"وہی جس نے تانبے کے سکوں کو سونے کے سکوں کی ضرب سے چلایا تھا۔" ناگی نے کہا۔

"یعنی کرنسی نوٹوں کا تصور عطا کیا تھا۔"

"جس نے دلی کے بجائے دکن کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔"

"جس نے چین پر حملہ کیا تھا۔"

"وہ بادشاہ جو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا۔"

"اچھا چلو چلو۔ آگے چلو۔" لیڈر نے رُکھائی سے کہا: "پھر کیا ہوا؟"

میں نے کہا: "پھر ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب اُن سرداروں کو آدھی رات کے وقت براوو لوگ اُن کے گھروں سے نکال لائے اور قصرِ ہزار ستون کی بالائی منزل میں اپنا دربار منعقد کیا تو اندر اور باہر سب حصے ہندوؤں اور براووں سے بھر گئے تھے اور خسرو خاں نے مکمل غلبہ اور قوت حاصل کر لی تھی۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب نکل آیا تو خسرو خاں نے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا اور قطب الدین مبارک شاہ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ اُس ملعون اور ماہون نے تخت پر بیٹھتے

ہی حکم دیا کہ سلطان قطب الدین کے اُن چند غلاموں کو جن کے ساتھ سلطان کو خصوصیت تھی اور جو عظیم امرا میں شمار ہوتے تھے گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی روز ان میں سے بعض کو تو اُن کے گھروں میں ہی قتل کر دیا گیا اور بعض کو محل میں لا کر اُن کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ ان مسلمان امراء کے بال بچوں، بیویوں اور بیٹیوں کو ہندوؤں اور براووں کو بخش دیا گیا۔ قاضی ضیاءالدین کا گھر مع مال و اسباب اور اہل خانہ کے اُس نے اپنے ماموں راندھول کے حوالے کر دیا اور قطب الدین مبارک شاہ کی ملکہ کو خسرو خاں نے اپنے گھر میں رکھ لیا۔

تخت نشینی کے پانچ روز کے اندر ہی ان ذلیل اور کمینے لوگوں نے محل میں بُت پرستی شروع کر دی۔ جاہریا کو جس نے سلطان قطب الدین کو قتل کیا تھا موتیوں اور جواہرات سے سجا دیا اور اس کا گھر شاہی خانوادہ کی حرموں سے بھر دیا گیا۔ گندی بغلوں والے بدبودار براوو اور ہندو مسلمان عورتوں اور کنیزوں کو اپنے تصرف میں لانے لگے اور ظلم و زیادتی کی آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ ہندو اور براوو لوگ جن کا غلبہ ہو چکا تھا دربار میں قرآن شریف کے نسخوں کو کرسیوں کے طور پر استعمال کرتے تھے اور محرابوں میں بُت رکھ کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اس زیرِ خسپ کے جلوس کے بعد ہندوؤں اور براووں کے غلبے کی وجہ سے کفر و کافری کا رواج بڑھنے لگا۔ ہندوؤں اور براووں کو طاقت ور بنانے کے لیے اور ان کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے خسرو خاں باؤن نے حکم دیا کہ خزانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور بے دریغ روپیہ تقسیم کیا جائے۔

اس بے دین براوو بچہ کو اب لوگ ناصرالدین کہتے تھے۔ مسجدوں میں منبروں پر اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ٹکسال میں سکے بھی اُسی کے نام کے تیار کیے جاتے تھے۔ اپنے دورِ حکومت میں خسرو خاں اور اُس کے براوو قبیلے کو علائیوں اور قطبیوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ تھا، چنانچہ اس گمراہی اور تباہی کے دور میں جب کہ ہندوؤں کے غلبے سے کفر کا رواج بڑھ گیا تھا اور براووں کی قوت اور شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا ہندو آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے وہ خوشیاں مناتے تھے اور یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ دہلی پھر ہندوؤں کی ہو جائے گی اور ہندوستان سے مسلمانوں کا جنازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔

خسرو خاں کی بادشاہی اور اس کے ہندو اور براوو حواریوں کے غلبے کے دوران دہلی اور

مملکت کے دوسرے علاقوں میں مسلمان تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اُن لوگوں کا تھا، جو حرص، طمع، ہوس زر اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے خسرو خاں اور اُس کی حکومت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو حکومت سے یا اُن ذلیل اور کمینے متوسلوں سے کوئی وظیفہ یا انعام وغیرہ تو نہیں لیتے تھے، لیکن تجارت اور حرفت کی وجہ سے اُن کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی تھی اور وہ اس دولت سے کسی بھی صورت میں جُدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ گو وہ دل سے اُن ملعونوں کے ساتھ نہیں تھے، تاہم وہ اُن کے خلاف کوئی بات بھی نہیں کرتے تھے۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو تعداد میں تو بہت کم تھے، لیکن جذبہ اسلامی کے پیش نظر ہر وقت رنجیدہ اور ملول رہتے تھے۔ یہ لوگ پانی تک اچھی طرح سے نہیں پیتے تھے۔ اُن کو نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آتی تھی اور وہ دنیا کے اس خطے سے غلامانِ محمدؐ کا وجود مٹ جانے کے خوف سے ہر دم کراہتے رہتے تھے۔

یہ ایک ایسا عہد تھا کہ جس کی نظیر مسلمانوں نے اُس سے پہلے اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مسلسل دباؤ اور حالات کی ناسازگاری سے مسلمان آہستہ آہستہ مرتد ہو رہے تھے اور جو سختی سے اپنے دین پر قائم تھے اُن کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ گندے بدبودار اور دُور دراز سے یورش کر کے آنے والے ہندو ہتھیار سجا کر بازاروں میں گھوما کرتے اور مسلمان اُن کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کوچہ و بازار کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ کر چلتے اور انہیں وقت بے وقت سلام کرتے رہتے۔ اپنے ہی دین کا تمسخر اُڑانے کے لیے انہوں نے خود بہت سے لطیفے گھڑ لیے تھے جو وہ براووں اور ہندوؤں کی محفلوں میں سُنا کر اُن سے داد حاصل کرتے اور اُن کی یگانگت پر فخر کرتے۔

اس ابتلا کے دور میں ملک فخرالدین جُونا کو ہمت ہوئی اور اُس کی رگِ حمیت حرکت میں آئی۔ ملک فخرالدین جُونا نے اپنے دل شکستوں اور مربیوں کا انتقام لینے کی ٹھانی اور اللہ کا نام لے کر خطرے کے سمندر میں کود گیا۔ ملک جُونا کا والد ملک غیاث الدین دیپالپور کا حاکم تھا اور اپنے مالک قطب الدین مبارک شاہ کا وفا شعار خادم تھا۔ پنجاب کا پہلا بادشاہ تھا جو بعد میں شہنشاہ ہندوستان بن کر سریر آرائے سلطنتِ دلی ہوا ...

میری اس بات پر میرے ساتھی ایک ساتھ کھلکھلائے اور سیف الملوک کے راستے پر سوئے ہوئے اصیل مرغوں کی صدائیں ایک ساتھ گونجیں۔

"کچھ عقل کی بات کرو شاہ جی" عماد نے وثوق سے کہا "تغلق خاندان کا یہ فرد پنجاب کا کدھر سے ہو گیا؟"

"مار دو اس کو" مسعود نے خوش ہو کر کہا "اس نے پہلا واقعہ بھی ایسا ہی من گھڑت سنایا ہوگا۔"

"غیاث الدین تغلق پنجاب کا کیسے ہو گیا تیرا باپ" لیڈر نے کڑک کر کہا۔

میں نے کہا "تم سب لوگ اپنی جگہ پر ٹھیک ہو اور شاید مجھ سے زیادہ ٹھیک ہو لیکن میں ایک انسان کی فارمیشن میں اس کے ددھیال اور ننھیال اور اس کے ماحول کو برابر کی اہمیت دیتا ہوں۔ غیاث الدین کا باپ سلطان بلبن کا ایک غلام تھا جس نے پنجاب کی ایک جاٹنی سے شادی کی تھی۔"

"کس سے" عماد نے پوچھا۔

"ساہیوال کی ایک جٹی سے" میں نے کہا "غیاث الدین اس جٹی کے بطن سے پیدا ہوا اور اپنی ماں کے زیر سایہ ساہیوال کے علاقے ہی میں پرورش پاتا رہا۔ بعد میں یہی ہونہار اور شیر دل جوان دیپالپور کا حاکم مقرر ہوا جہاں بلبن نے بابا فریدؒ کی خدمت میں اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کیا وہاں اسی خانوادے کی طرف سے نوجوان غیاث کو دیپالپور کی حکومت بھی عطا کی گئی۔"

"کسی تاریخ میں اس کی طرف اشارہ ہے" عماد نے پوچھا۔

"میں اپنے پلے سے نہیں کہتا" میں نے مسکرا کر جواب دیا "لالہ سجان رائے کی ــــــ "خلاصۃ التواریخ" کی بات کر رہا ہوں۔"

اجملی نے کہا "ناں بھائی۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ باوجود اس کے کہ میں پنجاب کی اس ماں کی عزت کرتا ہوں اور غیاث الدین کی جاٹنی والدہ کو سلام کرتا ہوں، پھر بھی تم لوگ اپنا بادشاہ رنجیت سنگھ ہی کو مانو۔ ہندوستان کے جلیل القدر شہنشاہوں کی صف میں قدم نہ رکھو۔"

ممتی نے کہا "LEGACY اور ESTATE سسٹم تو بدلتے رہتے ہیں۔ بدلتے رہے

ہیں۔ اصل بات تو ECOLOGY کی ہے۔ اگر وہ جما پلا بڑھا پنجاب میں تو بس پنجاب کا ہوا۔"

اس پر سب نے کہا "لو اب ممتی بھی پنجابی شدن ازم کا شکار ہو گیا۔"

ہم سب ہنسنے لگے تو عماد نے کہا "اس بات کا فیصلہ تو کسی پڑھے لکھے آدمی سے پھر کبھی کروا لیں گے۔ اب تم آگے چلو شاہ جی۔"

میں نے کہا "بس نمازِ عصر کا وقت تھا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔ ملک فخر الدین جونا اللہ پر بھروسہ کر کے اپنے چند غلاموں کے ساتھ برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہوا اور اپنے والد کی مملکت کی طرف دیپالپور کو چل نکلا۔ مغرب کے وقت خسرو خاں کو اس کے فرار کی خبر ملی تو اس نے ایک بھاری جمعیت اس کے تعاقب میں روانہ کی لیکن ملک جونا دنوں کی منزلیں گھنٹوں میں طے کرتا اپنے باپ کی حدود مملکت میں پہنچ گیا۔ بیٹے کے صحیح سلامت پہنچنے پر غازی ملک غیاث الدین نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ صدقات تقسیم کیے اور طبل شادمانی بجوائے۔

دوسرے روز جب غازی ملک غیاث الدین کو خبر ملی کہ خسرو خاں کا مرتد بھائی اور اس کے ہوا خواہ ایک بڑا لشکر لے کر دیپالپور پر حملہ کرنے آ رہے ہیں تو اس نے بھی اپنے قدیم وفادار ساتھیوں اور نمک حلال متبعین کو ساتھ لے کر اس لشکر سے ٹکر لینے کا ارادہ باندھا۔ وہ دیپالپور سے نکل کر قصبہ دیبل سے گزرا اور دریا عبور کر کے دشمن کے سامنے آ گیا۔ پہلے ہی حملے میں سلطان غیاث الدین نے ان کافر نعمتوں کے لشکر کو شکست دے دی۔ خسرو خاں کے مرتد بھائی کا چتر اور دُور باش اور وہ تمام خزانہ اور ہاتھی گھوڑے غیاث الدین کے قبضے میں آ گئے جو خسرو خاں نے ایک بھری لشکر کی معیت میں روانہ کیے تھے۔

ان لوگوں کی شکست اور غازی ملک کی فتح کا حال سن کر خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں کا خون خشک ہو گیا۔ براووں کے دل ٹوٹ گئے اور کافر نعمتوں کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

اس فتح کے بعد غازی ملک ایک ہفتہ تک اسی میدان میں مقیم رہا اور اپنی فوج کو آراستہ کرتا رہا۔ پھر اس نے دلی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ملک بہرام ایبہ، ملک مغلطی عین الملک شہابی ملتانی امیر سیوستان اور ملک یک لکھی امیر سامانہ کو کمک کے لیے خط لکھے اور انہیں دینِ برحق اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ اس آڑے وقت میں اس کی مدد کریں۔ ان میں سے ملک بہرام ایبہ غازی

ملک کا خط ملتے ہی اس کے پاس پہنچنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ملک یکی امیر ملتان نے جواب میں لکھا کہ وہ سلطانِ دہلی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ غیاث الدین کو بھی اس نے یہی رائے دی کہ وہ خسرو خاں پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ ملک محمد شاہ پسر امیر سیوستان نے لشکر تیار نہ ہونے کا بہانہ کر دیا اور سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا وہ خط سیدھا خسرو خاں کے پاس دلی پہنچا دیا۔

اپنے ایمان و اعتقاد پر بھروسہ کر کے دیپال پور کا یہ تغلق جاٹ اکیلا ہی دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ جمعہ کے دن غازی ملک غیاث الدین اندرپت کے حوالی سے وفاداروں کی جماعت ساتھ لے کر خسرو خاں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ خسرو خاں بھی اپنے ہندوؤں براووں اور موقع پرست مسلمان حواریوں کے ساتھ اپنی فرودگاہ سے روانہ ہوا۔ ہراوت کے میدان میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلے میں آ کر صف آرا ہوئے۔ دونوں کے ہراولوں میں جھڑپ ہوئی جس میں غازی ملک کو فتح نصیب ہوئی۔ نمازِ عصر کے وقت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے رہے اور خوب گھمسان کی جنگ ہوئی۔ پھر غازی ملک نے اللہ کا نام لے کر اور سبز پھریرا ہوا میں لہرا کر خسرو خاں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ زن صفت خسرو خاں مردوں کے حملے کی تاب نہ لا کر ہیجڑوں کی طرح بھاگا۔ اس کی صفیں منتشر ہوگئیں اور لشکر نے شکست کھائی۔ وہ لشکر سے جدا ہو کر تلپت کی طرف بھاگ گیا اور پھر رات گئے شادی خاں کے خطیرہ میں جا چھپا۔ لوگ اسے پکڑ کر لے آئے اور اس کی گردن اڑا دی گئی۔

غازی ملک فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا دلی میں داخل ہوا۔ قصر ہزار ستون میں اس نے امیروں اور سرداروں کی ایک مجلس آراستہ کی اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے تخت کے پہلو میں دست بستہ کھڑے ہو کر بولا: "میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جن کو سلطان علاؤالدین اور سلطان قطب الدین نے بلند مرتبے پر پہنچایا ہے۔ اس جذبۂ نمک حلالی کی وجہ سے میں نے اپنی جان بازی پر لگائی اور اپنے ولی نعمت کے دشمنوں اور تباہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ اب تم لوگ جو علائی اور قطبی حکومت کے اراکین اور بزرگان ہو ان میں سے جو یہاں ہمارے ولی نعمتوں کے خاندان میں سے کوئی زندہ بچا ہو تو اس کو اسی وقت لاؤ اور

تخت پر بٹھا دو۔ میں اپنے مولی کے سامنے کمر بستہ ہو کر کھڑا ہوں گا اور اس کی خدمت بجا لاؤں گا۔ اگر دشمنوں نے ان دونوں خاندانوں کا کلیتاً صفایا کر دیا ہے تو تم جس کو تخت کا سزاوار اور بادشاہی کے لائق سمجھتے ہو اس کے متعلق طے کر لو اور اس کو تخت پر بٹھلا دو۔ میں بھی اس کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم سے سر نہیں پھیروں گا۔ میں نے جو تیغ زنی کر کے اپنے مربیوں کا انتقام لیا ہے اور اسلام کی نصرت کے لیے جو کام کیا ہے یہ حکومت کے لالچ کی وجہ سے اور تخت حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا۔ آپ لوگ اس وقت جس کو منتخب کریں گے، میں اس کے سامنے عقیدت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیازمندی کے سر کو جھکا دوں گا۔

ان سب بزرگوں نے جو وہاں موجود تھے یک زبان ہو کر کہا کہ سلطان علاؤالدین اور سلطان قطب الدین کی اولاد میں سے اس وقت کوئی بھی زندہ باقی نہیں بچا جو اس تخت پر بیٹھ سکتا۔ تو کہ غازی ملک ہے ہم پر تیرے بہت سے حقوق ہیں کئی سال سے تو مغلوں کے حملے روکنے کے لیے دیوار بنا ہوا ہے۔ تیری ہی وجہ سے ہندوستان پر مغلوں کی آمد کا راستہ بند ہے۔ اس موقع پر بھی تو نے وہ کام کیا ہے کہ تیری نمک حلالی کا ذکر تاریخوں میں لکھا جائے گا۔ تو ہی وہ مسلمان ہے جس نے حکومت کو ہندوؤں اور براووں کے غلبے سے چھڑایا ہے۔ ہم سب لوگ بلکہ اس ملک کے تمام مسلمان تیرے اس احسان کے لیے ممنون ہیں ہم سب لوگ جو یہاں پر جمع ہیں بادشاہی کے لائق اور حکمرانی کا سزاوار تیرے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتے۔ عقل و دانش نیز استحقاق و دیانت کی بنا پر تیرے سوا نیابتِ تخت کے لیے کسی اور کو مناسب نہیں سمجھتے! چنانچہ اربابِ حل و عقد نے متفق ہو کر غازی ملک کا ہاتھ پکڑا اور اس کو تخت پر بٹھا دیا۔

فضا میں بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر لیڈر نے پوچھا: "یہ دیپالپور ہے کس طرف؟"

میں نے کہا "اگر تم لاہور سے بس میں سوار ہو کر ساہیوال کی طرف جاؤ تو راستے میں اوکاڑہ آتا ہے۔ اوکاڑہ شہر سے دو ڈھائی میل پہلے یا شاید اس سے بھی کم ایک اڈہ ہے جہاں بہت سی لاریاں اور ٹرک کھڑے ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بے شمار ہوٹل ہیں۔ یہاں سے بائیں جانب کو ایک چھوٹی سی سڑک جاتی ہے اور یہ دیپالپور کا راستہ ہے۔"

اس ساری داستان کا مسعود کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر پلٹا اور جلدی جلدی واپسی کے راستے پر چلنے لگا۔

"مسعود، مسعود، رُکو، ٹھہرو۔ دیکھو، سُنو، مسعود۔" ہم سب کی آوازیں یکے بعد دیگرے فضا میں گونجنے لگیں۔ لیڈر اُس کے پیچھے بھاگا اور چند ہی قدموں پر اُسے جا لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" لیڈر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کہیں نہیں،" مسعود نے رُکے بغیر جواب دیا۔ "میرا رومال شاید وہاں پیچھے گر گیا ہے۔ اُسے دیکھنے جا رہا ہوں۔"

مسعود اپنے رومال کی تلاش میں کافی دور پیچھے کو چلا گیا اور ہم سب اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ جب وہ واپس لوٹا تو اُس کے پاس اُس کا رومال نہیں تھا۔ ہماری طرف آتے ہوئے ابھی بھی وہ زمین کی طرف دیکھتا چلا آ رہا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ لٹھے کا وہ چیتھڑا اُسے کہیں نہ کہیں مل جائے گا جو اس کی بیوی نے پُرانے غلاف سے پھاڑ کر بنایا تھا۔

تلاش کا عمل بھی خوب ہے۔ لوگ نیلے آسمان پر عید کا چاند تلاش کرتے ہیں۔ قدموں کا نشان دیکھ کر چور کا کھوج لگاتے ہیں۔ کلائی ہاتھ میں لے کر جسم کے اندر حدت تلاش کرتے ہیں۔ کھنڈرات دیکھ کر پُرانے لوگوں کا چلن ڈھونڈتے ہیں۔ شادی کے لیے اچھی نسل تلاش کرتے ہیں۔ خوش وقتی کے لیے اچھا جسم تلاش کرتے ہیں۔ جب بچہ گھر نہیں پہنچتا تو ماں اُس کو تلاش کرنے کے لیے دیوانہ وار راہوں اور شاہراہوں پر نکل جاتی ہے۔ جب اُسی بچے کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کے کھانوں میں ماں کے پکوانوں کی بُو باس تلاش کرتا ہے۔ جب نوجوان اُداس اور تنہا ہوتا ہے وہ جیون ساتھی تلاش کرتا ہے اور جب اُسے زندگی کا ساتھی مل جاتا ہے تو وہ اُسے گھر چھوڑ کر دوسروں کے جیون ساتھیوں کا نظارا کرنے باہر نکل جاتا ہے۔

کچھ آدمیوں کو خبر ہوتی ہے کہ وہ تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ جیسے مسعود کو علم تھا کہ اُس کا رومال گر گیا ہے اور وہ اُس کی تلاش میں جا رہا ہے یا میجر لیئیر کو علم تھا کہ وہ گرگدانا تلاش کر رہا ہے۔ . .

آٹھیویں صدی کے اوائل میں کمپنی بہادر کا ایک میجر ڈیرہ دون میں تعینات تھا جو اپنی شرافت، نجابت، کم سخنی اور دھیمے مزاج کی وجہ سے گوروں اور دیسیوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھا۔ اس

میجر لیئیر کے تین بچے اور سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک بیوی تھی جو گھڑ سواری کی بہت شوقین تھی۔ اس کے بنگلے پر طرح طرح کے گھوڑے بندھے تھے۔ وہاں کچھ اسی قسم کے گھڑ سوار بھی مختلف سرونٹ کوارٹروں میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں عقا کر گھڑ سوار، سندھی، عرب شہسوار، یا غسّانی سوار، مغل چابک سوار اور کچی اور سانڈل کے میچڑ سوار، سبھی قسم کے لوگ ہوتے۔ میم صاحب اُن لوگوں سے بہت متاثر تھیں اور ان کے ساتھ گھنٹوں گھوڑوں کی باتیں کیا کرتیں۔

میجر لیئیر بہت ہی شریف قسم کا فوجی آدمی تھا۔ اپنے باپ کے تتبع میں وہ فوج میں داخل ہُوا۔ دوسرے برٹش آفیسروں کی ہمیشہ عزت کرتا رہا۔ شام کو کلب میں سوڈا اور وسکی پیتا۔ کالے لوگوں سے انسانیت کے ساتھ پیش آتا۔ اُدھار لیتا تو رقم وقت پر لوٹا دیتا۔ خوشی کے موقع پر خوش غمی کے موقع پر ایک جھرجھری اور اتوار کے روز گرجے۔ ملکہ کا نمک حلال اور بکنگھم پیلس کا عقیدت مند لیکن اس میں اپنے دوسرے فوجی افسروں کے مقابلے میں ایک پیچ زیادہ کسا ہُوا تھا وہ یہ کہ میجر لیئیر ایک تفریحی محقق بھی تھا۔ اس کو الول جلول ڈائریاں لکھنے اور بیہودہ قسم کی تحقیق کرنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے بھائیوں وہ ایک عالم تھا جو علم اور عمل کے میدان میں ہفت خواں طے کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اسی شوق نے اس کو پُرانے مسودوں اور مخطوطوں کا خریدار بنا دیا تھا اور وہ قدیم مسودوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا بھی رہتا تھا۔ اس کے مسودوں کا بہترین سپلائر سکّم کا ایک کباڑیا تھا جو بیاوہ گوئی اور چرب زبانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے کردار سے اور اُس کی گفتگو سے متاثر ہو کر میجر لیئیر بھی کباڑیے کا یار بن گیا۔ دونوں میں سے ایک کو جب بھی موقع ملتا وہ دوسرے کے پاس پہنچ جاتا۔ چائے کا دور چلتا، ساتھیوں اور جوگیوں کی باتیں شروع ہو جاتیں اور پھر یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ کئی کئی دنوں پر پھیلا ہو جاتا۔

ایک مرتبہ سکّم کے کباڑیے نے میجر لیئیر کو بتایا کہ اس کے یہاں تبت کا ایک بنجارا آیا ہوا ہے جو ملنے کی چیز ہے۔ میجر صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ دونوں کے درمیان بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میجر صاحب اس کی داستانوں کی کافی میں کریم بن کر گھلتے رہے۔ اچانک بنجارے نے کہا: "میجر صاحب ہمارے اِدھر نیپال اور تبت کی اندرونی گہرائیوں میں گرگدانوں کا ایک بہت بڑا غول ہے جو چرنے چُگنے کے لیے صرف رات کے وقت پہاڑوں کی ڈھلان

پڑتا ہے اور پھر غاروں میں گُم ہو جاتا ہے۔"

"کس کا غول؟" میجر نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"کرگداؤں کا ریوڑ میجر صاحب۔ یونی کارن کا۔"

"وہ گھوڑا جس کے ماتھے میں ایک بَل دار سینگ ہوتا ہے؟" میجر نے پُوچھا۔

"وہی ___ وہی۔" بنجارے نے کہا۔ "بالکل وہی۔ اُن کا ایک غول تبت کی ترائیوں میں گھوم رہا ہے۔"

"لیکن کرگداؤں کی کوئی وجودی حقیقت تو نہیں۔" میجر نے کہا۔ "یہ تو مَیتھالوجی ہے۔ تصوراتی وجود ہے۔ دیومالائی کہانیوں کا جانور ہے۔"

"بس۔" بنجارے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم گورے لوگوں کا علم یہیں تو آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ مَیں جو کہہ رہا ہوں چشم دید گواہ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ مَیں نے اس غول کو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اگر انسان کے پاس اچھا سا پھندہ ہو اور تم لوگ ایسی ایجادوں کے بڑے ماہر ہو تو پھر کئی کرگدے بڑی آسانی کے ساتھ پکڑے جا سکتے ہیں۔"

میجر لیسٹر تبتی بنجارے کی یہ بات سُن کر واپس چھاؤنی آ گیا۔ آتے ہی سیدھے پہلے اپنا استعفیٰ کرنل کو پیش کیا۔ پھر بنگلے پر جا کر بیوی بچوں کو خدا حافظ کہا۔ یاروں دوستوں سے وداع ہُوا اور بنجارے کے ساتھ سوار ہو کر شمالی پہاڑوں میں کرگداؤں کی تلاش میں نکل گیا۔ پُورے سات سال تک میجر کرگداؤں کے غول کی تلاش میں رہا اور تبتی بنجارا اُس کی راہنمائی کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ بالکل قلاش ہو گیا۔ بھوک پیاس سے ہڈیوں کا ڈھانچہ سا رہ گیا۔ پریدہ رنگ دریدہ لباس۔ جہاں بھی جا کھڑا ہوتا لوگ دیوانہ دیوانہ کہہ کر اس کے قریب سے بھاگ جاتے۔ تبت کے نواحی گاؤں میں اس کی کہانیاں مشہور ہو گئیں لیکن اس نے تلاش کی مہم جاری رکھی۔ سات سال بعد اُس کا ساتھی فوت ہو گیا تو میجر لیسٹر اس دُنیا میں اکیلا رہ گیا۔ پھر بھی اس نے کرگداؤں کے ریوڑ کی تلاش نہ چھوڑی اور تین سال اور تبت پہاڑوں کے دامنوں اور سلسلۂ کوہ کی غاروں میں اُنہیں تلاش کرتا رہا۔

جب اُس کی حالت بالکل غیر ہو گئی اور رُوح اور جسم کا رشتہ واجبی سا رہ گیا تو وہ پاپیادہ

پِس دیرہ دون پہنچا۔ اب یہاں نہ اس کا گھر تھا نہ بیوی بچے نہ پلٹن تھی نہ اُس کے ساتھی، نہ کوئی واقف کار نہ کسی سے جان پہچان۔ بیگم کا کیا بنا؟ عرصہ ہُوا مر چکا تھا۔ میجر لیسٹر مانگتا پنتا دریوزہ گری کرتا پاپیادہ کلکتہ پہنچا اور مسالچی کی حیثیت سے ایک جہاز کے باورچی خانے میں ملازم ہو گیا۔ یہ جہاز انگلستان جا رہا تھا۔ کوئی ایک مہینہ مسالچی کی نوکری کرنے کے بعد اس نے جہاز پر ہی حجامت بنانے کا کام سیکھا اور پھر مسافروں کی حجامتیں بنانے لگا۔

جب وہ لندن پہنچا تو اُس نے کنگھی قینچی اور اُسترا خریدا اور برائیٹن میں لوگوں کی حجامتیں بنانے لگا۔ آٹھ سال تک لوگوں کی حجامتیں بنانے اور خط کرنے کے بعد اس نے بال بڑھانے کا ایک لوشن بنایا جو وہ ہر گاہک کو زبردستی دیا کرتا۔ ایسی پُرسکون اور ہموار زندگی گزارنے کے بعد مسٹر لیسٹر ایک دن فوت ہو گیا اور محلے کے لوگوں نے اپنے نائی کو عزت و آبرو کے ساتھ دفن کر دیا۔

لیکن ایک تلاش ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو اُس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ تلاش کر رہا ہے یا اس کو کسی چیز کی چنتا ہے یا وہ کوئی رستہ ڈھونڈ رہا ہے یا اُسے کسی شے کی تلاش ہے۔ پھر بھی یہ عمل جاری رہتا ہے اور مرتے دم تک اس کو اس بات کا سُراغ نہیں ملتا کہ وہ اس قدر بے چین کیوں ہے، خالی کیوں ہے۔ اس کی روح کے اندر ایک تھرتھری سی کیوں رہتی ہے؟

"اُس کو بُلاؤ جو ابھی ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔"

"اُن سے کہنا کہ ابھی ذرا ٹھہریں۔"

"اور وہ جو لان کی پیلی دُھوپ میں لیٹا تھا؟"

"کیوں میاں چرواہے کبھی کوئی اس کھنڈر کے اندر بھی گیا ہے؟"

"وہ جس کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ ہاتھ میں شادی کی دو لکیریں تھیں۔ منہ سے کسی اور منہ کی بُو آ رہی تھی۔ وہ کون تھا؟"

"IS THERE ANYBODY THERE?"

"چہ کُنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد"

"جب اوّل فنا ہے تو آخر فنا ہے تو پھر حالتِ متوسط کا کیا اعتبار؟"

"PRONTO ! SCUSI-DI-CHI-PARLI ?"

"اور وہ جو شاید ابھی ہمارے درمیان موجود تھا وہ کدھر چلا گیا؟"

ایک شام ہم لاہور ریڈیو سٹیشن کے ٹوٹے ہوئے صوفے پر بیٹھے تھے تو کسی نے امانت علی خان سے پوچھا "خان صاحب آپ کیوں گاتے ہیں؟" تو امانت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولا "واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، کوئی سوال ہے، کوئی سوچنے کی بات ہے، کوئی مسئلہ ہے، سیدھی بات ہے کہ میں . . ." اور پھر وہ رک گیا، دس پندرہ سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ہنس کر کہنے لگا "پتہ نہیں کیوں گاتا ہوں۔ کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے متعلق حد ہو گئی . . . ہاں سچ یار وقتی بتاؤ کہ میں کیوں گاتا ہوں، گانا مجھے کیوں اچھا لگتا ہے، روٹ پریسٹ کیوں اچھا نہیں لگتا۔"

پھر ہم سب خاموش ہو گئے اور اپنی اپنی جگہ غور کرنے لگے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمارے درمیان ایک پرانا، دھرا، سیانا اور پڑھا لکھا فلسفی بھی تھا۔ اس نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا "یہ تلاش کا مسئلہ ہے، آرٹسٹ کے اندر جستجو ہوتی ہے، حقیقت کی جستجو، اپنی تلاش، حق کی تلاش، کھوئے ہوؤں کی تلاش، نہ کھوئے ہوؤں کی جستجو، وہ کھوج میں گاتا ہے، تصویریں بناتا ہے، سنگتراشی کرتا ہے، شعر لکھتا ہے، رقص کرتا ہے اور دور نکل جاتا ہے۔"

"لیکن مجھے تو کسی کی تلاش نہیں" امانت نے کہا "میں نے کسی کو نہیں کھویا، مجھے تو کسی کی جستجو نہیں، پھر میں کیوں گاتا ہوں؟" اور ہم سب نے سوچا کہ چونکہ اس نے گانا سیکھا ہے اس لیے گاتا ہے اور چونکہ اس کے گھرانے کی ریت یہی ہے اس لیے وہ اس ریت کو نبھا رہا ہے لیکن ہم سب غلط سمجھے تھے۔

چونکہ ابھی تک کوئی ایسا آلہ وضع نہیں ہوا جو انسان کے اندر کو ماپ سکے اور اس کی گہرائی کو آنک سکے اس لیے ہم نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے میں خود آرٹسٹ بھی شریک تھا بلکہ پیش پیش تھا۔

میرے حساب سے آرٹسٹ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے، وہ بھی اپنے نفع اور نقصان کو سمجھتا ہے، اپنی بہتری کے پروگرام بناتا ہے، اپنی مادی ترقی میں دلچسپی لیتا ہے، وہ بھی حسابی کتابی ہوتا ہے، حصولِ زر کی خواہش رکھتا ہے، اپنے ذہن کے اندر ایسے پیٹرول پمپ اور ایسے باغ لگاتا رہتا ہے جس سے گھر بیٹھے مستقل آمدن ہوتی رہے، کٹریاں اور عمارتیں اٹھاتا ہے جن سے کرایہ ملتا ہے، بس میں سفر کرتے ہوئے کئی دفعہ پکار کر کہتا ہے "یار تم نے میرے پندرہ پیسے واپس کرنے ہیں" کئی فرلانگ لمبا سفر کر کے سستی چیز خریدنے جاتا ہے۔ گھر والوں کے مقابلے میں اپنی ذات کو ترجیح دیتا ہے، ہماری طرح سے خوش اطوار ہوتا ہے اور بڑے سلیقے کے ساتھ کمینہ پن کرتا ہے۔ حسد، بغض، عناد، کینہ، غیبت، طعنہ اس کے اجزائے زندگی ہوتے ہیں لیکن اس کے اندر کا ایک میٹر ان ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ میٹر اس کے دل کے نیچے جگر کے پاس یا پھر اپنڈکس کے قریب ہوتا ہے یا کہیں اور۔ اس کی اسے مطلق خبر نہیں ہوتی نہ وہ اس کی فنکشن سے آشنا ہے نہ اس کی موجودگی کا علم رکھتا ہے۔ عین اسی طرح جس طرح ہم کو یاد نہیں رہتا کہ ہمارے اندر گردے لگے ہیں اور وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آرٹسٹ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر ایک میٹر لگا ہے اور وہ اپنا کام کر رہا ہے۔

جس طرح ماہرین طبقات الارض گیگر کاؤنٹر سے زمین کے اندر معدنیات تلاش کرتے ہیں اسی طرح آرٹسٹ کے اندر کا میٹر کسی انہونی شے کو کسی انوکھے رنگ کو کسی بے نام خبر کو تلاش کرتا رہتا ہے اور اس کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ اس کے اندر تلاش کا عمل جاری ہے۔ جیسے ہمارے اندر تقطیر کے عوامل کی ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی لیکن یہ عمل جاری ہوتے ہیں۔ اسی کانوں کان خبر نہ ہونے کی وجہ سے امانت علی نے بھی بڑی معصومیت کے ساتھ کہہ دیا کہ اس کو تو کسی کی تلاش نہیں، کسی کی جستجو نہیں۔

چھ سات سال ادھر کی بات ہے۔ ریاض محمود کے کمرے میں امانت علی سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ خاموش کچھ گھبرایا ہوا اور کچھ خوش سا تھا۔

ریاض نے کہا "کیا بات ہے خاں صاحب کچھ ہماری دید نہیں کر رہے ہو۔ کیا ناراضی ہے یا ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟"

امانت نے ذرا سی پریشانی، تھوڑی سی خود فزودگی اور ہلکی سی پریشان مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا۔ اشفاق صاحب میں کراچی گیا ہوا تھا ایک کنسرٹ کے سلسلے میں، وہاں خوب محفل جمی، بڑی داد ملی، پھر چند صاحب لوگوں نے

ایک سرور نشست کی فرمائش کی رات گئے تک میں غزلیں گاتا رہا۔ خوب سماں بندھا بڑا لطف آیا۔ وقت ٹھہر سا گیا میرے اندر ایک عجیب عاجزانہ سا تکبر پیدا ہو گیا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔ اُوپر سے تو میں کانوں کو ہاتھ لگاؤں لیکن اندر سے مجھے خوشی ہو کر اور کوئی اس طرح سے غزل نہیں گا سکتا۔ یہ بڑی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ بابا آدم کو بھی اسی طرح کی ندامت ہوئی ہو گی اور ساتھ خوشی بھی کہ ممنوعہ پھل کھا کر دکھایا آدمی فرشتوں سے اُوپر سا ہو جاتا ہے جیسے فرشتے اسے پھر سجدہ کر رہے ہوں اور وہ شرمندگی سے ندامت سے اور خجالت سے اُن کے آگے ہاتھ باندھ کر رونے لگ جائے۔ میری آواز میں رونے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اسی محفل میں ایک خاتون تھی گہرے کتھئی رنگ کی قیمتی سی ساڑھی پہنے اُس کی کریشن ریڈ کی بِندی بہت گہری تھی بڑی خوبصورت کر تھی ریاض صاحب! میں نے تو پہلے کبھی عورت کی کمر کے بارے میں اس طرح سوچا ہی نہ تھا۔ بڑی کوئی اُونچی قسم کی خاتون تھی اونچی ناک والی کم گفتگو کرتی تھی اور ٹھوڑی اُٹھا کر بیٹھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ غزلوں کے مشکل شعر سمجھتی بھی نہیں تھی، وہ ایسی خوبصورت اور اتنی طرحدار تھی اشفاق صاحب کہ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اس سے کوئی بات کروں اور وہ مجھے میرے سوال کا لمبا جواب دے کافی لمبا دیر تک نہ ختم ہونے والا۔ لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی مزے سے بیٹھی سگریٹ پیتی رہی۔ پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو بجے ہوں گے رات کے۔۔۔ ہم محفل سے باہر نکل کر چلنے لگے تو وہ میرے قریب آ کر بولی "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں امانت صاحب؟"

"ہم! میں تھوڑا سا گھبرا گیا اور ذرا سوچ کر بولا یہیں جی ہوٹل میں اور ہم لوگ کہاں ٹھہر سکتے ہیں"

اس نے اسی طرح ناک اُوپر اُٹھا کر کہا: "آپ میرے ساتھ گھر چلیئے آرام سے سوئیے اور صبح کا ناشتہ کر کے آ جائیے۔" مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ریاض صاحب کہ میں نے اس کی بات کا جواب دیا یا نہیں لیکن میرے اندر ایک خوبصورت تنہائی سی بجی اور میں اس کے ساتھ کار میں سوار ہو گیا۔ عجیب سی کار تھی۔ اس کے اندر کئی میٹر مختلف رنگوں کے چل رہے تھے میل بتانے والی سوئی نہیں تھی پارہ سا اُوپر کو چڑھتا تھا۔ اسی طرح کی اور بلا جبر کئی گھڑیاں سوئیاں تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ سنسان سڑک پر چلتے ہم اس کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ ڈرائیو وے کے دونوں طرف پام کے بڑے بڑے درخت تھے۔ برآمدے کے ستونوں پر سبز بیلیں چڑھی تھیں۔ درمیانی محراب میں مینا کا پنجرہ لٹک رہا تھا اور مینا سو رہی تھی۔ پھر ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک ملازم برف گلاس اور چھوٹی بڑی بوتلیں ایک ٹرالی میں رکھ کر لے آیا۔ اس نے بلور کے ایک گلاس میں ہلکی کافی کے رنگ کی شراب ڈالی اور چاندی کی چمٹی سے برف کے ٹکڑے پکڑ کر اس میں چھوڑ دیئے۔

پھر کہنے لگی: "آپ کون ہیں امانت صاحب"؟

میں نے جلدی سے کہا "ہم جی پٹیالے کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گھرانہ پٹیالے کی گائیکی کا گھرانہ ہے اور میرے دادا مہاراج کے دربار میں کرنل کا رتبہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے زمانے میں۔۔۔

لیکن وہ مسکرانے لگی اور ہنس کر بولی: "میں نے پوچھا تھا آپ کون ہیں؟"

"میں تو جی شرمندہ سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب اس کو کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں اور سچ جانیں تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں کون ہوں۔۔۔ ایک خاموشی سی چھا گئی۔۔۔"

اس رات میں نے بہشت دیکھا ریاض صاحب! مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ بہشت کیسا ہوتا ہے، بس کتابوں میں پڑھا تھا اور بزرگوں سے سنا تھا لیکن اصل بہشت اشفاق صاحب آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جس طرح جس آدمی نے کبھی رائے ونڈ نہیں دیکھا اس کو اپنے علم کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ رائے ونڈ کیسا ہو گا، لیکن اصل رائے ونڈ اور ہی طرح کا ہوتا ہے۔ کتاب والے اور علم والے رائے ونڈ سے مختلف۔ اسی طرح اصل بہشت اور ہے اور کتابوں کا بہشت اور۔

صبح جب بابا ناشتہ لایا تو ہم ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے تھے۔ جب وہ مجھے اپنی کار میں ڈال کر ہوٹل کے لیے چلی تو مینا جاگ چکی تھی اور چونچ سے پَر کرید رہی تھی۔ اس نے سارے راستے کوئی بات نہ کی اور مجھے ہوٹل پر اُتار، خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ جاتی ہوئی کار میں میں نے آخری چیز اس کا پرس اور پرس کے پاس پڑی ہوئی سگریٹوں کی ڈبی دیکھی تھی۔"

"تم نے اس کا پتہ نوٹ نہیں کیا امانت؟" ریاض نے ہکلا کر پوچھا۔

"کیا جناب کیوں نہیں، یہ دیکھو، یہ دیکھو نوٹ بک میں درج ہے، فون نمبر بھی ہے۔"

"بس پھر تو مزے ہیں" ریاض نے کہا۔

لیکن خوف سا بھی ہے ریاض بھائی اور اس خوف کی مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امانت نے بڑے خوبصورت کڑھے ہوئے ریشمی کرتے پہننے شروع کیے۔ گریبان کے آگے بل کھاتے ڈورے اور آستینوں کے پاس ڈولتے ہوئے پھُندن لیکن یہ ساری آرائش اور یہ خوبصورتی اور اتنی بہت مقبولیت اس کا خوف اور اُداسی دُور نہ کرسکی۔

پھر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چُپ چاپ اکیلا کراچی چلا گیا۔ شاید کوئی اور بھی جانتا ہو لیکن مجھے اور ریاض محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کم گو کی آواز سننے کے لیے ترستا گیا ہے۔ دُنیا کے اتنے گلوکاروں میں سے اس کو صرف ایک وہی آواز پسند آئی تھی جو شاید رُک رُک کر نکلتی تھی لیکن ہر فقرے پر پورے سُر لگتے تھے۔

تیسرے دن امانت واپس آگیا۔ ہم نے اس سے گوہرِ مقصود کی بابت پُوچھا تو کھسیانی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔ ریاض نے کہا اشفاق صاحب یہ بہشت سے نکلنے کا افسوس ہے اور اس میں بات کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

امانت نے کہا کون سا بہشت اور کیسا بہشت ریاض صاحب! وہاں تو کوئی بھی نہیں کچھ بھی نہیں۔ اک خواب سا تھا اب اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔

کراچی پہنچ کر میں سیدھا اُس کے بنگلے پر گیا تھا گھنٹی بجائی اندر سے ایک بڑھا پارسی نکلا میں نے بیگم صاحب کی بابت پوچھا تو اس نے کہا کون سی بیگم صاحب بابا کدھر کی بیگم صاحب، اِدھر تو کوئی ایسا نہیں۔

میں نے نوٹ بُک آگے کر دی اس نے غور سے نام اور پتہ پڑھا پھر ہنس کر بولا اوہ تو یہ بنگلہ چھوڑ گئی یہ تو ہم نے کرائے پر لے لیا ہے۔

اور وہ کہاں چلی گئی؟

اس کا ہم کو کیا معلوم ہم کوئی ہر ایک کا نام اور پتہ تو نوٹ کر کے نہیں رکھتا، جاؤ شاباش۔

میں نوٹ بُک جیب میں ڈال کر واپس چلا آیا۔ تھوڑی سی کوشش کی جہاں جہاں سے ان کا پتہ معلوم کرسکتا تھا کیا لیکن کوئی اثر آثار ان کا نہ ملا، پتہ نہیں وہ سچ مچ کوئی مخلوق تھی یا مجھے دھوکا ہوا تھا۔ جب مجھے مینا کا چہرہ یاد آتا ہے تو لگتا ہے کہ خواب تھا، کوئی طلسماتی مقام تھا لیکن

جب پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے درمیان ریڑھ کی ہڈی گہری نال بناتی ہے اور ہاتھ اُسے محسوس کرسکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے حقیقت تھی پتہ نہیں کیا تھا، جی آپ ہی کچھ اندازہ لگائیں۔

ہم دونوں اس کے ساتھ مل کر اندازہ لگاتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

پھر امانت گاتا رہا اور خوب گاتا رہا اور خوب خوش رہا اور ہم سے ملتا رہا اور اس واقع پر ہنستا رہا اور ہم کو ہنساتا رہا اور لطیفے سناتا رہا اور بس کنڈکٹر سے چند روپیے بھی واپس مانگتا رہا لیکن اس کے اندر تلاش کا گھگر کا ڈونگر اور تیز ہو گیا مینا والی کی تلاش نہیں صاحب نظر گُروں کی تلاش نہیں بس۔

تلاش! تلاش!! تلاش!!! جس کا احساس آرٹسٹ کو کبھی نہیں ہوتا جیسے سائیکل سوار کو کبھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ پاؤں چلا رہا ہے، آدمی کو محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے!

جب امانت علی مر گیا اور اس کی موت کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی تو اجمل ایک سڑک کے کنارے کھڑا تھا اس نے مجھے ہاتھ دے کر روکا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے چہرے کو مخصوص انداز میں ٹوئیچ کرنے کے بعد بولا، بھاجی ایہہ دسو کہ امانت مر کیوں گیا؟

میں نے کہا اجمل صاحب آرٹسٹ مرتا نہیں رُوٹھ جاتا ہے۔

کہنے لگا رُس جاندا اے، کدھرے نال؟

میں نے کہا اپنے ماحول کے ساتھ، اُن ہونیوں کے ساتھ اور اس میں اجمل صاحب معاشرے کا اور ماحول کا بھی کوئی قصور نہیں ہوتا، معاشرہ بڑا اچھا ہوتا ہے آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے، اس کی بڑی ضدیں پُوری کرتا ہے، اس کو مرنے سے شراب پینے سے بے کیف ہونے سے، تباہ ہونے سے نہیں روکتا، لیکن پھر معاشرے کا بھی چند چیزوں پر بس نہیں چلتا۔

اوہ کس طراں؟ اجمل نے پوچھا۔

میں نے کہا آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے مجھے ایک کوزہ لے دو، کچی مٹی کا کچا کوزہ اور معاشرہ فوراً اسے ایک کوزہ فراہم کر دیتا ہے پھر آرٹسٹ کہتا ہے مجھے ایک ہاتھی لے دو اور معاشرہ فوراً اپنی تمام تر پونجی جمع کر کے اُسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے اس ہاتھی کو اس کوزے میں ڈال دو، اس وقت معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے، اس پر آرٹسٹ ناراض ہو جاتا ہے اور رُوٹھ جاتا ہے اور مانتا نہیں اور چلا جاتا ہے۔

اجمل نے حیران ہو کر کہا: "بھا جی! لیکن اوہ دا تے آپریشن نہیں ہو سکیا۔ وقت سر اپنڈکس دا آپریشن سی ڈاکٹراں توجہ نہیں دتی۔"

میں نے کہا: "نہیں یار! اپنڈکس خراب نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک اور میٹر ہوتا ہے۔ ایک گُرگا ذرا زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ اس کی فری کرنسی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسانی جسم اس کی تاب نہیں لا سکتا۔"

"ایہہ میٹر کی کردا اے بھا جی؟" اجمل نے پوچھا۔

"اس کو کسی کی تلاش ہوتی ہے، کسی شے کی جستجو ہوتی ہے۔"

"بکھ جی! کیہڑی شے دی تلاش؟"

"اس کی مجھے بھی خبر نہیں۔ خود آرٹسٹ کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ تم کو بھی پتہ نہیں بھائی اجمل یہ تبدیلی اندر کی ہوتی ہے۔ نہ دیکھنے والے کو علم ہوتا ہے، نہ معالج کو، نہ خود مریض کو۔"

پھر گلشن چوک تک میرے اور اجمل کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

جس طرح اجمل میرے پہلو میں خاموش بیٹھا امانت کی موت کے بارے میں سوچ رہا تھا، اسی طرح ہم ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے اور خاموش تھے۔ ہم نے اتنا طویل سفر ساتھ ساتھ طے کر لیا تھا کہ اب ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ تھکے ہوئے ہونے سے، زبردستی کے بُردبار بنے ہوئے ہونے سے اور دوست بنے ہوئے ہونے سے۔ جس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہ کر اوب جاتے ہیں اور بیزار ہو جاتے ہیں اور پھر ساتھ ہی رہتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور ہمارے اندر اور باہر میں وہی قبولیت تھی جو ہماری بیویوں کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ ہم خوش تھے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ہمارے درمیان محبت اور یگانگت کا رشتہ قائم ہے۔

اتنے میں ایک مرد بزرگ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے سر پر گُلّے والی سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ گلے میں لمبا کرتہ تھا۔ نیچے کھلا سا تہبند تھا اور پاؤں میں چمڑے کے سیاہ بوٹ تھے جن کے تسمے کھلے ہوئے تھے۔ اس بزرگ مرد کی ڈاڑھی سیاہ اور چمکدار تھی۔ اس نے ایک رات پہلے تیل لگا کر ڈبل خضاب کیا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرا تو مسعود اور کوہستانی نے ایک ساتھ

"السلام علیکم" کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح سر جھکائے قریب سے گزر گیا۔ مسعود نے ذرا رک کر پیچھے مڑ کے دیکھا تو کوہستانی نے کہا:

"مرنج کرو صیب۔ دیہات کا بچہ۔ سلام کا جواب دینا نہیں جانتا۔"

"بھئی اب پریوں کا علاقہ شروع ہو گیا دوستو" مُفتی نے اعلان کیا "اب سلام کا جواب نہ ملے تو غصہ نہ کرو۔ خدا جانے کون کیا ہے اور کیا کیا چیز ہے۔"

"بھئی واہ" اعظمی خوش ہو کر بولا "یہ سال گرمیوں میں پریوں کے دیس میں آ کر بدل جاتی ہے۔ کیسے کیسے خوبصورت جملے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مُفتی جیسے بے زبان آدمی سے۔"

"مُفتی اور بے زبان؟" عماد نے قہقہہ لگا کر کہا "اس کی زبان کا چسکا ہی تو ہم کو جنگلوں اور بیابانوں میں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔"

مسعود نے کہا "یہ اعظمی بڑا گھپلا ہے۔ بدزبان کی جگہ بے زبان کس خوبی سے استعمال کر گیا ہے کہ مُفتی کو بُرا نہیں لگا اور ہم سب کو خبر بھی ہو گئی، کیوں شاہ جی؟"

میں نے کہا "لیکن یہ آدمی جو ابھی ہمارے قریب سے گزرا تھا یہ تو دُوتنگ تھا" سب اپنی اپنی جگہ پر رُک گئے۔

میں نے کہا "آج سے چالیس برس پہلے جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو ایک ایسا ہی آدمی ہمارے گاؤں کے ایک کھنڈر میں رہتا تھا۔ اس کا نام دُوتنگ تھا اور وہ بوٹی پیا کرتا تھا۔"

"یہ وہی ہے یا اُس جیسا ہے؟" مُفتی جی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ تو کبھی مر گیا تھا" میں نے آرام سے کہا "لیکن یہ بھی وہی ہے۔"

"یعنی کیا اس کی شکل اُس سے ملتی ہے؟" مسعود نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"اس کا قد بُت؟" لیڈر بولا۔

"نہیں۔"

"شاید اس کی ڈاڑھی چھٹنے کا انداز، بالوں کی رنگت" عماد نے میری مدد کی۔

"نہیں یہ بھی نہیں۔"

"تو پھر بھائی اس کا کچھ اور مطلب ہوگا۔" اعظمی نے کہا "کچھ چیزیں ایسی غیر مرئی بھی ہوتی ہیں جو کسی کسی کو نظر آتی ہیں۔ وہ ملتی ہوں گی۔ کیوں شاہ جی؟"

میں نے کہا "نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں، البتہ مجھے یہ آدمی وہی لگتا ہے۔ گو اس سے سن و سال میں بہت ہی چھوٹا ہے۔" پھر میں نے نیچے ڈھلان کی طرف دیکھا۔ پہاڑ کے بل کھاتے ہوئے راستے پر وہ شخص تیزی سے نیچے اتر آ جا رہا تھا اور اس نے اپنے چہرے کے گرد پگڑی کا شملہ لپیٹ لیا تھا۔ ایک میں نے ہی نہیں ہم سب نے اس کو باری باری سے دیکھا اور ایک دوسرے کو احساس دلائے بغیر دیکھا کہ ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

کوہستانی نے زمین پر جھک کر کہا "ایک پتھر ماروں دلیث کے سر پر؟"

اور ہم سب نے ناں ناں! "ناں ناں! خان ناں" کہہ کر اس کو پتھر مارنے سے منع کیا۔

لیڈر نے کہا "بھئی چلنا ہے تو جلدی جلدی قدم اٹھاؤ اور اگر رکنا ہے تو تھوڑی دیر قیام کرلو۔ یہ درمیانی ڈھیل ڈھال درست نہیں۔"

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا "چلنا ہے بابا چلنا ہے۔ راستہ لمبا ہے اور وقت کم ہے۔ ہم کو ضرور چلنا ہے۔"

کوہستانی نے کہا "تاپلار دے . . ." اور پھر ایک پتھر اُٹھا لیا۔

"نہیں نہیں" مُفتی نے کہا "کیا کرتے ہو خان جانے دو۔ اس کو جانے دو۔"

"کافر ہے صیب" کوہستانی نے کہا۔

"ضرور ہوگا" اعظمی نے جواب دیا۔

"بدبخت کا بچہ ہے جی۔"

"صاف نظر آتا ہے۔"

"ذلے کا بچہ ہے۔"

"بالکل۔ وہ تو اس کی چال سے ظاہر ہے۔" اعظمی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر اس کو ماریں صیب۔"

"دفع کرو خان۔ ہم کو اس سے کیا۔ سلام کیا۔ کیا نہ کیا۔" مُفتی نے کہا "خدا اس کو حو

عذاب دے گا۔"

لیکن یہ بات کوہستانی کے دل نہ لگی۔ وہ ہمارے ساتھ چلنے تو لگا لیکن برابر پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا اور سیاہ بوٹوں والا سفید دھبہ تیزی سے نیچے کی طرف بڑھتا رہا۔

"جب میں دسویں میں پڑھتا تھا" میں نے کہنا شروع کیا "تو میں وِتو ملنگ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ میں اپنے سکول کا ایک اچھا ہونہار طالب علم تھا اور میرے ساتھ میرے سکول کی کئی امیدیں وابستہ تھیں اور ہمارا امتحان بہت قریب تھا اور میں وِتو ملنگ کے تیر میں گم ہو گیا تھا۔

وِتو ملنگ ہمارے قصبے کی ایک پرانی حویلی میں جو کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی رہتا تھا۔ اس کو باہر آتے جاتے، مانگتے پھرتے، سوتے جاگتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ پتہ نہیں وہ کیا کھاتا اور کہاں سے کھاتا تھا؟

اُس کے سارے جسم پر کوئی بال نہ تھا اور اس کی کھال جگہ جگہ سے اُچٹی ہوئی تھی۔ سارا بدن خارش زدہ کتے کی طرح سنولایا ہوا تھا اور جھری دار تھا۔ ایک سلور کے کٹورے میں گیرو، تیل اور توے کی کالک کا وارنش سا پڑا رہتا جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اپنے بدن پر ملا کرتا۔ ہر وقت سلگتے ہوئے اُپلوں کے اندر مٹی کی ایک ہنڈیا پکا کرتی اور اس ہنڈیا کے پاس ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا چاقو پھل کے بل زمین میں دھنسا رہتا۔

پہلے تو میں سکول سے تفریح کے پیریڈ میں پھٹا کیا کر وِتو ملنگ کے پاس جاتا اور اس کے سامنے بیٹھے جمورے کی طرح بیٹھا رہتا۔ پھر میں دوسرے پیریڈوں میں بھی کھسکنے لگا۔

"لیکن تو وہاں جانے کیوں لگا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں یعنی کیا دلچسپی تھی تم کو شاہ جی؟" مسعود بولا "کون سی کشش تھی؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "کوئی دلچسپی نہیں تھی، کوئی کشش نہیں تھی۔ پھر بھی میرا دل اس کے پاس جانے کو چاہتا تھا اور اس کے چمکدار مردار اور ننگے ہوئے چہرے کو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اُپلوں کی آگ کے پاس بیٹھ کر مکھن کا ایک گولا سا دھویا کرتا اور کہا کرتا سو مرتبہ دھونے سے مکھن زہر بن جاتا ہے۔ میں زہر بنا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ کا کنکشن وہاں کیا تھا شاہ جی؟" عماد نے مثبت انداز میں پوچھا۔

"میرا فنکشن کوئی خاص نہیں تھا۔ بس میں اس کا بچہ جو اتنا ساتھی تھا، ملازم تھا، کئی تھا۔ پتہ نہیں میں کیا تھا اور میرا خاص فنکشن کیا تھا، لیکن میں اس سے متاثر تھا اور اس قدر متاثر تھا کہ اس کے بعد پھر کسی سے اس قدر متاثر نہ ہو سکا۔"

"لیکن ہوئے کیوں؟" مُفتی نے پوچھا۔

"یہ پتہ نہیں مُفتی جی" میں نے کہا۔ "اس بات پر میں نے کبھی غور نہیں کیا، البتہ اگر آپ مجھے ضعیف الاعتقاد تصور نہ کریں تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے اور اس کے اندر خشک اور چٹیل پہاڑوں کے درمیان ایک دریا بہتا ہے۔ اب پتہ نہیں میں نے یہ خواب دیکھا تھا یا میرا ایسے ہی تصور تھا یا میں نے جاگو میٹی میں ایک فلم دیکھی تھی۔۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کی ڈور اور کانٹا ہے اور کانٹا اتنا بڑا ہے کہ کبھی میں اسے اس ہاتھ میں پکڑتا ہوں اور کبھی دوسرے میں۔ ایک بڑے سے پتھر کے سامنے دریا کے اندر مجھے بہت سی مچھلیاں اچھلتی اور جھاگ اُڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں اس کانٹے کی نوکوں پر آٹا چڑھائے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ کانٹا دراصل مچھلی پکڑنے کا کانٹا نہیں ہے بلکہ ترشول کی طرح سے ہے یعنی اس کی تین نوکیں ایک وقت بار پر نکلی ہوئی ہیں اور آگے سے سیدھی لیکن بہت ہی تیز ہیں۔ جب ان تینوں نوکوں پر آٹا چڑھا کر میں پتھر پر کھڑا ہو کر کانٹا پانی میں ڈالنے کے لیے رسی گھماتا ہوں تو پیچھے سے دتو ملنگ آ جاتا ہے اور گھومتا ہوا کانٹا اپنے ہاتھ سے روک کر کہتا ہے "ناں کاکا جی ناں۔ مچھی ایس طراں نئیں پھڑی جاندی۔ ایدھر لیاؤ میتوں دیو۔"

میں ڈور اور کانٹا اس کے ہاتھ میں دے کر خود پتھر سے نیچے اُتر جاتا ہوں اور دتو پتھر کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ پھر وہ کچھ اس ترکیب اور اس مہارت سے ڈور گھماتا ہے کہ اصولاً ڈور اس طرح سے گھوم ہی نہیں سکتی۔ کانٹا ایک مرتبہ سطح آب پر ٹپا کھاتا ہے اور پھر ڈور کے سرے پر گھومتا ہوا میرے گریبان سے آ کر چمٹ جاتا ہے۔ میں جس قدر اس ترشول کو اپنے گریبان سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی قدر وہ میرے ساتھ اور چمٹتا جاتا ہے۔ دتو ملنگ مسکرائے جاتا ہے اور ڈور کو اپنی طرف کھینچے جاتا ہے۔

میں قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ گو میں اس کے قریب جانا نہیں چاہتا۔ اس

کے پاس آ رہا ہوں۔ گو مجھے اس سے گھن آ رہی ہے۔ اس کے بعد یہ وژن قائم نہیں رہتا اور میں آنکھیں کھول کر فضا میں تکنے لگتا ہوں۔ اس واقعے کا یا اس خواب کا یا اس وژن کا مجھ پر کوئی خاص بوجھ نہیں کیونکہ ہمارا خاندان بہت اونچے درجے کا تعلیم یافتہ خاندان ہے اور ہم میں سے کوئی بھی ضعیف الاعتقاد نہیں۔

اس وژن کے کوئی تین روز بعد میں نے دتو ملنگ کا چہرہ چھیکوں والی حویلی کی اس کھڑکی میں دیکھا جو میری پیدائش سے پہلے کی بند تھی۔ اس کی سلاخیں ضرور موجود تھیں لیکن اس کے چوکھٹے کو گھن کھا گیا تھا۔ میں نے دیکھا دتو نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر کہا: "مچھی پھڑ لئی ہے؟"

"کون سی مچھلی؟" میں نے جان بوجھ کر اردو میں پوچھا۔

"جو نسی پکڑن گیا تھا؟"

"میں نے کوئی مچھلی نہیں پکڑی" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"پھر میں نے تاں پھڑ لئی" اس نے ہنس کر کہا۔ "آ جا تیرے کو دکھاواں"

میں کچھ دیر تو ہکا بکا اس کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر پتہ نہیں مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں سرپٹ بھاگا اور گھر آ کر دم لیا۔"

"یہ تم اصل واقعہ بیان کر رہے ہو یا کوئی افسانہ سنا رہے ہو؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہے تو اصل واقعہ لیکن مجھے بھی افسانہ ہی لگتا ہے" میں نے کہا۔ "اور حیرانی کی بات ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں مجھے یہ واقعہ کبھی بھی یاد نہیں آیا۔"

عماد نے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا "مُفتی جی جرح کرنے کی اجازت ہے؟"

"ہرگز نہیں" مُفتی نے ڈانٹ کر کہا۔

"کمنٹ کرنے کی مُفتی؟" مسعود نے پوچھا۔

"بالکل نہیں" مُفتی نے پہلے سے بھی اونچی آواز میں حکم دیا۔

"تسلیم کرنے کی تو اجازت ہے ناں مُفتی جی" اعظمی نے لجاجت سے پوچھا۔

"قطعی نہیں" مُفتی اور زور سے گرجا اور کوہساتی حیرانی سے ہم سب کا منہ تکنے لگا۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا کہ سکول میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ گھر سے مجھے خوف آتا تھا۔ قصبہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور کھجیوں والی حویلی کے کھنڈر میں ایسی وحشت بھری تھی کہ اس کے ارد گرد منڈلاتے رہنے کو دل چاہتا تھا۔ میں خوفزدہ بھی تھا اور عشق میں بھی مبتلا تھا۔ تجسس بھی تھا اور یوں بھی لگتا تھا جیسے کھیت کنارے جھاڑی پر کالا گھاگھرا سوکھنے کو ڈالا ہوا اور بھیڑوں کا ریوڑ اس راہ سے گزر رہا ہو۔ بھیڑیں خوفزدہ ہو کر کالے گھاگھرے سے کنی بھی کاٹتی جائیں گی اور اسے دیکھنے اور جاننے کی آرزو میں گردنیں بھی گھماتی جائیں گی۔ ان کا رخ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ چال بنگی ہو جائے گی اور سارا ریوڑ سیدھا چلنے کے بجائے پہلو کے رخ چلنے لگے گا۔ ایک گھاگھرے کی بدولت۔ ویسے ایک گھاگھرے کی وجہ سے بڑی بڑی فوجوں کے رخ بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ تو بیچاری بھیڑیں ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میسری تھی۔

ایک روز دل کڑا کر کے میں دِتّو ملنگ کے کھنڈر میں چلا گیا۔ وہ صحن کے درمیان پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ کر بوٹی پی رہا تھا اور روندا ہوا بندر سا دکھائی دے رہا تھا۔ کھنڈر کی گری ہوئی دیوار کے پیچھے سے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے بڑی بوٹی کا کٹورا اپنے پیچھے چھپا لیا اور خالی انگلی کے ساتھ جلدی جلدی دانت برش کرنے لگا۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی منجن والی انگلی روک کر کالی نیلی اینٹوں کی طرف اشارہ کیا اور میں چپ چاپ اس خستہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں اس طرح خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر آسمان کو دیکھتا رہا اور میں اس کے ماحول، اس کے ساز و سامان اور اس کی شکل و صورت کا جائزہ لیتا رہا۔

پھر وہ اٹھا اور اپنے بھٹ کے اندر چلا گیا۔ اس کا یہ بھٹ پرانی پتلی گیرو والی اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈربہ تھا جو کسی زمانے میں کھجیوں کی مرغیوں کا کھڈا رہا ہوگا۔ اس کے باہر غلاظت کے انبار تھے اور اس کی چھت ایک طرف سے اندر کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ بھٹ میں داخل ہونے کے لیے وہ چوپایوں کی طرح اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اندر جاتا تھا اور اسی طرح باہر آتا تھا۔

میں بڑی دیر تک اینٹوں کی اس کرسی پر اسی طرح بیٹھا رہا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بھی ایک بندر ہوں اور دِتّو ملنگ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ بندروں سے اپنا ناطہ توڑنے

کے لیے میں نے اپنی نشست کا انداز بدلا لیکن پھر بندر کا بندر ہی رہا۔ میں نے اپنی ٹانگیں آگے کو پھیلا دیں۔ پھر بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ آخر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

صحن کے اندر جابجا چولائی، دھتورے، پوہلی اور بھکڑے کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ دیواروں میں ادھر ادھر پیپل کے نوجوان پودے لہلہا رہے تھے اور جو تناور ہو گئے تھے انہوں نے دیواروں کو گرا دیا تھا اور اب گرے ہوئے ملبے کے ڈھیر میں ایستادہ ہو گئے تھے۔ کوٹھڑیوں اور کمروں کی دیواریں کھڑی تھیں لیکن سب کی چھتیں گر چکی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے دروازوں سے بے چھت دالانوں کی روشنی ننگی دیوانی عورت کی طرح کھڑی تھی۔ نہ ادھر دیکھنے کو جی چاہتا تھا نہ اُدھر سے نظر ہٹانے کو دل کرتا تھا۔

دِتّو ملنگ لنگور کی طرح اپنے بھٹ سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک نوالا اور گہرے سبز رنگ کی ایک بوتل تھی۔ وہ لپک کر پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور نوالے سے روٹی توڑ توڑ کر باریک اور لمبی لمبی پونیاں بٹنے لگا۔ پھر اس نے روٹی کا آدھا نوالا توڑ کر میری طرف پھینکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ مسل تو بھی بنا۔ میں نے پہلے ہاتھ سے پونی بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر میں نے قریب پڑی ہوئی ایک سینک اٹھائی اور اس کی مدد سے پونی بٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے سینک کی مدد لیتے ہوئے دیکھ کر پہلے وہ مسکرایا، پھر ہنسا اور آخر میں ایک بہت بڑا قہقہہ مار کر پہلے کی طرح خاموش ہو گیا۔

"کیا سال خوفناک تنہائی ہے۔" اعظمی بولا۔ "دیکھو اس کو۔"

"کس کو؟" عمّاد نے پوچھا۔

"اس کو جو یہ قصّہ سُنا رہا ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "کوئی میں زندہ رہنے کے اثر آثار۔ اگر اس کو سچ بھی مان لیا جائے تو بھی اس پر یقین نہیں آئے گا۔"

"لیکن شاہ جی۔" مسعود نے کھی کھی کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ سالا تم سے پونیاں کیوں بٹوانے لگا؟"

"شکر کرو پونیاں ہی بٹوا رہا ہے۔" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ اس نے اور بہت کچھ بٹوا لیا تھا۔"

"مر گیا؟" مفتی جی نے اچانک پوچھا۔

"نہیں مر مرا کہاں۔" میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ تو پاکستان بننے کے آٹھ سال پہلے تک

وہیں رہا پھر اس کے بعد اچانک غائب ہو گیا۔"

"تمہیں بھی بتا کر نہیں گیا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"نہیں اس نے مجھے اپنے یہاں آنے جانے کی مناہی کر دی تھی۔"

"اس کھنڈر میں آنے کی مناہی کر دی تھی؟" عماد نے پوچھا: "اس لنگور نے؟"

"ہاں اس نے میری گُدّی پر اپنا تیلیا ہاتھ جما کر زور سے دھکا دیا تھا اور کہا تھا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"لیکن کیوں؟" مفتی جی نے پوچھا "کس لیے۔ کیوں وہ اس قدر اگریسو ہو گیا؟"

اس کا ایک شوق تھا مفتی جی اور وہ شوق اس کو دل و جان سے پیارا تھا۔ وہ تازہ دھنکی ہوئی رُوئی کی پُونی مٹی کے تیل میں تر کر کے اپنی مقعد میں رکھ لیتا تھا۔ تقریباً ایک چوتھائی اندر اور تین چوتھائی باہر۔ پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر اور دونوں ہاتھ باندھ کر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور اپنے بڑے پتھر کے آس پاس آ جاتا۔ وہاں سے ماچس اُٹھا کر تیل میں بسی ہوئی شُکتی بتی کو دیا سلائی دکھاتا اور چیخیں مارتا ہوا کھنڈر کے صحن میں چکر لگانے لگتا۔ جوں جوں آگ اُوپر کو لپکتی توں توں اس کے نعرے اور چنگھاڑیں بلند ہوتے جاتے۔ ان نعروں اور للکاروں میں کرب بھی ہوتا اور پکار بھی، لذت بھی اور خوف بھی، خود ستائی اور رجز خوانی بھی، عاجزی اور بینتی بھی۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور وہ ہانپتا ہوا بڑے دالان کی دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی رانوں کے درمیان سے دھواں بھی نکل رہا ہوتا اور آبلوں کا پانی بھی ٹپک رہا ہوتا۔ اس وقت وہ آسمان کی طرف منہ کر کے اس طرح گڑگڑاتا جیسے جوانی میں قدم رکھنے والا بچھیرا گھوڑی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ہنہنایا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور پھر آہستہ آہستہ اس کے حلق سے ایسی آواز نکلنے لگتی جیسے کوئی بے چھلے ہوئے گنے کی پوری ایک طرف چاقو اور دوسری طرف انگوٹھے کے دباؤ سے گول گول کاٹ رہا ہو۔

جب میں یہ بات کر رہا تھا تو ہم سب نے رستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ مفتی اور مسعود مجھ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور دوسرے تینوں اپنی اپنی سوٹیاں سینے کے ساتھ لگا کر اپنے آپ کو جپھیاں ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کانٹا کیسا؟" عماد نے پوچھا۔

"فورک۔ جس سے کھانا کھاتے ہیں۔ چھری کانٹے والا کانٹا۔"

"وہ اس سالے کے پاس کہاں سے آ گیا؟" اعظمی نے پوچھا۔

"بس آ گیا کہیں سے تم کو اس سے کیا۔" مفتی نے خفگی سے کہا اور مجھے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا: "تھوڑی دیر تک وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑ کر کانپتا رہا۔ پھر کراہنے لگا اور جب اس کے حلق سے چاقو سے گنڈیری کٹنے والی آواز آنے لگی تو ایک دم بجلی کی تیزی سے اُچھلا اور وہ کانٹا اس پیپل کے پتے میں بھونک دیا۔ کانٹے کی چاروں آہنی انگلیاں پتے میں سے گزر کر زمین میں دھنس گئیں اور اس کا دستہ زمین پر عمود گرانے لگا۔ پھر وہ تو خوشی کے ساتھ اچھلا اور دائیں چرخ کُنی بائیں گُنے سے ہاتھ میں رکھ کر کھڑی بانہہ کا گھونسا بنا کر گھوڑا اشیاری کرنے لگا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ وہ اس گھینپے ہوئے کانٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا اور میں خوف کے ساتھ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس دن جیسا خوف مجھے پھر کبھی نہیں آیا۔

اگلی صبح قصبے کے لوگوں نے دیکھا بابا کریا اپنے کھیت میں اوندھا گرا ہوا ہے اور دھرا اڑنے والی ترانگل اس کی کمر اور پسلیوں میں سے گزر کر زمین میں دھنسی ہوئی ہے۔"

"ترانگل کیا؟" اعظمی نے پوچھا۔

"ریک نہیں ہوتی آر اے کے ای۔ ریک۔" میں نے کہا۔ "لکڑی کی وہ لاٹھی جس کے آگے فولاد کی فٹ فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کی تیز نوکیں لگی ہوتی ہیں۔"

"اسے جس سے کسان لوگ گندم پر سے پرالی چھاپے، لانگا وغیرہ اُٹھاتے ہیں، جس سے دھرا اڑا اڑا کر بھوسہ اور دانہ الگ کرتے ہیں؟" مسعود نے بتایا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" لیڈر نے کہا "بڑا سا کانٹا ہوتا ہے لمبا ڈنڈا اور آگے تیز تیز فولادی انگلیاں۔"

"بس بس وہی۔" میں نے کہا: "اس ترانگل کی پانچ تیز تیز فولادی انگلیاں بابے کریے کے پنجر میں سے گزر کر چھ چھ انچ تک زمین میں دھنس گئی تھیں۔ خون مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔ بابے کی ایک جوتی اُتری ہوئی تھی اور دوسری بدستور پیر پر موجود تھی۔

پولیس نے آ کر نقشہ بنایا اور گاؤں کے قصائی، جس نے بابے کریے سے سو روپے ادھار مانگے تھے

ایک شام بابے کریمے نے وڈّو ملنگ کو اپنے کھیت کے قریب سے گزرتے دیکھ کر اس پر ساتھ ہوا ایک کڑوا تُمّا پھینکا۔ تُمّا اس کے گھون مون تیل چپڑے سر پر لگا اور پھٹ گیا۔ وڈّو ملنگ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر چکھا تو تڑپ کر تھو تھو کر دی۔ اس کے تھو والے احتجاج پر سب مزارع کھکھلا کر ہنس پڑے اور اپنی دائیں کہنیوں کے نیچے بائیں ہتھیلیاں رکھ کر کھڑے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے فحش طریقے پر ہلانے لگے۔ کل پانچ مزارع تھے اور پانچوں کے پانچوں قطار میں کھڑے اس طرح گھوڑا ہشیار کر رہے تھے۔ بابا کریما ان کی کارکردگی دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ گو اوپر اوپر سے کہہ رہا تھا: "نہ کرو اوئے مُنڈیو نہ کرو۔ بس جان دیو۔"

تھوڑی دیر تو وڈّو ملنگ کھڑا ان کی طنز کا نشانہ بنتا رہا۔ پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر آگے کو روانہ ہو گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن ہم میٹرک کے داخلے کے فارم بھر کر گھر آئے تھے اور ہوشیار پور سے ماموں نذر ہمارے لیے اور اپنی بہن کے لیے بہت ساری سوغاتیں لے کر آئے تھے۔ میرے ایک ہی ماموں تھے اور جب یہ ہمارے گھر آ جاتے تو سکول جانا، دوستوں سے ملنا، کھیل میں شامل ہونا، آوارہ گردی کرنا سب موقوف ہو جاتا۔ لیکن اس شام ماموں نذر کی آمد کے باوصف میں وڈّو ملنگ کے کھنڈر میں پہنچ چکا تھا۔ اس وقت وہ تیسری مرتبہ نلیتہ لگا کر اپنی اسے نس کو بُری طرح جھلس چکا تھا اور کراہنے کے بجائے مسکرا رہا تھا۔

جب میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسکرا کر پہلی مرتبہ مجھے دعا دی: "جیا رہ بیٹے جیا رہ" اور آ کر اپنی پتھر والی نشست کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دو اینٹوں کے درمیان سے پیپل کا ایک پژمردہ پتا نکالا اور اس کو اپنے سامنے زمین پر رکھ کر گھورنے لگا۔ پھر مجھے سلور کا کٹورہ دے کر سر کے اشارے سے پانی لانے کے لیے کہا۔ میں اس کی ٹوٹی ہوئی کھلیا سے پانی لایا تو وہ پتے کے دونوں جانب پاؤں رکھ کر یوں بیٹھ گیا جیسے تھڑے پر بیٹھتے ہیں۔ پھر اس نے کٹورے کا پانی اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا جو باریک سی تیلیوں کی شکل میں اس کی پیٹھ اور پہلوؤں سے بہہ گیا۔ گویا وہ اس پتے پر بیٹھ کر نہا گیا۔

جب یہ عمل ختم ہو گیا تو اس نے مجھے کٹورے بھرنے کے لیے کہا۔ میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے پتھر کے نیچے سے ایک کانٹا نکال لیا۔

اور منہ ملنے پر سواد چکھانے کی دھمکی دی تھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں بھاگا بھاگا وڈّو ملنگ کے اڈے پر پہنچا تو اس نے اپنا تپلیا ہاتھ میری گھُتّی پر جما کر زور سے دھکا دیا اور کہا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہو گا۔

اور یہ جو آدمی ابھی ہمارے قریب سے گزر گیا ہے اور جس نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا مجھے وڈّو ملنگ لگتا ہے، حالانکہ اس کی عمر اس سے کم ہے۔ اس کی جلد اس سے ملائم ہے۔ اس کے سر اور چہرے پر گھنے بال ہیں۔ پھر بھی یہ مجھے وہی لگتا ہے۔

مسعود، تُو، زاہد عظمیٰ، عمر اور مفتی گردنیں لمبی کر کے پیچھے جاتے ہوئے نقطے کو غور سے دیکھنے لگے کہ شاید اس کی رانوں کے درمیان سے مٹیالا دھواں اُٹھ رہا ہو۔

وڈّو ملنگ کے واقعے نے ہم سب کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر دیا۔ اصل میں واقعہ بیان نہ بھی ہوتا تو بھی ہمیں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ضرور ہو جانا تھا۔ گفتگو کے بعد خاموشی آپ ہی در آتی ہے۔ جنگوں میں بھی جب دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہوا کرتی ہے، تو ایک وقفہ خاموشی کا آ جاتا ہے۔ کہ سن کر یا کسی وقت مقررہ پر نہیں، بس یوں ہی، بغیر سوچے سمجھے۔ بغیر جھنڈی ہلائے۔ کسی کاشن یا آرڈر کے بغیر، بنا سوچے سمجھے۔ طوائف اور تماش بین کے درمیان بھی خاموشی کا ایک طویل لمحہ آ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پُرشور پانیوں میں بھی اچانک سکوت آ جاتا ہے۔ شاید آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ ایک ساتھ چلتی ہوئی بہت سی مشینیں بھی ایک وقت خاموش ہو جاتی ہیں، حالانکہ وہ چل رہی ہوتی ہیں، لیکن آپ کے کان کا شور نہیں ہوتا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور خاموش تھے، جیسے نوجوان گایوں کے گلے میں اونچی کوہان اور مضبوط پٹھے والا سانڈ چلا کرتا ہے اور اس کے گلے کی جھالریں آدھے پونے بھنور سے پیدا کرتے ہیں۔

اچانک ایک مضبوط، دل دار، سرسبز اور وزنی پتّہ لیڈر کی گردن پر آ گرا۔ وہ تڑپ کر اچھلا اور اُس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

ہمارا لیڈر بھی دوسرے لیڈروں کی طرح بزدل اور ظالم ہے۔ وہ اندر سے مسلسل لرزتا رہتا ہے اور باہر سے ہر ایک کی سرزنش کیا کرتا ہے۔ اس کا قد چھوٹا، بدن مضبوط اور آنکھیں تیز ہیں۔

بدبختی اور ڈسپلن کا قائل ہے اور اس کے ہاتھ کی چھڑی کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہم نے متفقہ رائے سے اس کو اپنا لیڈر چنا ہے اور اگر ہم اسے اتفاق رائے سے نہیں چنتے تو بھی وہ ہمارا لیڈر ہوتا، کیونکہ اُس میں ایک اچھے لیڈر کے سب خصائص موجود ہیں اور ایسے خصائص والا آدمی لیڈر بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسعود نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا ہُوا لیڈر، کیا ہُوا؟"

تو لیڈر نے اپنی گُدی پر ہاتھ رکھے رکھے اسے یُوں گھور کر دیکھا جیسے لیڈر غصّے کے وقت دیکھا کرتے ہیں۔

"کچھ تھا، بہت وزنی،" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جیسے کوئی پتھر ہو۔"

"لو جناب! یہ پتھر ملاحظہ فرماؤ۔" اعظمی نے جھک کر زمین سے وہ پتّا اٹھایا اور ہم سب کی نظروں کے سامنے گھما دیا: "دیکھا آپ نے یہ فولادی پتھر۔ گریبان گیر جو ہماری قیادت کی گردن سے چمٹ گیا۔"

"اور قیادت یُوں اچھلی تھی جیسے سانپ کی دُم پر پیر آگیا ہو" ــــــ مسعود نے ہنس کر کہا۔

عماد نے وہ پتّا اعظمی کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھا اور پھر مفتی کو دیتے ہُوئے بولا: "ہو سکتا ہے مفتی جی، یہ ویسا ہی پتّا ہو وہ تو ڈنگ والا۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں،" مفتی بولا۔ "ہر پتّے کی ایک اپنی مقناطیسی فیلڈ ہوتی ہے۔"

عماد نے ہنس کر کہا:

"آپ کے خیال میں یہ پتّا ریڈیو ایکٹو ہے؟"

"جی جناب!" اعظمی سنجیدگی سے بولا۔ "اگر یہ پتّا چارجڈ نہ ہوتا، تو لیڈر اس طرح سے کیوں اُچھلتا پھلا ــــــ نباتات کی زندگی کے کچھ پہلو حیوانی زندگی سے بھی کڑے ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی،" مسعود نے کہا۔ "اس کو معلوم ہے اچھی طرح سے۔ یہ خود برسیم کی مُنڈی رہ چکا ہے، ریڈیو میں آنے سے پہلے۔"

کوہستانی نے حیرانی سے اعظمی کی طرف دیکھا۔ سارے سفر کے دوران میں اس کا یہی خیال تھا کہ اعظمی بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ لیکن مسعود کی بات سے وہ تذبذب میں پڑ گیا اور آہستہ سے پُوچھنے لگا:

"کون؟ یہ صیب؟ عینک والے؟"

"بالکل خان! یہی،" مسعود نے جواب دیا۔ "یہ پہلے مُنڈی ہوتا تھا۔ پیغمبر کی دُعا سے آدمی بن گیا۔"

"سُبحان اللہ جی!" کوہستانی نے اپنا ہاتھ چُوم کر ماتھے پر رکھا اور سر ہلا کر کہا: "وہ تو اللہ کے فضل سے جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"یہ تو خیر بکواس کرتے ہیں خان!" اعظمی نے پتّا سونگھ کر کہا۔ "لیکن درختوں میں اور پتّوں میں اور بُوٹوں میں بھی ہماری طرح سے جان ہوتی ہے۔"

"پہلے نہیں ہوتی تھی صیب!" کوہستانی نے کہا۔ "پر جب حضرت زکریا علیہ السّلام نے بھاگ کر درخت میں پناہ پکڑی اور ظالم کافروں نے تنے کے ساتھ ان کو بھی چیر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے کہا صبر کرو۔ ۔ ۔ صبر کرو زکریا۔ اب نہیں بولنا۔ شور نہیں مچانا اور حضرت زکریا نے صبر کیا جی، تو پھر سارے درختوں میں جان پڑ گئی۔ ان کا رُوح ہے جی، پیغمبر علیہ السّلام کا ان میں۔"

"شاباش،" اعظمی نے کہا۔ "تم تو پیغمبروں کے راز سے بھی واقف ہو اور ان گدھوں کو دیکھو سب پڑھ لکھ کر برباد کر دیا۔"

مفتی نے کہا:

"دیکھو یار! اس علاقے کی اکولوجی کس قدر مختلف ہے۔ کوہستانی بھی ایسے بول رہا

ہے جیسے ڈاکٹر ینگ بات کر رہا ہو۔ جیسے ماں پریوں کا اور طلسم کا راج اس علاقے میں!"

ہم چل تو رہے تھے، لیکن لیڈر بار بار اپنا ہاتھ گدی پر لے جاتا تھا۔ حالانکہ پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا۔

"اس پتے پر" اعظمی نے کہا: "بڑی ضد ہے، ڈنڈی سے پکڑ کر مروڑی دو، تو ایک آدھ پھیری سے زیادہ نہیں گھومتا۔ واپس مڑتا ہے، بڑا ہٹ دھرم ہے۔"

"پھر؟" عماد نے پوچھا۔

"پھر کیا!" اعظمی بولا۔ "دوسرے جانداروں کی طرح اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ابھی تک اس میں زندگی کی قوت باقی ہے۔"

"ساتھ جذبہ خودی بھی رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "زناری برگساں نہیں ہے۔"

"اب تم لوگوں کو تو مذاق سوجھ رہا ہے۔" اعظمی نے خفگی کے ساتھ کہا: "یہ محسوس کرنے والی چیز ہے، تمہارے جیسی گمار نہیں ہے۔"

مفتی نے کہا:

"اس معاملے میں اعظمی کے ساتھ جھگڑنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اس کی فیلڈ ہے...."

"اور اس میں یہ جب چاہے باؤنسر پھینک سکتا ہے۔" مسعود نے بات کاٹی اور سب ہنسنے لگے۔

پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کو مروڑیاں دے رہا تھا:

"یہ دیکھو مفتی... یہ دیکھو۔" اس نے مفتی کو پتے کی سرتابی دکھائی اور مفتی یونہی اس کا دل رکھنے کو "ہاں ہاں! کیوں نہیں، کیوں نہیں" کرنے لگا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور اعظمی کہہ رہا تھا:

"پودوں کی بھی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اس وقت اسے میں سخت ناپسند ہوں اور میرے جوہر حیات کی لہروں سے یہ پتا گھبرایا اور رچنایا ہوا ہے اور ابھی کوئی ہاتھ اسے تھام لے، تو شاید اس کی بے چینی اور سرکشی دور ہو جائے۔"

"وہ ہاتھ نیچے رہ گیا۔ بہت نیچے۔ آبادی میں۔ ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس سے اس کا دل مل جائے۔ فی الحال یہ تمہارے پاس ہی ٹھیک ہے۔"

عماد نے کہا:

"مفتی صاحب! اسے آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپ ہم سب میں زیادہ بزرگ اور حاجی ہیں۔"

"ناں ناں مفتی ناں!" لیڈر چیخا۔ "تم اس کے نزدیک نہ جانا۔ چنڈ مارے گا۔"

مفتی نے ہنس کر کہا:

"مجھے معلوم ہے۔ میں زندگی میں ہر پھول اور ہر پتے سے چنڈیں کھا چکا ہوں۔ میں اس کے نزدیک جاتا ہوں بھلا!"

اعظمی نے کہا:

"کپاس چننے والیاں ہمیشہ عورتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں، ولایت میں، امریکہ میں کوئی مرد یہ کام نہیں کر سکتا۔ کپاس کا پھول مرد کا ہاتھ پسند نہیں کرتا۔"

مفتی رُک گیا۔

"وجہ یہ ہے مفتی کہ مرد کے ہاتھ کی ویو اور کپاس کے پھول کا جوہر حیات ایک دوسرے کے بالکل اُلٹ ہیں۔ پھٹی کوکلے سے باہر نہیں نکلتی۔ زور لگاؤ، تو آدمی کوسے میں جھنی رہ جاتی ہے۔ کچھ زمین پر گر جاتی ہے۔ نکل آئے، تو سوکھی شاخوں میں پھنس جاتی ہے۔ میں نے ملتان اور نواب شاہ کے کسانوں سے پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روئی کو خراب کرنا ہو تو مردوں کو پھٹی چننے کے لیے کھیت میں داخل کر دو۔"

"وہ تو اس لیے ہوتا ہے میرے بھائی کہ" عماد نے کہا۔ "ایک تو عورتوں کے ہاتھ چھوٹے اور انگلیاں باریک ہوتی ہیں۔ دوسرے انہیں اُجرت کم دینی پڑتی ہے۔ تیسرے ملتان اور نواب شاہ کے مرد ویسے بھی سست ہیں۔"

مفتی نے کہا:

"یہ سب بکواسی لوگ ہیں اعظمی۔ تو مجھے بتا۔"

"اور اس میں ذرا نفسیاتی تیج لگا دینا" مسعود نے ہنس کر کہا۔ "کچھ فرائیڈ کی تھیوری بھی لگا دینا کسی پودے کے ساتھ۔ بدنظری اور بدفعلی کی۔"

"بالکل! اس میں کیا جھوٹ ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "گوئٹے اس بات کا ثبوت بہم کرتا، تو ختم ہو گیا بیچارا۔"

"گوئٹے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ ہمارا جرمنی والا۔ فاؤسٹ کا مصنف!"

"جناب!" اعظمی نے چیخ کر کہا اور اس کی چیخ خاموشی میں خروف بن کر گونجی۔ "وہی۔ شاعر، ناول نگار، فلسفی، آپ کا جرمنی والا ۔۔۔ آپ ہی کے اٹلی میں جا کر دو سال رہا اور وہیں اس نے اعلان کیا کہ پودوں میں بھی نر مادہ ہے اور ان میں بھی بھوگ ہوتا ہے۔ لمبی ایستادہ ڈنڈی نر ہوتی ہے اور گھومتی بل کھاتی ڈنڈی مادہ ہوتی ہے۔ پودا ہماری دنیا میں زندگی کا واحد ترجمان ہے، جس کی مادہ اندھیرے میں بڑھتی پھیلتی اور پھولتی ہے اور کشش ثقل کے خلاف چلتی ہے اور اس کا نر ہماری آپ کی اور دوسرے جانداروں کی طرح روشنی میں چلتا ہے اور کشش ثقل کے مطابق چلتا ہے۔"

اعظمی کی یہ بات سن کر ہم سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگا:

"گوئٹے کو نیوٹن سے تو یہی شکایت ہے کہ اس نے گریویٹیشن کی بات تو کی، لیکن لیویٹیشن کی بات نہ کر سکا۔"

"لیویٹیشن کیا!" ہم سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

"کشش ثقل کے خلاف اٹھنا" مفتی نے کہا۔ "جیسے بزرگ بغیر کسی مادی مدد کے زمین سے اوپر اٹھ جاتے ہیں، جیسے اولیاء اللہ ہوا میں اڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ

جاتے ہیں۔"

اعظمی نے کہا:

"نیوٹن نے یہ تو دیکھ لیا کہ سیب اوپر سے نیچے کو گرا، لیکن یہ نہ معلوم کر سکا کہ اوپر کیسے چلا گیا، درخت پر۔"

"تیرے کو نہیں گدھا!" لیڈر نے کھیج کر کہا۔ "سیب درخت کو نہ لگتا، تو اور تیرے باپ کو لگتا۔"

مفتی نے کہا:

"تم آگے بات کرو اعظمی! یہ بے وقوف لوگ ہیں، ایسی باریک بات کو نہیں سمجھیں گے۔"

"دیکھیں مفتی جی!" اعظمی نے کہا۔ "جس طرح کشش ثقل کی فیلڈ سے دور ہونے پر آہستہ آہستہ اس کی کھینچ کم ہونے لگتی ہے اور وہ کمزور ہونے لگتی ہے، اسی طرح لیویٹی کی فیلڈ سے نکلنے پر اس کی اٹھانے کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ کشش کا مرکز اندر ہے، لیویٹی کا باہر۔ یہی وجہ ہے کشش کی وجہ سے چیزیں گرتی ہیں اور لیویٹی کی وجہ سے اٹھتی ہیں۔"

"کیسے کیسے؟" عماد نے پوچھا۔

"گویا گریویٹی کا مرکز زمین میں ہے" مفتی نے کہا۔ "اور لیویٹی کا کاسمک ورلڈ میں۔"

"شاباش!" اعظمی کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھلکھلا اٹھا۔ اس نے مفتی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "دیکھو مفتی جی! طوفان، بادل، باراں، سیلاب، گریوٹی کی وجہ سے زمین کی طرف کھنچتے ہیں اور آتش فشاں مادہ لیوٹی کے زور پر آدھا آسمان کی طرف لپکتا ہے۔"

پتہ نہیں اعظمی کی بات کہاں تک درست تھی اور اس نے چٹکلے جمع کرتے کرتے یہ علم کدھر سے سیکھ لیا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

عماد ابھی تک اس مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چھڑی اعظمی کے کندھے پر ماری اور کہا:

"تمہارا مطلب ہے لیونی کا مرکز ایتھر ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔" اعظمی نے کہا۔ "لیکن اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں گریوٹی کی پل (PULL) کم ہونے لگتی ہے، وہیں سے لیونی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

"یہ بھی آیا مفتی کی لائن پر!" مسعود نے ہنس کر کہا۔ "پتہ نہیں لوگ آخری عمر میں مفتی کی نقل کیوں اتارنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ساری زندگی اس کا سارا زور جنس پر رہا ہے۔"

"ایسا نہیں!" اعظمی نے شرارت سے کہا۔ "اس کے علم کا۔"

مفتی نے ایک لمبی سانس لی اور رک کر بولا:

"اب میں تم جیسے جاہل لوگوں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ یہ جنس، محبت، معرفت، عبادت ایک ہی حقیقت کی مخصوص کروٹیں ہیں۔ کبھی ان کے درمیان خط کھچ جاتا ہے، کبھی نہیں کھچتا۔ کبھی کسی حصے سے ایک مخصوص خوشبو آنے لگتی ہے، کبھی نہیں آتی۔ لیکن زیادہ کیفیت گھل ملی سی رہتی ہے، جیسے گلاس کے اندر برف کی ڈلی۔ الگ بھی ہوتی ہے اور پانی کا ایک حصہ بھی —— الگ سے دیکھو تو کنارہ رکھتی ہے، لیکن پانی میں چھوڑ دو، تو کنارہ نظر نہیں آتا۔ جو پگھل رہا ہو وہ پانی ہے۔ جو نظر آ رہا ہے وہ ڈلی ہے۔ کچھ لوگ ڈلی کو جنس کہتے ہیں، عبادت کو پانی سمجھتے ہیں اور حباب کو معرفت تصور کرتے ہیں، لیکن ہے ایک ہی بات۔ سب شاخیں سرکاری ہیں!"

"کچھ ڈی ایچ لارنس کا سا فلسفہ ہے یہ۔"

"او سے لارنس کے باپ کا ہے گدھے۔" مفتی چڑ کر بولا۔ "اس سے بہت پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں جنس کی اور فیلس کی پوجا ہوتی رہی ہے۔ آج بھی سارا یورپ تنترا کی طرف لوٹ رہا ہے۔"

"تنترا!" عماد نے حیرت سے پوچھا، تو لیڈر کو غصہ آ گیا۔ اس نے جھڑک کر کہا۔ "جنتر منتر نہیں سنا؟ ہم نے ایک پروگرام نہیں کیا تھا اس پر!"

"یہ وہ تنتر نہیں گوتے!" مسعود نے کہا۔ "یہ دوسرا تنتر ہے مفتی والا۔"

"بھائی جی!" مفتی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "اگر جنسی اتصال کو پاکیزگی کے ساتھ

اور تمام لوازمات تقدس کو ملحوظ رکھ کر عمل میں لایا جائے، تو اس سے ایک روحانی برقی قوت پیدا ہوتی ہے۔"

"کس میں؟" لیڈر نے بے چینی سے پوچھا۔

"کسی شخص میں نہیں۔" مفتی نے کہا۔ "ماحول میں گرد و پیش میں۔ تمام اجسام موجود ہیں۔ اس سے وہ الٹرا ریز معرض وجود میں آتی ہیں جو روح کی بالیدگی کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر انسان پورے تیس منٹ اسی حالت میں پرسکون، خاموش، چپ چاپ اور بے حس و حرکت رہے تو اٹھائیسویں منٹ پر ایک نورانی کلک ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے لازم شرط پاکیزگی کی ہے اور فریقین کا مطہر روح ہونا ضروری ہے۔ خدا جانے کہاں تک درست ہے، لیکن میں نے پبلک لائبریری کی ایک کتاب میں دیکھا تھا، سن سنتالیس میں۔ مجھے اس کی تفصیلات اچھی طرح سے یاد تھیں، لیکن ان دنوں لاہور میں بہت سے نامی لوگ تانگوں میں گھوما کرتے تھے۔ جن میں سے ایک کے ساتھ میری جھڑپ ہو گئی تھی اور اس نے میری ٹھوڑی پہ زور کا مکا مارا تھا۔"

"اور تو نے کچھ نہیں کیا؟" لیڈر نے غصے سے کہا۔

"انگریز کا زمانہ تھا۔ جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی اور میں بھی ان سے کمزور تھا۔"

یہ اس زمانے کی بات ہوگی جب مفتی قصور میں اسکول ماسٹر تھا اور اس پر کئی مقدمات بنے ہوئے تھے اور اس کا اس بھری پری دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا۔

اعظمی نے کہا:

"مفتی! پودوں میں یہ اتصال بڑی پاکیزگی سے ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے پھولوں اور پھلوں کی کثرت اور ان کے دانوں کا شمار دوسری ساری مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہر طرح سے مفید ہے۔ پاکیزگی اپنے لیے بھی نعمت ہے اور ماحول کے لیے بھی خیر کثیر کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان اور حیوان اس نعمت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شریعتوں میں بعض جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور بعض کو نجس۔"

عماد کو یہ بات درست معلوم ہوئی اور وہ بڑی حد تک خاموشی کے ساتھ اثبات میں سر

ہلاتا رہا۔ اچانک کوہستانی ہماری ٹکڑی سے یوں رپٹا جیسے اس کو بارود لگ گئی ہو۔ اس نے سامنے کے دو تین بڑے پتھروں پر اپنے قدم جمائے اور پہاڑ پر پندرہ بیس فٹ اونچا چڑھ گیا۔ ایک چھوٹے سے نشان پر پانی رسنے کی وجہ سے کائی پیدا ہو چکی تھی اور وہاں کُکرمتے کی شکل کی نباتاتی چھتریاں سی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک پھول تھا جسے کوہستانی نے پہلے اونچی آواز میں السلام علیکم کہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ دعا مانگی اور وہ پھول توڑ لیا۔ جس تیزی کے ساتھ وہ اونچائی پر چڑھا تھا اسی سرعت سے واپس آ گیا اور اپنی محبت اور عقیدت کا یہ تحفہ اعظمی کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ عجیب سا پھول تھا۔ لمبا ڈنٹھل، عام پنسل کے گھیر کا۔ آگے ایک بیضوی سرسبز گانٹھ کسی قدر ملائم، اس کے بعد سبزی مائل پیلے رنگ کی پتیوں کی ابتدا جو درمیان میں جا کر بنفشی ہو گئی تھی اور آخر میں ان کی نوکیں ایک سیاہ گول کنارے کے ساتھ مل گئی تھیں۔ یہ سیاہ کنارہ کیسٹ کے ٹیپ جتنا چوڑا تھا اور کافی مضبوط نظر آتا تھا۔ اندر سندھوری رنگ کا ایک چھوٹا سا انگشتانہ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ تھے۔ اعظمی نے اس پھول کو غور سے دیکھ کر کہا:

”فینا فلور جبرئیٹم اس ہے۔“

میرا مطلب ہے اس نے کچھ اس قسم کا نباتاتی نام لیا تھا اور ہم اس کے علم نباتات کے آگے خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے۔

کوہستانی نے کہا:

”اس کو بسم اللہ کر کے زور سے سونگھو صیب!“

جب اعظمی سونگھنے لگا، تو کوہستانی نے اس کا ہاتھ روک لیا اور پھر بولا:

”سونگھتے وقت قل ہو اللہ شریف پڑھنی ہے اور ایک ہی سانس میں۔“

”اس کا کیا فائدہ؟“ اعظمی نے زچ ہو کر پوچھا۔

”بس ہو گا نا، یار کوئی!“ مفتی نے کہا۔ ”جو وہ کہتا ہے کرو، اپنا علم ہر جگہ نہ اچھالا کیا کرو۔“

اعظمی نے وہ پھول مطابق ترکیب استعمال سونگھا اور پھول مسعود کو دے کر بولا: ”کچھ بھی نہیں۔ سالے میں کوئی خوشبو ہی نہیں!“

مسعود نے سونگھا۔ تو اس نے بھی بے خوشبوئی کا اعلان کیا، پھر ہم سب نے باری باری اس کو سونگھا اور مفتی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے پھول ہاتھ میں لیے بغیر بڑی متانت سے کہا:

”اب میرے سونگھنے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں خوشبو تو نہ سہی۔“

پہلے اعظمی زمین پر بیٹھا، اس کے بعد مسعود اور پھر ہم سب۔ کوئی چوکڑی مار کر، کوئی ٹانگیں آگے پھیلا کر، کوئی پتھر سے ٹیک لگا کر۔ صرف مفتی اور کوہستانی کھڑے تھے اور ہمارے سامنے نیچے کی وادی ڈھائی تین ہزار فٹ نیچی، چھوٹے چھوٹے درختوں اور ننھے ننھے پہاڑی ٹیلوں والی، آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی، جیسے کمہار کا گھومتا ہوا چاک آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔

وہ اوپر کو چڑھ رہی تھی اور جہاں ہم بیٹھے تھے وہ زمین نیچے کو جا رہی تھی جیسے اوپر کی منزل سے لفٹ نیچے کو جایا کرتی ہے، لیکن ان دونوں مخالف حرکات کے باوجود سارا منظر جوں کا توں ہمارے سامنے موجود تھا۔

اعظمی نے کہا:

”بارش آ رہی ہے۔“

”ہاں آ رہی ہے“ لیڈر نے جواب دیا۔

”کہاں؟“ مسعود نے پوچھا۔

”وہ ... وہ ... نیچے“ اعظمی نے جواب دیا۔

عماد ہنسا اور سر جھٹک کر بولا:

”بیوقوفو! بارش کبھی نیچے سے اوپر کو بھی ہوئی ہے۔“

لیڈر نے کہا:

”دیکھو تمہارے سامنے ہے۔ کس قدر زبردست چھوا اٹھ رہی ہے اوپر کو۔“

اعظمی نے کہا:

"اوپر والے بھی اچھل رہے ہیں کہیں کہیں۔"

عماد نے غور سے دیکھا، تو کھسیانا ہو کر بولا:

"واقعی یار! یہ عجیب فنومنا ہے۔ ہم اس کو جلد پکڑ لیں گے راستے میں۔"

"لیکن ہم تو اوپر جا رہے ہیں۔" مسعود نے کہا۔

"اوپر!" اعظمی حیرت سے بولا: "اوپر تو نہیں جانا تھا۔ تمہیں بھی تو جانا تھا عماد؟"

"میں کب کہتا ہوں کہ نہیں جانا تھا۔" عماد نے کہا۔ "لیکن اب ہم تھک کر خود ہی پیچھے جا رہے ہیں۔ آپ سے آپ۔"

لیڈر اپنی دونوں ٹانگیں راستے میں پسار کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹ کی ٹو پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم سب راستے میں بیٹھے تھے اور مفتی اور اس کا کوہستانی ہمارے سامنے کھڑے ہم کو دیکھ رہے تھے۔ مفتی کچھ حیران اور کچھ متردد تھا اور کچھ خوش بھی تھا اور کوہستانی ہنس ہنس کر اسے کچھ بتا رہا تھا۔

مجھے صرف اس قدر یاد تھا کہ میں وہاں راستے میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ میری پارٹی کے دوسرے دوست بھی بیٹھے تھے، لیکن اس کے آگے پیچھے اور کچھ نہیں تھا۔ صرف بارہ مئی سن اکتالیس کی جالندھر چھاؤنی تھی اور اس کے اندر اٹھارہ بیس کنال کی ایک کوٹھی تھی اور اس کوٹھی کے سامنے والے لان پر ایک ڈنر تھا جو کرنل دیال نے اپنے ساتھی افسروں کو دیا تھا۔ ان افسروں میں میرا ڈاکٹر بہنوئی بھی تھا جو کرنل صاحب کے پُرزور اصرار پہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا ــــ اس سے پہلے کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اس کے بعد کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اس پاس کچھ نہیں تھا۔ بس جالندھر چھاؤنی تھی اور وہ شام تھی اور میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے ایک مفتی اور دوسرا کوہستانی جس کو ہم نے مفتی جی کے اٹھانے پر مامور کیا تھا۔

مجھے اپنی ساری زندگی یہ واقعہ کبھی یاد ہی نہ آیا تھا۔ جالندھر چھاؤنی تو ایک طرف میرے ذہن سے سارا ہندوستان نکل چکا تھا اور اب وہاں ماضی کی کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ نہ شعور میں، نہ لاشعور میں، نہ تحت الشعور میں، نہ بے شعوری میں، نہ وقوف میں اور نہ بے توقف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں۔

اور اس وقت میرے سامنے کرنل دیال کے لان کے سارے تنکے اپنی اصل حالت میں موجود تھے۔ سارے مہمانوں کے چہرے میرے سامنے تھے۔ میجر آفندی کی پی کیپ کرسی کی بیک سے گر گئی تھی، تو میجر نے اسے اٹھا کر جھاڑا تھا۔ تین مرتبہ زور سے پھونک ماری تھی اور پھر اس کو وہیں ٹانک دیا تھا جہاں سے گری تھی۔ ایک بیرے کے پاس فینٹے کا جگ تھا اور دوسرے کے پاس تام چینی کا۔ تام چینی کے جگ سے ایک چھوٹی سی چیپڑ اتری ہوئی تھی اور اس نشان کی شکل چھکبرے خرگوش کے منہ سے ملتی تھی۔ ایک افسر کی بیوی بہت کالی اور بہت موٹی تھی اور اس نے بینگنی رنگ کی ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اس کے بلاؤز پر جابجا پسینے کی باؤلیاں تھیں۔

کوٹھی کے برآمدے میں کھپریل کی چھت کے نیچے ایک چھپکلی دیوار پر کیڑے مکوڑے اور مچھر بھنگے پکڑ رہی تھی اور اس کی دُم کٹی ہوئی تھی۔ کرنل محی الدین بید والی لمبی آرام کرسی میں لیٹے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی ایک ٹانگ کرسی کے چپٹے آرم پر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے فل بوٹ کا چمڑہ بہت سخت نظر آتا تھا اور ان کی اونی جرابیں نئی اور نو بلیٹس تھیں۔ کرنل محی الدین کی خاکی پتلون کی گدری بہت تنگ تھی اور وہ یوں لیٹے ہوئے تھے جیسے ان کی پتلون کی جیب کے آخری کونے میں صابن کی ایک ٹکیہ ہو۔

اتنے سالوں کے بعد آج، اس وقت، سیف الملوک کے راستے میں زمین پر بیٹھے ہوئے مجھے کرنل دیال کی لڑکی اس ڈنر پارٹی میں ہر چیز سے حسین دکھائی دی۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور آج کے ڈنر کا سارا انتظام پرمیلا نے کیا تھا۔ پرمیلا نے نیلی زمین پر سفید ممکنوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کی آستین اس کے بازوؤں میں کھبی ہوئی تھیں۔ بائیں آستین کے باہر ڈیڑھ داغ چیچک کے ٹیکوں کا نظر آتا تھا۔ باقی کا ڈیڑھ آستین کے اندر تھا۔ پرمیلا کا رنگ اپنے والد کی طرح صاف تھا کیونکہ وہ ایک کشمیری پنڈتانی کے بیٹے تھے۔ پرمیلا کے دونوں ابرو محرابوں کی طرح تھے، کیونکہ وہ کوہاٹ میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کا گھر مسجد کے بہت قریب تھا۔ اس کی کلائی پر سونے کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی کیونکہ وہ ایم بی بی ایس کے آخری سال میں

پڑھتی تھی۔ اس کی آواز کے سارے سُر کومل تھے، کیونکہ وہ چھوٹی ہوتی زرداد خان کی بچیوں کے ساتھ مل کر نعتیں پڑھا کرتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے اس کی آنکھ کا ہر اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں چمڑے کے بہت ہی پتلے تلے والی چپلیاں تھیں اور اس کے دونوں ٹخنوں پر دو چھوٹے چھوٹے پُورے چاند طلوع ہو رہے تھے۔

اس وقت پُورے پینتیس برس بعد مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔ اس کا اندازِ نشست بھی سامنے تھا۔ اس کے نخرے بھی سُنائی دے رہے تھے (کانوں میں گونج نہیں رہے تھے، سامنے سے سُنائی دیتے تھے) اس کی کرسی کی پُشت پر چنبیل کی ایک چھوٹی سی اُبھری ہُوئی کیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس چنبیل کلا تھ کا کلف بھی محسوس ہو رہا ہے جہاں میں نے پانی پی کر اپنا گلاس رکھا تھا۔

وادی ابھی تک اسی رفتار سے اُوپر کو اُڑ رہی تھی، لیکن ہم تک نہ پہنچ پائی تھی۔ ہم اسی تیزی سے لفٹ کے ذریعے نیچے کو اُتر رہے تھے، لیکن اُتر نہ پائے تھے۔ دونوں شخص ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں ایک مفتی تھا اور دُوسرا کوہستانی جو ہم نے مفتی کو اُٹھانے کے لیے باہر کیا تھا۔ لیڈر کی پسری ہُوئی ٹانگیں پہلے سے لمبی ہو گئی تھیں، لیکن اس کی سوئی اتنی ہی تھی اور اب وہ اپنے گھٹنوں پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

میں باہر لان سے اُٹھ کر کوٹھی کے برآمدے میں گیا، جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ تینوں کموڈوں کے ڈھکنے بند تھے اور سِنک پاٹ لبالب بھرا ہُوا تھا۔ میں اسی طرح واپس آ گیا اور برآمدے کے دُوسرے کونے سے کوٹھی کے پیچھے نکل گیا۔

پیچھے سرونٹ کوارٹرز کی ایک لمبی قطار تھی، جن کی چھتیں گر چکی تھیں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مرمت شدہ کچن تھا جس کے اندر بتّی جل رہی تھی۔ اس کے پہلو میں سرونٹ کوارٹرز کے کھنڈرات کے پیچھے ایک ویران سا میدان تھا جس میں رہٹ کی ایک بڑی آہنی چرخی پڑی تھی۔ اس کے قریب زنگ آلودہ ٹنڈوں کی مال کا ڈھیر تھا جس کے اندر سے ہو کر لمبی لمبی گھاس اُوپر نکل آئی تھی۔ قریب ہی ایک ٹوٹی گڈ پڑی تھی جس کا ایک ہی پہیہ باقی تھا۔ کچھ کچی اینٹوں کے چٹے تھے جن کے ارد گرد سرکنڈے کے جھاڑ تھے۔ باوجود اس کے کہ

چاند اپنی پُوری تابانی سے چمک رہا تھا، لیکن اس سے بہتر خلوت ساری چھاؤنی میں اور کہیں نہیں تھی۔ میں ابھی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے نرم نرم قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پرمیلا اپنے چھلے سے رُومال سے ماتھا پونچھتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

"یہاں گھاس بہت ہے۔" اس نے رُک کر کہا۔ "اور جگہ بھی ذرا ٹھنڈی ہے۔"

"جی!" میں نے ادب سے جواب دیا۔ کیونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا اور حضرت ڈائیر کا طالبعلم تھا۔

"ہم میں سے ادھر کوئی بھی نہیں آتا۔"

"جی!" میں نے اسی سعادت مندی سے پھر کہا اور پرمیلا کی ذاتی خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے چہرے سے لپٹ گیا، جیسے شیشم اور شرینہہ کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

وہ ایک قدم اٹھا کر میرے اور قریب آ گئی اور اپنی کنپٹیوں کا پسینہ رُومال میں جذب کرنے لگی۔ اس کی اٹھی ہُوئی کہنی کے نیچے سے ایک اور جھونکا آیا، جیسے شیشم اور شرینہہ کے جھنڈ میں سے کار گزری ہو۔

میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوہاٹ کے صحرائی حُسن پر نُور ہی نُور تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیے اور میرا دل چاہا کہ میں بھی ایم بی ایس میں داخل ہو جاؤں یا مندر میں پُوجا کرنے لگوں یا پھر میری بھی ماں مر جائے یا میں اپنی باقی زندگی کوہاٹ میں گزار دوں یا میں ابھی نماز پڑھنے لگوں یا ابھی لیٹ جاؤں۔ میں نے دیکھا سامنے ایک ٹوٹے ہوئے سرونٹ کوارٹر کے فرش پر پرال بچھی تھی۔

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر گہرے سیندھوری رنگ کے شعلے بڑھنے لگے۔ پرمیلا میں کچھ عجیب طرح کی شفقت پیدا ہو گئی تھی۔ کاما سے بھری ہوئی ہمدردی۔ شہوت سے لبریز پاکیزہ محبت میں ڈوبی ہُوئی وہ ایک پاکدامن اور مضبوط الحواس طوائف نظر آ رہی تھی جو ساری عمر ہر شخص کو دل و جان سے اپنا بھائی سمجھتی رہی ہو۔ پرمیلا کی آنکھوں میں حیا تھی، ہونٹوں

پر جھکی تھی اور چہرہ ولٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محبت، ہمدردی، تپاک اور اُنس کے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا ایک قدم اُٹھا ہوا تھا۔

پریسیلا اپنے ہونے کی آگ میں سدھائے ہوئے سمندر کی طرح بیٹھی تھی اور پُر سکون تھی اور اس کے ارد گرد لو پڑ رہی تھی۔ میں گلاس میں پڑا ہوا برف کا ٹکڑا تھا جس کے پگھلنے کے ذرے کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کنارہ ہوں یا پانی!

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا:

"مجھ پہ دیا کرو۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں "اچھا" کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اعظمی ایک زور کی چیخ مار کر زمین سے اُٹھا اور سیاستدانوں کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا: "اُٹھو یارو! شرم کرو! کیا راستے میں عورتوں کی طرح بیٹھ گئے ہو۔"

مسعود نے سر اُٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر ہم پر نظر کی۔ اس کے بعد اپنا جائزہ لیا اور ہنسا، پھر کہنے لگا:

"چلو یار جلدی کرو۔ جھیل پر بھی پہنچنا ہے اور پھر واپس بھی آنا ہے۔"

"کیوں صیب!" کوہستانی نے ہنس کر مفتی سے کہا: "میں بولا نہیں تھا آپ کو پورے پندرہ منٹ! چاہے گھڑی رکھ کر دیکھ لو چاہے کلاک رکھ کر دیکھ لو ــــ پورا ٹیم مقرر ہے اس پھول کا۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ ایک منٹ کم۔"

"اور اگر کوئی کمزور صحت والا ہو۔ بڑی عمر کا۔ میرے جیسا۔ پھر؟"

"چاہے سو سال کا بُڑا آدمی ہو صیب۔ چاہے پچیس سال کا جوان ہو۔ بڈھا ہو۔ کمزور ہو چاہے تگڑا ہو۔ سب کو پندرہ منٹ کے بعد ہوش آجاتا ہے۔ بالکل پہلے کا مافک ہو جاتا ہے۔ ایک دم۔"

اب ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ پھر چلنے لگے تھے۔

اب سورج گھوم کر ایک ایسے رُخ پر آ گیا تھا جس کا جغرافیے کی دنیا میں کوئی نام نہیں۔

اعظمی نے کانی آنکھ سے سورج کی طرف دیکھا اور کہستانی سے پوچھا۔

"سورج پہلے اُدھر نہیں تھا؟"

"جی صیب!"

"اب اِدھر کس طرح سے آ گیا؟"

"پہاڑ گھوم گیا ناں صیب۔"

"پہاڑ گھوم گیا!"

"ہم گھوم گیا ناں صیب، گھم گھمیٹی کے ساتھ۔" کہستانی زور سے ہنسا "اور پھر سب کچھ گھوم گیا۔ گھومنے کا مطلب سمجھتا ہے صیب!"

"پہلے سمجھتا تھا۔" مسعود نے کہا "چھوٹا تھا۔ اب نہیں سمجھتا۔"

"پہلے بھی نہیں سمجھتا تھا۔" عمار بولا۔ "یہ نیک آدمی ہے اس کو راہِ راست کے سوا اور کچھ معلوم نہیں۔"

"اوئے تُو نے بچپن میں بھی کوئی الٹ بازی نہیں لگائی؟" مفتی نے پوچھا۔

"حد ہو گئی یار ــــ عمار ــــ دیکھو دیکھو ــــ اُدھر تو نہیں تھا سورج جب ہم نے موڑ کاٹا تھا۔" اعظمی نے رُک کر کہا اور اس کے ساتھ ہم سب رُک گئے۔

لیڈر اس رُکنے پر غم، غصے، خوف اور سرزنش سے بھر گیا۔ کھنکار کر بولا:

"اب اگر تم جھیل کے پانی کو صرف ہاتھ لگا کر بھی لوٹ سکے، تو عشاء سے پہلے ناران واپس نہیں پہنچ سکو گے۔"

صرف میں نے لیڈر کی اس بات کا وزن محسوس کیا، باقی سب سورج کے زاویے کا حساب لگاتے رہے اور عمار انہیں اپنی سائنس کے زور پر سمجھاتا رہا کہ سورج اپنی جگہ پر قائم ہے۔ پہاڑ بڑی آہستگی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور ہم تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان تینوں حوالوں نے تمہارے اندر اشتباہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے، ورنہ سورج اپنی جگہ پر قائم ہے اور ساکت ہے۔"

"ساکت نہیں ہے جی، ساکت نہیں ہے صیب!" کہستانی تڑپ کر بولا "سورج بالکل ساکت جامد نہیں ہے۔ بالکل بے جان نہیں ہے۔ یہ حرکت کرتا ہے صیب، ہلتا ہے۔ ہر شے اللہ کے حضور میں حرکت کرتی ہے۔ ہر شے اس کے حکم سے چل رہی ہے۔ ہر چیز خدا کے سامنے

فانی ہے۔ حکم کے مطابق ہے۔"

لیڈر نے کہا:

"چلو ـــــ خدا کے لیے!"

مفتی بولا:

"چلو۔"

عماد نے کہا:

"اگر میرے پاس کاغذ ہوتا تو میں نقشہ بنا کر سمجھاتا کہ ان ملیشین ٹوسن ہماری کیا پوزیشن ہے؟"

لیڈر نے اس کے کندھے پر مُکّا مارا اور خوفزدہ ہو کر کہا:

"پلیز!"

اور ہم سب پھر اسی رفتار سے چلنے لگے۔ پھر اچانک میں نے لیڈر کا چہرہ دیکھ کر محسوس کیا کہ منزل قریب آ رہی ہے اور جب ہم اگلا موڑ کاٹ کر سامنے کے پل کی طرف جائیں گے اور وہ پل کٹے گا تو سامنے جھیل ہو گی اور جھیل کے گرد ادھیڑ قد کے پہاڑ ہوں گے اور ان پہاڑوں پر سے کئی قسم کی ہوائیں گزر چکی ہوں گی۔ منقلب اور غیر منقلب ہوائیں اور تجارتی ہوائیں اور پھر ہواؤں کے مختلف منطقے اور ان کے چکر، پہلو بہ پہلو، ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اُفقی چکر، عمودی چکر، کٹے ہوئے جھونکے، بڑے بڑے ہوائی میدان، ہواؤں کے ریگستان، باد کے بحرِ اعظم، چوڑائی کے رخ، لمبائی کے رخ اور اونچائی کی جانب، آسمانوں کی سمت اور زمینوں کی طرف!

مجھے یاد ہے گرمیوں کی ایک صبح، دوپہر سے ذرا پہلے کوئی گیارہ بجے کے قریب میں نے گلبرگ میں ہوا کا ایک جھونکا دیکھا تھا۔ ہوم اکنامکس کالج کے سامنے گلبرگ ڈاکخانے کی جانب جہاں بس سٹاپ ہے۔ جدھر ڈھاک کی قسم کے ولایتی پیڑ لگے ہیں، وہاں تین لڑکیاں بس کا انتظار کر رہی تھیں اور ان میں لمبے قد کی درمیانی لڑکی سے ہوا کا یہ جھونکا گلے ملا تھا اور پھر واپس اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ دراصل یہ جھونکا اس لڑکی کا خاندانی جھونکا تھا اور کئی صدیوں سے

کرۂ ارض کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اُس دن ہیلتھ اینڈ نیوٹریشن کی پروفیسر کا ہاتھ دروازے میں آ گیا۔ جلد کٹ گئی ماس باہر آ گیا۔ خون کا فوارہ بہ نکلا۔ اُنہوں نے خود ایک ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے کلائی پر رومال باندھا اور زخم کے گرد پٹی لپیٹ کر ایک ہاتھ سے موٹر چلاتی ہوئی ہسپتال پہنچ گئیں۔ زخم کو پورے تین ٹانکے لگے۔ سرجن نے انہیں ٹیکہ دے کر چند گھنٹوں کے لیے لٹا دیا اور خود اُن کے کالج فون کر دیا کہ پروفیسر سبطین آج کالج نہیں آ سکیں گی۔ یہ تینوں لڑکیاں جو بس اسٹینڈ پر کھڑی تھیں، پروفیسر سبطین کی شاگرد تھیں اور اُن کا پیریڈ خالی ہونے کی وجہ سے وقت سے ایک پیریڈ پہلے گھر واپس جا رہی تھیں۔

چونکہ یہ تینوں لڑکیاں وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر آ گئی تھیں اس لیے ہوا کا جھونکا درمیانی لڑکی سے گلے مل کر اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ اگر پروفیسر سبطین کا ہاتھ دروازے میں نہ آتا اور اُنہوں نے کلاس لی ہوتی، تو اس وقت یہ تینوں لڑکیاں کلاس کے اندر بڑی تیزی سے نوٹس لے رہی ہوتیں اور ہوا کا جھونکا وقتِ مقررہ پر جائے مقررہ سے ہو کر بغیر گلے ملے اُوپر چڑھ گیا ہوتا۔ پھر کوئی ضروری نہیں تھا کہ کبھی واپس لاہور آتا یا کسی صدی میں گلبرگ کے جغرافیے سے گزرتا یا قرنوں بعد عین سیدھ میں آ سکتا جہاں آج آ گیا تھا۔

لمبے قد کی یہ درمیانی لڑکی یونانی لڑکی تھی۔ اس کی ناک یونانی نہیں رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں کے نیچے اس کی گالوں کی ہڈیوں کی اُٹھان ابھی بھی یونانی مجسموں جیسی تھی، حالانکہ نہ اس کو اس بات کی خبر تھی نہ اس کے والدین کو اور نہ ہی اس کے منگیتر کو۔ اس کا والد گورنمنٹ کو واٹر سپلائی کرنے کا ٹھیکیدار تھا اور اس کا منگیتر سول ایوی ایشن میں درمیانے درجے کا آفیسر تھا جس کی ترقی کے آگے چل کر بڑے چانس تھے۔

سکندرِ اعظم کے ساہیوال سے زخم کھا کر واپس چلے جانے کے بعد اس علاقے کو سیلوکس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ سیلوکس سکندرِ اعظم کا بہت ہی قابل، بے حد وفادار، نہایت خوبصورت اور بڑا پیارا کمانڈر تھا۔ اس نے اس علاقے کے لوگوں پر محبت اور شفقت کے ساتھ حکمرانی کی اور بہت سے یونانی مجسمہ ساز، پہلوان، نے نواز، خوش نویس

باڑی گر اور تاجر یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ یونانی نوجوانوں، یونانی دیوتاؤں نے یہاں کی عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا سیکھ لیا اور وہ ان کی اس حرکت کو پسند کر کے ہنسنے لگیں اور ہنسی ہنسی میں کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن میں مرمر کے مجسمے صندل کی مورتیوں کے جھرنوں میں بیٹھ کر مورتی مورتی ہو گئے۔ کئی نو رکھ لڑکیوں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر اور سروں پہ مکٹ سجا کر یونانی لڑکیوں کو ہاتھ اٹھا کر اس طرح سلام کرنا سیکھ لیا جس طرح سکندر اعظم اپنی فوج کے دستوں کو کیا کرتا تھا۔ جب وہ راہ چلتی کسی یونانی دوشیزہ کو ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے۔ تو ان نٹ کھٹ لڑکوں کی کلائیوں سے سونے کے کنگن لڑھک کر ہاتھی دانت کے بازو بندوں پہ آ رکتے۔ گریک لڑکیاں ان سے بار بار سلام کرواتیں اور اس گارڈ آف آنر کے نیچے کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن کے نیچے باپوں سے زیادہ ماؤں پر چلے گئے اور پھر چلتے ہی گئے ــــ یہ جو درمیانے لمبے قد کی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی تھی، انہی بچوں میں سے ایک تھی جو ماں کے مہاندرے کی انگلی تھام کر چلتی چلتی ہوم اکنامکس کالج میں آ گئی تھی اور اپنی ذہانت کی وجہ سے کالج بھر میں مشہور تھی۔

جب سکندر اعظم کو ایک پرانے ان گھڑت بھالے کے زنگ آلود پھل کا گہرا زخم لگا تھا اور یہ زخم اُس کو ساہیوال کے ایک جانگلی بتی کے وار سے لگا تھا تو سکندر اعظم اپنی کمان الیبی جھالر دار کلغی سمیت زمین پر گر گیا تھا اور جب سیلوکس نے آگے بڑھ کر فاتح عالم کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا تھا تو ہوا کا ایک جھونکا ان کے درمیان سے ہو کر ملتان کی طرف نکل گیا تھا اور پھر بے تاب ہو کر سمندروں کی جانب چلا گیا تھا اور وہاں سے دوسری زمینوں اور ہواؤں کا دباؤ برداشت نہ کر کے پہاڑوں کی طرف بھٹک گیا تھا۔ یہی جھونکا کئی سال تک قراقرم اور ہندوکش کے سلسلوں کے درمیان چکر لگاتا رہا۔ پھر پیری نیز اور ایلپس کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ کئی صدیاں بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس کے جنگلوں میں گزار دیں۔ ساٹھ پینسٹھ سال تک یہ جھونکا اسکیموؤں کی بستیوں کے گرد منڈلاتا رہا۔ اسکیموؤں کی پوری ایک نسل اس کے سامنے پیدا ہو کر جوان ہوئی اور اس نے ان کے درمیان سوائے محبت، صلح اور بوس و کنار کے اور کچھ نہ دیکھا۔

کوئی ایک صدی تک یہی جھونکا صحرائے عرب میں چلنے والی ڈاچیوں کی تھوتھنیوں کے اوپر بڑھتا سستاتا رہا۔ اس نے یہاں عجیب قوموں کو دیکھا جو عورتوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور سخاوت کے معاملے میں ان کے دل دریاؤں سے بھی بڑے تھے۔ وہ بڑی محنت سے تپتے ہوئے صحراؤں میں کانٹے دار جھاڑیوں سے ریزہ ریزہ کر کے خوراک حاصل کرتے تھے اور شام کے وقت گلی کوچوں میں فقیرانہ صدائیں دیتے پھرتے تھے۔

"اے مائی باوا ہے کوئی اللہ کے نام پہ میرے ساتھ مل کر کھانے والا ــــ میرے ساتھ شیئر کرنے والا ــــ مجھے میزبانی کا شرف عطا کرنے والا ــــ ہے بابا ــــ ہے تنہا ــــ بے سہارا! ــــ راہیا! ــــ مجھ غریب نمانے ــــ بے آسرا ــــ بے گھر ــــ بے در کی بھی عزت فرما ــــ میرے دسترخوان پہ آ کر کھا ــــ میرا مان بڑھا ــــ ہے سخی بابیو! ــــ سہنے مسافرو! ــــ عزت دار مقیمو! ــــ تیمیرا ــــ سردارو! ــــ اپاہجو! ــــ مجبورو! ــــ لنگارو! ــــ کرم فرماؤ! میرے ساتھ روٹی کھاؤ ــــ اور بڑے درجے، بڑے رتبے پاؤ۔"

پھر اسی جھونکے نے مدینے کے شہر میں مکی، مدنی، قریشی، اُمی کے عاشقوں کو دیکھا اور اُن پر ایک حکم نازل ہوتے بھی سنا:

"اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور ڈرتے رہو اللہ سے کہ وہ سنتا ہے اور جانتا ہے اور اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے ترخ کر بولتے ہو اس طرح سے ان کے روبرو نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، خدا نے ان کے دل تقوے کے لیے آزما لیے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔"

اور پھر اسی جھونکے نے عرفات کے میدان میں اسی شرفِ دو جہاں اور دستگیرِ افتادگاں کو دیکھا کہ اپنی اونٹنی پہ سوار واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

جب شہنشاہِ ہندوستان شاہجہان حضرت میاں میر صاحب کی خدمت میں حاضر

ہُوا اور دارا شکوہ اس کے ساتھ داہنے ہاتھ کھڑا تھا اور حضرت میاں جیو صاحب کی باتیں عقیدت کے کان سے سُن کر محبت کے دل میں جمع کر رہا تھا۔ اس وقت ہوا کا یہ جھونکا اتنا نیچے اُتر آیا تھا کہ حضرت میاں میر صاحب کے مُنہ سے چھینکے ہوئے لونگ زمین پر جلنے لگے تھے۔

اور آج جب مسز سیلین اپنا ہاتھ دروازے میں آجانے کی وجہ سے کالج نہ پہنچ سکی تھیں اور اُن کے خالی اور آخری پیریڈ میں لڑکیاں گھروں کو روانہ ہو گئی تھیں تو بس سٹاپ پر یہ جھونکا لمبے قد کی لڑکی سے گلے مل کر اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ یہ لڑکی سیلوکس کے خاندان سے تھی اور اس کے ننھیال اور ددھیال دونوں اُوپر جا کر سکندرِ اعظم کے نامور سپہ سالار سیلوکس سے جا ملتے تھے۔ حال ہی میں اس لڑکی کا باپ سُوتر منڈی والا اپنا گھر چھوڑ کر مسلم ٹاؤن میں آباد ہُوا تھا اور خوش تھا کہ اس کی ٹھیکیداری ٹھکا ٹھک چل رہی ہے اور اس کو کسی طرف سے کسی قسم کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں۔

لیڈر نے رُک کر کستانی سے کہا:

"دیکھو! اس کو پھر اُٹھا لو — صاحب کو۔"

"ہرگز نہیں!" مفتی نے چیخ کر کہا۔ "اب میں ٹھیک ہُوں اور چل سکتا ہُوں۔"

"آگے پھر چڑھائی آ رہی ہے مُفتی!" مسعود نے کہا اور پتہ نہیں کس کو ایک ہلکی سی گالی دی۔

"نہیں یار! میں ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہُوں۔ اب بالکل فٹ ہُوں۔ نو بر نو۔ میں اس کے کاندھوں پر نہیں چڑھوں گا۔"

کستانی نے دبی زبان سے کہا:

"اگر ضرورت ہے صیب تو پھر آ جاؤ۔"

لیکن اُس کا من حرامی ہو چکا تھا اور وہ کافی بھینس کی طرح ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ عماد نے انگریزی میں لیڈر کو سمجھایا:

"کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا بھی ٹھیک نہیں اور جب مفتی صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ چل سکتے

ہیں تو انہیں چلنے دو۔"

"اور اگر نہیں بھی چل سکتے تو بھی ان کو چلنے دو۔" اعظمی نے کہا۔ "کیونکہ چلنا نہ چلنے سے ہر حال میں بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کا حال ہماری ملازمہ صُغریٰ کی طرح ہو جائے گا جو کوہسار مارکیٹ سے گرم مصالحہ لے کر دو گھنٹے بعد گھر واپس پہنچی تھی اور میری بیوی نے پرانے گرم مصالحے کے زور پر ہی پلاؤ پکا دیا تھا۔"

مفتی نے رُک کر کہا:

"ٹھہرو یارو! میں صُغریٰ کی بات سُنے بغیر آگے نہیں چل سکتا کیونکہ میں نے اُسے بڑے غور سے دیکھا ہُوا ہے۔"

مسعود نے کہا:

"دیکھا تو ہم نے بھی تھا مفتی جی! لیکن اتنے زور سے نہیں دیکھا تھا۔"

اعظمی نے کہا:

"جب صُغریٰ پُورے دو گھنٹے بعد گرم مصالحہ لے کر ہمارے گھر پہنچی، تو میری بیوی نے جل کر کہا۔

"اتنی دیر تک کہاں مری رہی بدبخت!"

تو صغریٰ نے روہنکی آواز میں جواب دیا:

"کیا کروں بی بی جی! واپسی پر ایک نوجوان میرے پیچھے چلنے لگ گیا تھا۔ نیلی پتلون اور پیلے سویٹر والا۔"

میری بیوی نے کڑک کر کہا:

"تُو دفع کرتی اُس مردود کو، تیرا اُس سے کیا کام تھا بھلا۔ ناک کی سیدھ گھر آتی۔ جلدی جلدی، پیچھے دیکھے بغیر۔"

تو صُغریٰ نے غم ناک ہو کر کہا:

"میں تو جلدی جلدی چلتی تھی جی! لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا مرجانا! کتّا کسے تھاں کا۔"

میں نے بیوی سے کہا:

"اچھا ہی ہوگیا۔ یہ گھر تو پہنچ گئی خواہ دیر سے پہنچی، تو بھائیو! مفتی جی کو چلنے دو، خواہ وہ آہستہ آہستہ ہی کیوں نہ چلیں۔"

"اور شام تک جھیل پر نہ پہنچ سکیں۔" لیڈر نے تقریباً رو کر کہا۔

عماد چڑ کر بولا:

"ایک تو اس کی یہ جھیل ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ نہیں پہنچ سکے تو نہ سہی کوئی کتاب میں لکھا ہے کہ جھیل تک پہنچنا ضروری ہے۔"

اس نان کوآپریٹو سپرٹ کے بھونڈے اعلان کا جملہ لیڈر کو گولے کی طرح لگا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے واپس بھاگ گیا، تو ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے، لیکن ہماری دوڑ کمزور تھی کچھ اس وجہ سے کہ ہم آگے لے جانے والی انرجی کو اس طرح سے ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کہستانی بھیڑیے کی طرح لیڈر کے پیچھے بھاگا اور چشم زدن میں جا کر اس کو جپھا ڈال لیا۔ لیڈر کہستانی کے کلاجنگ میں بند آہستہ آہستہ اس کو سوٹیاں مار رہا تھا اور کہستانی اُسکی جانگھوں میں سر دے کر اس کو کندھوں پر اُٹھا رہا تھا۔ ہم سب نے پہاڑ کے کنارے پر جھک کر زور زور سے تالیاں بجا کر گانا شروع کر دیا۔

اوئے جتا چک لے واگرو کرکے
باہنی گلاس ورگی۔

کہستانی لیڈر کو کامیاب لیڈر کی طرح کندھوں پر اٹھائے واپس آ رہا تھا اور عمر کامیاب لیڈروں کی طرح کندھے پر بیٹھا اس کو سوٹیاں مار رہا تھا۔

جب اس نے لیڈر کو واپس لا کر ہمارے قریب اُتارا، تو مستو نے عمر کو انگریزی میں سخت سُست کہا اور لیڈر نے غصے میں بھرے ہوئے ناکام لیڈر کی طرح انگریزی ہی میں اس کو ترکی بہ ترکی جواب دیا، لیکن غصے کی زیادتی اور انگریزی کی کمی کی وجہ سے عمر کی گھگھی بندھ گئی اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ "مودا دڑ" کے انداز میں ہم سب کو گندی گالیاں دینے لگا اور رومال سے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ صاف کرنے لگا۔

مفتی نے اس ناخوشگوار حادثے کے درمیان بڑی محبت بھری آواز میں اعظمی سے پوچھا:

"اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا کیا؟" اعظمی نے تعجب سے پوچھا تو مفتی نے کہا:

"یار اس مُفروری کا۔"

ہم سب زور سے ہنسنے لگے، تو لیڈر نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور ہم سب سے چھ سات قدم آگے چلنے لگا۔

"اس کا کیا ہونا تھا مفتی جی!" اعظمی نے کہا: "وہ چلی گئی۔ زعفران آئل کا ڈبہ لیتے گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔"

"اُسی کے ساتھ!" عماد نے پوچھا: "نیلی پتلون اور پیلی جرسی والے کے ساتھ!"

"اب میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔" اعظمی نے کہا۔

"عرض کرو صیب! کیوں نہیں کرو۔" کہستانی نے کہا۔ "اُسی کے ساتھ گئی ہوگی وہ حرامزادی۔"

"تُو ہماری باتیں سمجھتا ہے؟" عماد نے چیخ کر پوچھا۔ اور ہم سب رک گئے۔

"سمجھتا ہے صیب! سمجھتا کیوں نہیں۔ یہ کون سی مشکل بات ہے سمجھنے کے لیے۔ عورت کی بات ہر کوئی سمجھتا ہے، لیکن ہم ڈبے کی بات نہیں سمجھتا۔"

ہم سب حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے تو مفتی نے کہا:

"یہ زعفران آئل کے ڈبے کو پوچھ رہا ہے گدھو! منہ اُٹھا کر کیا کھڑے ہو گئے ہو۔ چلو! آگے چلو۔"

ہم سب چلنے لگے تو مفتی جی نے کہا:

"اس دنیا میں جہاں کہیں کوئی قتل ہوتا ہے تو اس کا ایک سراغ ایک کھوج ایک اشارہ ضرور ہوتا ہے اور جب کبھی کوئی عورت بھاگتی ہے تو اس کے ساتھ ایک رمز ضرور ہوتی ہے جو اس کے اُدھالے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"

اعظمی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ صفدری کے جملے گئے ہیں اعظمی کے رُجحان کا ذہن بھی کھڑکھڑاتا ہُوا ساتھ جا رہا تھا۔

اس وقت جہاں ہم چل رہے تھے پہاڑ کی اونچائی زیادہ نہیں رہی تھی۔ اردگرد کے سلسلے البتہ بلند ہو گئے تھے اور ان پر سفید برف جمنے لگی تھی۔ پہاڑ دُور تھے۔ مگر ان کی برف نزدیک دکھائی دیتی تھی۔ برف نزدیک تھی مگر اس کی ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ چیک دُور تھی، مگر اس کی چلکور آنکھوں کے قریب پہنچ کر پریشان کر رہی تھی۔ لیڈر نے پتلون کی جیب سے سیاہ چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگایا اور پیچھے مڑ کر ہم سب کو تفریحی بھرے انداز میں دیکھا، کیونکہ ہمارے پاس سیاہ چشمے نہیں تھے۔ ہم اپنے اونچی جاتی کے برہمن لیڈر کے پیچھے پیچھے آدی باسیوں کی طرح چل رہے تھے اور ہم کو تھوڑی تھوڑی سردی لگنے لگی تھی۔

مفتی نے بڑے دکھ بھرے انداز میں عماد سے کہا:

"ذرا ہمارے لیڈر کو دیکھو، ساتھ چلنے کو بھی تیار نہیں۔"

"بس ایسے ہی ہوتا ہے مفتی!" مسعود نے سر جھکا کر کہا: "اس پر زیادہ غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ غصہ کرو گے تو خود ہی ٹوٹنے لگو گے۔"

"وہ بھی ٹوٹ سکتا ہے، سالا لیڈر!" اعظمی بولا۔

"ٹوٹ تو سکتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔" مسعود نے کہا۔ "میرا مطلب ہے آج تک ٹوٹ پھوٹ سے کسی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔"

"یہ سالا ملامتی ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "اس کی کوئی بات نہ سنو، ورنہ یہ ہم کو بھی اپنے جیسا بنا لے گا۔"

"ملامتی اس جیسے نہیں ہوتے۔" عماد نے کہا۔ "ان کی کرنی سیدھی اور گفتگو صاف ہوتی ہے۔ یہ تو گھبرایا ہوا ہے اور بکلاتا بھی ہے۔ یہ کیسے ملامتی بن سکتا ہے۔"

مفتی نے بے اولاد بوڑھی عورتوں کی طرح عماد کی طرف دیکھا اور اپنا دُکھ اندر ہی پی گیا ــــ وہ سائنس کے خلاف ہونے کی وجہ سے عماد سے اتنی محبت نہیں کر سکتا تھا جتنی وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی مہربانت کی تکمیل کی داد بھی نہیں دیا کرتا تھا، کیونکہ عماد کی مہربانت کی بنیاد سائنس اور منطق پر ہوتی تھی اور مفتی کو سائنس اور منطق سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ مفتی اپنی شفقت کے اس حصے کا اظہار بھی نہیں کر پاتا تھا جو خدا نے اُسے صرف عماد کے لیے دیا تھا۔ نہ اس پیار کی جھلک دکھا سکتا تھا جو ازلی حکم کے تحت خاص عماد کے لیے الاٹ ہُوا تھا۔ مفتی کی حالت اس باپ جیسی تھی جو اپنے آسودہ حال، تابع فرمان، نیک نام اور باادب بیٹے کے مقابلے میں بدلحاظ، بے روزگار اور بے ادب بیٹے سے زیادہ محبت کرتا ہو اور ہر وقت اسی کے غم میں گھلتا رہتا ہو۔ اسی کی فکر میں رہتا ہو اور اس کے لیے کوشش کیا کرتا ہو اور ایسے ہی کبھی کبھی اُسے اپنے تابع فرمان اور نیک نام بیٹے کا خیال بھی آ جاتا ہو کہ محبت کے معاملے میں اس سے زیادتی ہو رہی ہے اور اُسے اُس کا حصہ نہیں مل رہا۔ اپنی بے انصافی پر اور سعادت مند بیٹے کی حق تلفی پر ایسے باپ کو دُکھ ضرور ہوتا ہے، لیکن اس دُکھ کی میعاد لمبی نہیں ہوتی اور اس دُکھ سے عمل کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

عماد نے کہا:

"مفتی جی! ملامتی فرقے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ نفس ہمیشہ دھوکا دہی کی طرف مائل رہتا ہے۔ نفس چاہے آگے آگے چل کر رہبری کر رہا ہو چاہے پیچھے چل کر پیروی کر رہا ہو۔ چاہے باادب، تابع اور فرماں بردار بن جائے، چاہے باغی اور سرکش ہو جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں... کبھی بھی اعتبار نہیں... ہرگز اعتبار نہیں۔"

مفتی نے چڑ کر کہا:

"اوئے جا! آیا بڑا صوفیوں کا دل ٹٹولنے والا۔ تو کدھی کہاں کی تجھے رام سے کام ــ رہنا مشینوں میں، سوچنا ٹیکنالوجی میں، سوچنا فزکس میں اور بات کرنی ملامتیوں کی!"

عماد نے ہنس کر کہا:

"یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں بادشاہو! فزکس اور فقیری جب اپنے اپنے معراج کو پہنچتی ہیں، تو ایک ہی شے بن جاتی ہیں۔ دونوں جب تحیر میں ڈوبتے ہیں، تو ان کی ہیئت کذائی ایک سی ہو جاتی ہے۔"

"اب یہ محض علمی کمپاس کے زور پر مفتی کا دل جیت رہا ہے۔" اعظمی چیخ کر بولا۔ "جیتنے

نہ دیا مفتی! ہرگز نہیں جیتنے دیا اپنے دل کو۔"

"تمہیں یاد ہے مسعود!" عماد نے لاتعلقی سے کہا۔ "سن چھیاسٹھ میں ہمارے پاس ایک دُبلا پتلا، بڑی عمر کا الیکٹرونک انجینئر آیا تھا۔"

"موسیو دیانش — سنہری عینک والا۔" مسعود نے یاد کیے بغیر کہا۔ "نیولا سا — دھیمی آواز والا۔"

"وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ دُنیائے سائنس کا مانا ہُوا نام۔" عماد نے کہا۔ "اس نے نیلز بوہر کے ساتھ کام کیا تھا پُورے تین سال۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ پاکستان آیا اور پُورے چھ مہینے تک ہمارے ساتھ رہا۔"

"اپنے ساتھ کو ہمارے ساتھ کیوں کر رہا ہے بے!" افضل نے شرارت سے کہا تو عماد نے اس کی اَن سُنی کرتے ہُوئے سانس روک لی اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ بولا۔

"وہ ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ موسیو دیانش!"

مفتی ایک دم رُک گیا اور اس کے ساتھ ہم بھی ٹھہر گئے۔ عماد کے چہرے پر پسینہ سا آگیا، جیسے کسی ناخوشگوار یاد پر چہرہ ہلکا سا نمناک ہو جایا کرتا ہے۔ عماد کی آنکھیں پہلے سے بھی خوبصورت ہو گئیں اور اس نے بتایا کہ موسیو دیانش کے پاس ایک پُرانا فرانسیسی مخطوطہ تھا جس پر فرقۂ ملامتیہ کے پینتالیس خصائص درج تھے اور جسے ایک ایک کر کے اُس نے عماد کے لیے انگریزی میں منتقل کیا تھا اور اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ قاعدہ کسی اور کو ہرگز نہیں دکھائے گا۔

"سوائے ہمارے!" افضل نے بلند آواز میں کہا۔

"نہیں تمہیں بھی نہیں۔ آئی ایم سوری۔۔۔ یہ ایک عہد ہے۔" عماد نے کہا۔

"لیکن یار سائنس دان!" اب مفتی کے تیور ڈھیلے پڑ رہے تھے اور وہ ہارے ہوئے انسان کی طرح گھر واپس جا رہا تھا۔ اس نے عماد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے انداز سے پُوچھا۔

"اس کو کیا ہو گیا تھا۔ اس فرانسیسی کو جس کا نام تم لوگ لے رہے ہو!"

عماد نے کہا:

"مفتی جی، وہ عجیب آدمی تھا۔ فزسسٹ تھا۔ ساتھ ہی سارتر کا ہم خیال تھا۔ الجزائر میں اپنے ہم وطن فرانسیسیوں کے خلاف لڑ آیا تھا — وہاں ایک شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر سات سال کسی زاویے میں بھی رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن بنا لیتا تھا۔ گھنگھرو جیسی آوازیں ورد کرتا تھا اور سب سے اُونچے ٹرانسمیٹر پول پر بلا خوف و خطر چڑھ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سائنس کے باریک مسائل کو مکالمے اور مباحثے کی بُنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ نہ ہی ایسے مناظروں پر فخر کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی بے حقیقتے اور بے ہدایتے کے سامنے خُدا کے بھیدوں کا اظہار کرنا چاہیے۔ دیانش کہتا تھا کہ فلاح اور بیداری کی رُوح صرف دو سہاروں کی بنیاد پر قائم ہے: خُدا کی ضرورت کو بالحق ماننا اور اس کے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم کے قریب تر رہنا۔"

ہم سب اپنی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے اور لیڈر اپنے سیاہ چشمے سمیت دُور ایک پتھر پر بیٹھا ہُوا تھا۔

عماد نے کہا۔ دیانش کے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ حسن ایک خوبی ہے اور عشق ایک جوہر، بشرطیکہ دونوں راز ہو کر رہیں اور سوائے خُدا کے اور کسی کو ان کا علم نہ ہو۔ اپنے عشق کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھیک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھیک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔ اِن کے درمیان فقیروں کا کیا کام!

اگر آپ کبھی لاہور آئیں اور میاں کی مال روڈ سے گزریں اور جس سواری میں آپ سفر کر رہے ہوں وہ وائی ایم سی اے والے چوراہے کی سُرخ بتّی پر رُک جائے تو ایک منٹ کے لیے ضرور سوچیں کہ اردگرد بہت سے بنکوں کے درمیان ایک بنک ہے جس میں ایک صاحبِ دل منیجر کام کر رہا ہے جو اب ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں اس کو اکتوبر سن باون سے جانتا ہوں جب میں نے دیال سنگھ کالج کی نوکری کے دوران اس کے پاس اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ اس وقت وہ اکاؤنٹس کلرک تھا اور ببلیز بیچلر کے سگریٹ پیا کرتا تھا۔ بنک کے سب ملازم اور افسر اس کو بابو سراج کہتے تھے کہ وہ ہر وقت تھری پیس سُوٹ میں ملبوس رہتا اور کوئی سینٹ اور کوئی ہیئر آئل استعمال کیا کرتا۔ اس کو شہد رنگی، خوشبودار چائے اور قیمتی

فاؤنٹین پن سے عشق تھا۔ اُردو افسانے کا مارا ہوا اور نیو تھیٹرز کی فلموں کا ڈسا ہوا۔ بابو سراج خود تو سارا دن اکاؤنٹس رجسٹروں پر جھکا رہتا، لیکن اس کی رُوح محبت کے جزیروں میں جیتی فلموں کی اَرتی اُتارتی رہتی۔ بابو سراج اندر سے خوبصورت اور باہر سے بڑا شکیل انسان تھا۔

میں کالج سے لوٹتے وقت تقریباً ہر روز بابو سراج سے ملتا اور مجھے اس سے مل کر ویسی خوشی ہوتی جیسے ٹیچ بیک کو اپنی محبوبہ سے مل کر ہوا کرتی ہو گی۔ خفت، ندامت، احساسِ کمتری اور اس کے ساتھ بے پناہ خوشی! وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بنک کے سٹاف روم میں اپنے ہاتھ سے چائے بناتا۔ قرینے سے برتن لگاتا اور پھر بڑی محبت سے پرچ اور پیالی کو تشو پیپر سے سُکھا کر چائے کی پیالی پیش کرتا۔ مجھ کو اس ذہین، خوبصورت، پڑھے لکھے اور سادہ دھارن نوجوان کے ساتھ بابو کا لفظ بہت ہی بُرا لگتا تھا، لیکن اس کو پسند تھا کہ یہ نام اُسے بنک کے ہیڈ چپراسی نے دیا تھا جو اس کے محلے میں رہتا تھا اور اس کے والد کا دوست تھا۔

ہم دونوں کے درمیان ایک مشترکہ دوست بھی پیدا ہو گیا تھا۔ رضی بی۔اے۔ اس کے پاس نورٹن موٹر سائیکل تھی اور وہ چھوٹی بحر کی غزلیں لکھا کرتا تھا۔ رات کے وقت رضی کا ڈیرا اکثر کامران کی بارہ دری میں لگتا اور وہ راوی کے بہتے ہوئے پانیوں کو دیکھ دیکھ کر صبح کر دیتا تھا۔ اس قدر رُومانوی طبیعت رکھنے کے باوصف رضی کی غزلیں بابو سراج کو پسند نہ تھیں کہ ان میں ذکر کے بجائے شکوے کا عنصر زیادہ تھا اور وہ حالاتِ زمانہ سے اور عمومی واقعات سے جنگ کرتا رہتا تھا۔ مجھے اس کی شاعری بہت پسند تھی، کیونکہ اس کے ہر شعر میں کسی نہ کسی پر ایک آدھ چوٹ ضرور ہوتی تھی۔ کسی کسی شعر میں تو وہ دو دو تین تین چوٹیں بھی کر جاتا تھا اور ان مرکب چوٹوں میں بڑا ہی لطف آتا تھا۔ رضی آسودہ حال رُومانوی نوجوان تھا اور زمانے سے شاکی تھا۔ بابو سراج اکاؤنٹس کا اور فکر و نظر کا آدمی تھا اور ہر وقت بیچارہ رہتا تھا۔ غزلوں، تقریروں سے لڑ لڑ کر اس کے اندر بڑی عاجزی اور ملائمت پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں اس کو حلوائے پنجاب کہا کرتے تھے اور اس کے بارے میں متفکر رہتے تھے کہ اس کا کیا بنے گا۔

گرمیوں کے موسم میں پُورے دو ہفتے کی رُخصت لے کر بابو سراج کوہ مری ضرور جاتا۔ اپنے پسندیدہ افسانوں کے مجموعے، چائے کا سامان، فلیٹ بُوٹ، چھتری کی چھڑی اور تہہ ہونے والی

چھتری اس کے مخصوص شریکِ سفر تھے۔ اس کی دو بہت ہی پیاری اور ننھی سی بلبلیں بھی تھیں۔ ایک تین سال کی اور دوسری پانچ سال کی۔ دونوں اپنے ابو کے انتظار میں دہلیز پر بیٹھی رہتیں اور جب بابو سراج بنک سے واپسی پر گلی میں داخل ہوتا، تو دونوں ایک ساتھ بازو پھیلا کر اس کی طرف بھاگتیں اور اسے دونوں کو ایک ساتھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ___ مری سے واپسی پر بابو سراج ان کے لیے گرم ٹوپیاں، گرم دستانے، ریشمی گُڑیاں اور ایک ایک گڑیا ضرور لاتا۔ ان کی ماں کے لیے ایک شال اور اپنی والدہ کے لیے کبھی شہد، کبھی دُھسا اور کبھی جائے نماز ___ لیکن ایک مرتبہ جو وہ مری گیا، تو کسی کے لیے کچھ بھی نہ لا سکا اور سب کے چہرے اُداسی کی دُھول سے اَٹ گئے جیسے قبر کے اندر پہلی رات کے بعد مُردے کا چہرہ ہو جاتا ہے۔

تیرہ تاریخ کو ہم سب سے مل کر وہ مری کے لیے روانہ ہُوا اور پندرہ تاریخ کو جب میں ایک چیک کیش کرانے بنک گیا تو وہ کاؤنٹر پر جھکا رجسٹر میں ڈیبٹ کریڈٹ اندراج کر رہا تھا۔ اس کو یُوں کھڑے دیکھ کر میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میرا یقین متزلزل ہو گیا۔ وہ دس منٹ کے لیے اپنے ساتھی کو چارج دے کر پن بند کرتا ہُوا میرے ساتھ بنک سے باہر آ گیا ہم دونوں بنک کے سامنے مال روڈ کے ایک تناور درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے ہو گئے۔

اُس نے کہا: "اشفاق جی! میں کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا حادثہ گزرا اور مجھے کس لیے اتنی جلدی لاہور واپس آنا پڑا۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ میری ساری چھٹیاں برباد ہو گئیں۔ سارا پروگرام تباہ ہو گیا، لیکن میں اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبور تھا۔" کہنے لگا: "میں تیرہ تاریخ کو بعد دوپہر مری پہنچ گیا۔ سامان میں نے ایجنسی پر رکھا اور ذرا نظارہ لینے کے لیے نچلی سڑک پر چلتا ہُوا پنڈی پوائنٹ پہنچ گیا۔ اس دن بڑی مزیدار دھوپ تھی، لیکن اس میں اتنی گرمی نہیں تھی جتنی پہاڑوں کی دھوپ میں ہوا کرتی ہے۔ کچھ دیر میں پنڈی کی طرف مُنہ کر کے بنچ پر بیٹھا رہا، پھر اُٹھا۔ سویٹر کو کمر پر ڈالا۔ اس کی لمبی آستینوں کو گردن کے گرد موٹی سی گرہ دی اور اپنی چھڑی ٹکاتا ہُوا ڈاکخانے کی طرف چل دیا۔ اس مرتبہ بے شمار لوگ آئے تھے اور سیزن بہت بھر کے لگا تھا، لیکن اتنے سارے لمبے راستے پر مجھے کوئی بھی واقف صورت

نظر آئی اور میں اپنے اکیلے پن کی خوشی میں لٹکتا مٹکتا مال روڈ پر خراماں خراماں چلتا رہا۔ ابھی مجھے کسی ہوٹل میں بھی اپنا بندوبست کرنا تھا اور شام کے وقت لمبی سیر کے لیے پھر نکلنا تھا لیکن اس بات کا میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا اور میں خراماں خراماں چل رہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک کپ گرم گرم خوشبودار خاکستری رنگت چائے کا پیا جائے۔

میں لارنس میں بیدکی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اپنی چھتری کا سر گود میں رکھ لیا۔ بیرے نے ایک جھپاتا ہوا پیسٹری سٹینڈ میرے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود چائے لینے چلا گیا۔ میں نے پیسٹری میں سے وہی میٹھی روٹی پان کا پتہ اٹھا لیا جو میں شوق سے کھایا کرتا تھا۔ ابھی میں نے اس میٹھے پتے کے دو ہی دانت کاٹے تھے کہ بیرا چائے لے کر آ گیا۔ میں نے جلدی سے چائے سُڑکی۔ گیلی پیالی کو جھڑکا۔ جیب سے ٹشو نکال کر پرچ اور پیالی دونوں کو سکھایا اور آدھی چمچی چینی کی ڈال کر چائے پوری کی۔ بڑا فسٹ کلاس گرم گرم دودھ تھا اور بہت ہی اچھی چائے تھی۔ دونوں ایک سی حرارت کی وجہ سے خود ہی گھل مل گئے اور مجھے چمچ تک ہلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

میرے دائیں ہاتھ میں میٹھا ٹکڑا تھا اور بائیں ہاتھ میں چائے کی پیالی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ بھرا تھا اشفاق صاحب اور پیالی میرے ہاتھ ہی میں تھی کہ لارنس کی سیڑھیوں پر ایک ماں بیٹی نمودار ہوئیں اور میری قریبی ٹیبل کی طرف آ کر بیٹھنے کی تیاری کرنے لگیں۔ وہ لڑکی اشفاق جی، اتنی خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھ کر میرا رونا نکل گیا۔ میں نے پیالی پرچ میں رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آدھا کھایا میٹھا ٹکڑا چھوڑا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے میں نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بیرے کو وہیں بُلا کر پےمنٹ کر دی۔ ریستوران سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ بڑی بے عزتی کی بات تھی اشفاق جی! دو بچوں کا باپ، بینک ملازم، تعلیم یافتہ، مرد ذات، اس طرح سے چُھپتا ہوا اچھا لگتا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا، لیکن میرے دل میں ایک بہت بڑی گنڈیری پھنس گئی تھی۔ ہم نوکروں والی جیسے لنگر نہیں ہوتا پانی میں پھینکنے والا، ویسی! اور وہ لڑکی بھی اتنی خوبصورت تھی اشفاق جی کہ بندے کا رونا نکل جائے اس کو دیکھ کر۔ اس کی آمد پر سب لوگ چائے پینے والے، سارے مرد عورتیں دم سادھ کر خاموش ہو گئے تھے اور کوئی اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے سر پر سُرمئی مخمل کے چاند نے آگی فرکی ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹوپی کافی ٹیڑھی تھی۔ اس کا ناک نقشہ تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا چہرہ اب بھی نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

میں جلدی جلدی لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس ایجنسی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنا سامان اٹھایا اور سامنے کھڑی چھوٹی لاری میں سوار ہو کر پنڈی پہنچ گیا۔ ایک رات پنڈی ہوٹل میں بسر کی اگلے دن لاہور آ گیا اور یہاں آ کر اپنی چھٹی کینسل کروا دی۔ اس طرح میں کون روز روز روتا پھرے اور لوگوں کے سامنے ذلیل ہوتا رہے۔ دیکھو خاں جی! پندرہ دن تک تو اس نے نظر آتے ہی رہنا تھا بار بار ایک ہی تو سڑک ہے ساری مری میں۔ تو میں نے کہا بھاگو بھائی۔ تو جی بھاگ آیا۔ دیکھو خاں! اشفاق جی! اپنی دل بستگی کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھیک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھیک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں!"

اب جمیل نزدیک آ رہی تھی اور ہم لوگوں کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس وقت ہم منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ مسعود، عماد کا بازو پکڑے اس کے ساتھ ساتھ سر دھنتا جا رہا تھا کہ "واہ! اپنے عشق کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھیک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھیک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر بازو پھیلائے نظر آتے ہیں ـــ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام؟ اور جب وہ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام!" کہتا تو لفظ فقیر پر ایسے لرزتی تھی جیسے پرانے زمانے کی لمبی گت والی لڑکی پینگ میں اپنی رانوں کی طاقت سے جھلارا بھر رہی ہو۔ فقیروں کا کیا کام! فقیروں کا کیا کام!! ہیں عشق! فقیروں کا کیا کام... جس نے ظاہر ہی کر دیا وہ فقیر کہاں رہا ــــ کیوں اعظمی! وہ آدمی تو تنکے سے بھی ہولا ہو گیا۔ منصور نے اظہار کر کے ہی تو مار کھائی۔ سُولی پر چڑھ گیا۔ یار کا بھید کھول دیا۔ اور بھید کھولنے کی یہی سزا ہے۔ کیوں عماد! ہے کہ نہیں سزا؟ بولو یار و!

عماد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا... کہ جب لوگ درخت سے آنے والی اِنِّیْ اَنَا اللّٰہ کی صدا کو جائز قرار دیتے ہیں، تو منصور حلاج کے منہ سے نکل جانے والے "اَنَا الْحَق" پر گرفت کیوں کرتے ہیں۔ لیکن جو منصور کو ملحد ساحر اور زندیق کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں اور جو اس کو عالمِ ربانی سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

جس روز منصور حلاج کو پھانسی دی جانی تھی، اُس روز صبح سے ہی لوگ مقتل کی طرف روانہ

ہونے لگے تھے اور دوپہر تک سارا بغداد اُمڈ کر مقتل گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ سہ پہر کے قریب بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر منصور کو مقتل کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں لوگ آللّٰہ اَکبَر اور آ للّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ کے نعرے لگا رہے تھے اور مجرم پر پتھر پھینک رہے تھے۔ کنکریاں مار رہے تھے منصور کے دونوں طرف دو سپاہی اس کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد لپیٹے چل رہے تھے اور تیسرے سپاہی نے اس کے بالوں کو پیچھے سے اپنے چنگل میں جکڑ کر اس کا منہ آسمان کی طرف اٹھایا ہوا تھا۔ راستے میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانی سمندر کی وجہ سے مجرم اور اس کے نگران بڑی آہستگی سے چل رہے تھے اور ان کو رک رک کر آگے سے راستہ صاف کرانا پڑتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جس روز حسین منصور حلاج کو قید میں ڈالا گیا، اُس روز لوگوں نے دیکھا کہ رات کے وقت منصور وہاں موجود نہیں تھے۔ دُوسری شب نہ منصور موجود تھے نہ بندی خانہ اور تیسری شب میں بڑے آرام کے ساتھ بیڑیاں پہنے ہوئے اپنی کوٹھڑی میں موجود تھے۔ جب لوگوں نے وجہ پُوچھی تو فرمایا کہ پہلی شب تو میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر تھا اور دُوسری شب حضورؐ خود یہاں تشریف فرما تھے۔ لوگوں نے پُوچھا پھر آج یہ واقعہ کیوں نہیں گزرا۔ فرمانے لگے۔ اب مجھے شریعت کے تحفظ کے لیے واپس بھیج دیا گیا ہے کہ میں قرار واقعی سزا پاؤں اور شریعت میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو۔

قیدخانے میں آپ کے علاوہ تین سو اور قیدی بھی موجود تھے۔ منصور نے کہا: "کیا چاہتے ہو کہ تم کو اس جیل سے رہا کر دوں اور تمہارے مقدر میں آزادی لکھ دوں"؟ تو قیدیوں میں سے چند ایک نے ایک ساتھ آواز بلا کر کہا: "ہم بدنصیبوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی"؟ آپ نے ایک اشارہ کیا تو سب قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں، پھر اشارہ کیا تو تمام قفل ٹوٹ گئے۔ پھر آپ نے قیدیوں سے فرمایا: "جاؤ ہم نے تمہیں رہا کیا" اور جب قیدیوں نے آپ سے التجا کی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا: "میرے اور میرے آقا کے درمیان ایک راز وابستہ ہے جو سُولی پر چڑھے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ گو میں اپنے آقا کا قیدی ہوں لیکن شریعت کی پاسداری بھی نہایت ضروری ہے اور میں شریعت پر کسی قسم کی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا اس لیے مجبور ہوں۔ ہمارے آقا کا حکم پہنچا بے نازل ہے اس لیے میں ٹھہر گیا"۔

جس وقت منصور حلاج اور اس کے نگرانوں کا طائفہ سُولی سے تھوڑی دُور رہ گیا تو شمال کی جانب سے گرم سرخ آندھی اٹھی اور اس نے بغداد کے آسمان پر منجمد ہو کر اپنی نگاہیں نیچے خلقت پر مرکوز کر دیں۔ اب تیسرے سپاہی نے ان کے بالوں سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا اور ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ منصور اپنی گردن گھما کر اس ہجوم غفیر کو دیکھنے لگے اور حسرت نگاہیں پھیر کر حق حق حق۔ اَنَا الحَق کہنے لگے۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر پُوچھا: "منصور! عشق کسے کہتے ہیں؟"

منصور نے ہنس کر کہا: "آج کل اور پرسوں میں تجھے معلوم ہو جائے گا"۔

جب سُولی کا چبوترہ قریب آ گیا تو آپ کے خادم نے روتے ہوئے وصیت کے متعلق عرض کیا، تو فرمایا: "اپنے نفس کو تمام علائق دُنیا سے خالی کر لے، ورنہ نفس تم کو ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیرے بس کی نہ ہوں گی"۔

جب آپ کے صاحب زادے نے آگے بڑھ کر وصیت کی درخواست کی، تو فرمایا: "ساری دُنیا نیک چلن اور اعمالِ صالحہ کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن تجھے علمِ حقیقت حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ علمِ حقیقی کا ایک نکتہ بھی تمام اعمالِ صالحہ پر بھاری ہوتا ہے"۔

اس کے بعد آپ شاداں اور فرحاں گنگناتے اور لٹکتے ہوئے سُولی کی طرف بڑھے، تو قریب کھڑے لوگوں نے پُوچھا: "اس قدر مسرور کیوں ہو؟"

کہنے لگے: "اس سے زیادہ مسرت کا وقت اور کون ہو سکتا ہے جب میں اپنی منزل پہ پہنچ رہا ہوں اور محبوب کے سامنے جا رہا ہوں"۔

سُولی کے چبوترے کی سیڑھیوں پہ قدم رکھتے ہوئے آپ نے ذرا جھک کر اپنی عبا کے کنارے سے سیڑھیوں پہ جھاڑ دی، پھر چبوترے پہ آئے اور آگے بڑھ کر اس پھندے کو بوسہ دیا جس میں پھندا لٹک رہا تھا۔ لوگوں نے اونچی آواز میں پُوچھا: "اپنے موافقوں اور مخالفوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "میرے موافقوں کو کم از کم ایک اجر تو ضرور ہوگا کہ وہ مجھ سے حُسنِ ظن رکھتے تھے، لیکن میرے مخالفوں کو دو ثواب حاصل ہوں گے کہ وہ قوتِ توحید میں اور شریعت پاک میں سختی

سے خائف رہتے ہیں۔ اور اس شہر کے لوگو! کان کھول کر سن لو کہ شریعت میں اصل شے توحید ہے اور جو وحدانیت سے سرِمو انحراف کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔"

اس وقت حضرت شبلیؒ نے بڑی عاجزی سے پوچھا: "تصوف کس کو کہتے ہیں؟"

فرمایا: "یہ جو تم دیکھ رہے ہو، یہ تصوف کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔ کیونکہ اعلیٰ ترین درجے سے تو کوئی واقف ہی نہیں۔ ہماری تو یہاں تک پہنچ کر روح فنا ہو جاتی ہے۔" پھر فرمایا: "خدا کی یاد میں دنیا و آخرت کو فراموش کر دینے والا ہی واصل الی اللہ ہوتا ہے اور خدا کے سوا ہر شے سے مستغنی ہو کر عبادت کرنا فقر ہے اور صوفی اپنی ذات میں اسی لیے واحد ہوتا ہے کہ نہ تو وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ اس سے کوئی واقف ہوتا ہے۔"

پھر فرمایا: "حکمت ایک تیر ہے اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہے اور مخلوق اس کا نشانہ ہے۔"

جب لوگوں نے پوچھا کہ سب سے بڑا اخلاق کیا ہے؟

تو آپ نے فرمایا: "سب سے بڑا اخلاق جفائے مخلوق پر صبر کرنا اور اللہ کو پہچاننا ہے جس طرح بادشاہ ہر لمحہ ہوسِ ملک گیری میں مبتلا رہتے ہیں، اسی طرح ہر لمحہ ہم مصائب کے طالب رہتے ہیں۔"

پھر زمین کی طرف نظریں جھکا کر کہنے لگے: "ذاتِ خداوندی جس پر منکشف ہونا چاہتی ہے، تو ادنیٰ سی شے سے لے کر اس پر منکشف ہو جاتی ہے، ورنہ اعمالِ صالحہ کو بھی قبول نہیں کرتی۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ جب تک صبر نہ کیا جائے تو عنایت حاصل نہیں ہوتی اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے سُولی پر چڑھا دیا جائے تب بھی اُس کے منہ سے اُف تک نہ نکلے۔"

اس کے بعد جلاد کے کہنے پر لوگوں نے آپ کو سنگسار کرنا شروع کر دیا جس کو آپ نہایت خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ جب جلاد کے اشارے پر لوگ سنگباری سے رُکے اور اُس نے آگے بڑھ کر شمشیرِ آب دار سے ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے، تو خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ لوگوں نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ تو آپ نے نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا کر سرگوشی میں شکریہ ادا کیا۔ پھر خون بہاتی کلائیوں کو چہرے پر پھیر کر نظریں اونچی کیں اور کہا: "میری سرخروئی اچھی طرح سے مشاہدہ کر لو، کیونکہ خون جوانمردوں کا اُبٹن ہوتا ہے۔"

اس کے بعد خون آشام کلائیوں کو کہنیوں تک پھیرتے ہوئے فرمایا کہ میں نمازِ عشق کے لیے وضو کر رہا ہوں، کیونکہ نمازِ عشق کے لیے خون سے ہی وضو کیا جاتا ہے۔

پھر جلاد نے آنکھیں نکال کر زبان کاٹنے کا قصد کیا تو حلاج نے فرمایا: "ٹھہرو! مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔"

پھر اونچی آواز میں بولے: "اے اللہ! میرے ہاتھ تیری راہ میں قطع کر دیے گئے۔ آنکھیں نکال دی گئیں اور اب سر بھی کاٹ دیا جائے گا، لیکن میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ثابت قدم رکھا۔ اب میں تیرے حضور ایک التجا کرتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بھی وہی دولت عطا فرما جو مجھے عطا فرمائی ہے، کیونکہ یہ سب شریعت کی حفاظت کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور شریعت کی حفاظت ہر حال میں بے حد ضروری ہے۔"

پھر جب دوبارہ سنگساری شروع ہوئی، تو آپ کی زبان پر یہ کلمات تھے: "واہ وا ـــ سبحان اللہ! یکتا کی دوستی بھی یکتا کر دیتی ہے۔"

کسی بزرگ نے مشائخین سے فرمایا کہ جس رات منصور کو دار پر چڑھایا گیا تو میں صبح تک سُولی کے نیچے مشغولِ عبادت رہا۔ جس وقت دن نمودار ہوا، تو ہاتفِ غیب نے یہ ندا دی: "ہم نے اپنے رازوں میں سے ایک راز کو اس پر مطلع کر دیا تھا، جس کو اس نے ظاہر کر کے یہ سزا پائی۔ اور یہ درست ہوا کیونکہ ہمیشہ ہی راز کو افشا کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

اور مسعود پوچھ رہا تھا: "کیوں یارو! ... بولو! ... بتاؤ! ... بھید کھولنے کی سزا ہوتی ہے یا نہیں ... کیوں حماد! ... کیوں مفتی! ... بشارت بھائی!"

لیکن ہم اس کی بات کا جواب دیے بغیر سر جھکائے چل رہے تھے، کیونکہ ہمارے پاس نہ کوئی راز تھا نہ افشا تھا نہ سزا تھی۔

آسمان کے اوپر چڑھتی بادلوں کی گہری تہہ تھی اور اس کے نیچے دھند کا طوفان سا آیا ہوا تھا۔ حماد ابھی تک غصے میں تھا اور اس سے ابھی طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ مسعود بھی بڑبڑا رہا تھا اور مفتی بھی شکایت کر رہا تھا۔ میرے دل پر بھی بڑا بھاری بوجھ تھا، لیکن میں خاموش تھا۔ مفتی ہم سب کو تسلی دینا چاہتا تھا، لیکن اس کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ کوہستانی ہم سب کو اس حالت میں

دیکھ کر اندر سے خوشی کا اظہار کر رہا تھا اور اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے سامنے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کی گردن اس کے بائیں کندھے پر لگی ہو اور اس کا چہرہ ہماری طرف پیمن پن کر اُٹھا ہُوا ہو۔

عماد نے ایک مرتبہ پھر تڑپ کر کہا "کیا تھا! مر جاتے! ڈوب جاتے! غرق ہو جاتے!"

"دیر ہو رہی تھی۔" لیڈر نے کہا۔ "اور اندھیرے میں راستہ بھول جانے کا اندیشہ تھا۔ مجبوری تھی عماد!"

"راستہ بھول جاتے تو کیا قیامت آ جاتی راستہ بھول کر؟" مسعود نے غراتے ہوئے کہا۔ "اب نہیں راستہ بھول سکتے!"

"ابھی تو روشنی ہے اور واپس ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے کم و بیش اسی طرح رہے گی۔" لیڈر نے جواب دیا۔ "اور ہم گرم پانی کی بالٹیوں میں نمک ڈال کر کچھ دیر اپنی تھکان دور کر سکیں گے۔ وہاں بیٹھے تو بہت دیر ہو جاتی مسعود!"

"اور نہیں تو کس رہا تھا کر رات یہیں گزار لیتے ہیں۔" عماد نے کہا۔

"اور ہم نے جو وہ کوٹھڑی دیکھی تھی جس کے اندر اخبار بچھے تھے۔" عظمیٰ نے کہا۔

"تو پھر اس نے روک دیا ہاں بھائیو!" منّی نے اپنی سواری کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس نے، تمہارے اس کوہستانی نے۔"

"بالکل ٹھیک روکا صیب! اُدھر رات کے وقت نہیں ٹھہرا کرتے صیب۔ اِدھر پری لوگ اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔ نہ پوچھیں تو بالکل نہ پوچھیں۔ سالوں سال گزر جائیں۔ اگر غار بند کر دیں اور کوئی کے آگے کھڑا کلام پڑھ دیں... تو... بس... پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"اوئے چھوڑ یار... پریاں۔" عماد نے جل کر کہا۔ "دیکھی ہوئی ہیں میری... یہ پریاں!"

"میرا اندازہ ہے۔" مسعود بولا۔ "ہم بمشکل ڈیڑھ گھنٹہ تک اور وہاں رُک سکتے تھے اور ایک پون گھنٹے میں بڑی آسانی سے واپس اپنی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ اب تو ڈھلان ہی ڈھلان ہے۔"

منّی نے کہا: "میرے لیے تو ہر دولت ہے۔ اس وقت واپس نیچے کو جاتے ہوئے میری دونوں جانگھوں کے اندر ان خوابیدہ پٹھوں کو کھنچ پڑنے لگی ہے جن پر گزشتہ ستائیس سال سے کسی قسم

کا بوجھ نہیں پڑا تھا۔"

مسعود نے کہا "دیکھا خوبصورت نیلا کلر تھا ٹھنڈے پانیوں کا۔"

"نہیں صیب نیلا نہیں تھا۔" کوہستانی نے کہا۔ "بجلی سلیٹی تھا۔ پریوں کے ملک کا پانی ہمیشہ بجلی سلیٹی ہوتا ہے۔"

"اچھا بھلا ایک ریسٹ ہاؤس بھی تھا وہاں۔" عماد نے غصے اور غم کے لہجے میں تقریباً رو کر کہا۔

"وہ ہے صیب پر اس کا دروازہ نہیں کھلتا۔"

"کیوں؟ دروازہ کیوں نہیں کھلتا اس کا؟" عظمیٰ نے پوچھا۔

"بس جی! نہیں کھلتا صیب! کوئی اللہ کی حکمت ہے۔"

"تو اس میں کوئی نہیں ٹھہرتا؟" عظمیٰ نے پوچھا۔

"ٹھہرتا ہے صیب! ٹھہرتا کیوں نہیں... جب بنایا ہے تو ہر ایک ٹھہرتا ہے۔"

"اس کو چھوڑ و یار!" منّی نے اپنی کنپٹی پر انگلی بجا کر کہا۔ "ہی از نٹس۔"

"تم پہلے بھی کبھی یہاں آئے ہو خان؟" عماد نے پوچھا۔

"ہاں جی صیب! سارے لوگ آتے ہیں۔"

"سارے لوگ کی بات چھوڑو۔" مسعود نے کہا۔ "اپنی بتاؤ — تم اس سے پہلے بھی کبھی یہاں آئے ہو بجلی سلیٹی پانی دیکھنے کہ آج ہمارے ساتھ ہی آئے ہو؟"

"ہاں جی!"

"اوئے ہاں جی کوئی جواب ہے بدبخت!" لیڈر نے جل کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے بھی کبھی یہاں آئے ہو کہ نہیں!"

"آتے ہی رہتے ہیں صیب!"

"تم آئے تھے کہ نہیں؟"

"کس کے ساتھ صیب؟"

"کسی کے ساتھ ضروری نہیں — اِدھر آئے تھے کہ نہیں؟ کسی کے ساتھ یا اکیلے!"

"ادھر تو سب ٹولی ٹولی میں آتا ہے صیب!"

"تم بھی ٹولی میں آیا تھا؟"

"ہاں جی!"

"یا اکیلا آیا تھا؟"

"اچھا جی!"

اعظمی نے کہا: "یار کیوں اپنا دماغ خراب کرتا ہے اور ساتھ ہمارا بھی۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ ہم کیا پوچھ رہے ہیں!"

"اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟" منتی نے جھلا کر کہا۔

عماد نے کہا: "ابھی تھوڑی دیر اور وہاں بیٹھ لیتے تو کیا ہو جاتا۔ چاندنی رات تھی، اگر ہم دس گیارہ بجے کے بعد بھی چلتے تو بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچ جاتے، لیکن اس بد اصل لیڈر نے ہمیں کچھ دیکھنے بھی نہ دیا!"

مسعود نے کہا: "اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ وہاں کیا تھا اور کون کس طرف تھا اور کون سی جگہ، کہاں تھی، تو میں کچھ بھی نہ بتا سکوں گا۔"

"اتنے قریب پہنچ کر بھی قربت کا احساس نہ ہو منتی، تو کتنا بڑا خلا رہ جاتا ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "یہ ہم سب کو ہو کیا گیا تھا بھلا؟"

"کچھ نہیں ہوا تھا، بس اس لیڈر نے تباہ کیا۔" عماد بولا۔ "میں تم لوگوں سے کہہ رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ ابھی نہ جاؤ، ابھی نہ جاؤ، لیکن تم نے میری سنی ہی نہیں۔ منتی جی بھی لیڈر کے پیچھے لگ گئے چھوٹے بچے کی طرح۔"

"میری کون سنتا ہے بھائی۔" منتی نے کہا۔ "مجھے کون پوچھتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" مسعود نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "مجھے تو یقین نہیں آرہا... اور اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا..." پھر وہ تھوڑی دیر رک کر بولا۔ "تم کو وہ اخبار کہاں دکھائی دیے تھے؟"

"کون سے اخبار؟" اعظمی نے پوچھا۔

"وہی جو تم نے کھوہ میں بچھے دیکھے تھے؟"

"کون سی کھوہ؟" اعظمی نے پوچھا۔

"وہی جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے۔"

"میں نے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔" اعظمی سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں شاہ جی!" مسعود نے میری طرف گھوم کر کہا۔ "اس نے ابھی کہا نہیں تھا کہ ایک کھوہ کے اندر اخبار بچھے تھے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے کوہستانی بول اٹھا:

"اس صیب نے کیا تھا ذکر! لیکن جی میں نے نہیں دیکھا کچھ اخبار وخبار... مجھے تو معلوم بھی نہیں کھوہ کدھر تھا!"

"تم ہمارے ساتھ نہیں تھے؟" عماد نے پوچھا۔

"میں تو ہر وقت ساتھ ہوتا ہوں صیب!" کوہستانی نے کہا۔ "ہم تو مزدور آدمی ہے جی.. خدمت کرنے والا... ہم تو صیب لوگوں کے پیچھے پیچھے رہتا ہے ہر وقت۔"

"لیکن اس وقت تو تم نہیں تھے جب ہم ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔" اعظمی نے کہا۔

"ہم تو دیکھ رہا تھا ناں صیب!" کوہستانی نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم تو نہیں تھے ہمارے ساتھ جب ہم چابیاں ٹرائی کر کے دیکھ رہے تھے۔" مسعود ذرا تلخ لہجے میں بولا۔

"نہیں صیب! ہم دیکھ رہا تھا، بالکل دیکھ رہا تھا صیب! اس صیب کی چابی سب سے اچھی لگی تھی۔" اس نے عماد کی طرف اشارہ کیا۔ "تھوڑا کسر رہ گیا تھا گھسنے میں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" عماد نے چونک کر پوچھا۔

"ہم نوکر آدمی ہے صیب، خدمت کرنا ہمارا کام ہے۔"

"لیکن تم وہاں موجود تو نہیں تھے خان!" عماد نے مزید حیران ہو کر کہا۔ "ہم نے تو تم کو ارد گرد نہیں دیکھا تھا۔"

"آپ کیسی باتیں کرتا ہے صیب! ہم تو آپ لوگوں کا خادم ہے... ہم کدھر جائے گا جی!"

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ حضورؐ کا جُبّہ مبارک اور گودڑی لے کر حضرت اویس قرنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے عرض کی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہم یہ ملبوسِ مُطہر لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ اپنے آقا و مولا کا حکم بجا لانے کو ہم یہاں پہنچے اور مقامِ فخر ہے کہ ہم نے اپنی ان آنکھوں سے اور اتنا قریب سے آپ کی زیارت کی۔

سرتاجِ عاشقاں حضرت اویس قرنی اس وقت اُونٹ کے بالوں کا ایک لبادہ سا کرتہ پہنے تھے۔ وہ اپنی بھیڑوں کا گلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی جھاڑی میں چھوڑ کر ان خوش بخت سفیروں کی پذیرائی کو آ گئے تھے۔ انہوں نے سرمایۂ عظیم کو اس کی بہا ساری کائنات میں کہیں بھی نہ تھی، پہلے اپنے ماتھے سے لگایا، پھر اپنی آنکھوں سے اور پھر دیر تک اسے چومتے اور اس پر اپنی پیشانی ملتے رہے، حتیٰ کہ وہ مبارک گدڑی آنسوؤں سے تراریز ہو گئی۔

پھر آپ نے اس متاعِ گراں بہا کو اپنی کہنیوں تک سینے سے چمٹا لیا۔ ایک مرتبہ پھر اس صاحبِ سترِ گدڑیہ نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر دستِ خیبر شکن ان میں لے لیا اور اپنے کپکپاتے ہونٹوں سے اسے بوسے دیتا رہا، پھر اسی طرح اُنہوں نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنا ماتھا اس پر رکھ دیا۔

کافی دیر تک یہ تینوں عاشق ایک مثلث کے نقطوں پر آمنے سامنے اسی طرح ساکت اور جامد کھڑے رہے اور صحرا کی باریک بھوری اور شفاف ریت اُن کے درمیان سے گزرتی رہی۔

پھر یمن کے عاشق نے سر اُوپر اُٹھایا اور مدینے کے سفیروں سے پوچھا:

”آپ تو محبوبؐ کے قریب رہے ہیں اور بہت ہی قریب رہے ہیں اور دن رات قریب رہے ہیں۔ مجھے یہ فرمایئے کہ حضورؐ کے ابروئے مبارک کس انداز کے تھے؟“

جاں نثارانِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ادب سے خاموش رہے۔

پھر سرتاجِ عاشقاں نے حضورؐ کے چہرۂ اقدس کی تفصیلات بیان کرنا شروع کیں اور رفیقانِ رسولؐ وہیں کھڑے کھڑے چہرہ مبارک ملاحظہ فرماتے رہے۔

جب آپ خاموش ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے جرأت کر کے پوچھا:

”سیدنا! آپ تو حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں تشریف نہیں لا سکے۔ اور آپ نے تو انہیں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا، پھر آپ کس طرح ان کے رُخِ مبارک کے خدوخال کی تفصیلات بیان فرما رہے ہیں؟“

حضرت اویس نے اپنی سفید لمبی داڑھی جُبّہ مبارک سے ملتے ہوئے کہا:

”آپ حضرات نے حضورؐ کو ہونے تک کے مقام پر دیکھا۔ ہم اور میں نے نہ ہونے کے مقام پر محبوب کی خدمت میں اپنی رُوح کو حاضر رکھا ہے۔ آپ خوش نصیب تھے کہ نعمت ہر وقت آپ کے رُوبرو تھی، ہم دُور تھے اور قُرب کی دید سے محروم تھے اور خوش نصیب اور محروم میں یہی فرق ہوتا ہے کہ محروم ہر وقت نعمت کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور اس کے لیے حریص رہتا ہے۔ نہ ہونے کے مقام پر دیکھنے والے کی صرف آنکھیں ہی نہیں دیکھتیں اس کا سارا وجود طلب بن جاتا ہے۔“

مفتی کہہ رہا تھا:

”یار! تم لوگوں نے کیا کھیڑا ڈالا ہوا ہے... کیوں بچوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ کسی نے تمہارا امتحان تو نہیں لینا کہ کیا دیکھا اور کیا نہیں دیکھا۔ کسی نے انٹرویو تو نہیں کرنا!“

”انٹرویو تو نہیں کرنا مفتی جی، لیکن کم از کم وہاں بیٹھے تو سہی۔ قریب ہو کر۔“ عمار نے کہا۔

”تمہارا خیال ہے قریب ہو جانے سے گیان حاصل ہو جاتا ہے۔ دید ہو جاتی ہے؟“ مفتی نے سٹر کر کہا۔ ”آگہی مل جاتی ہے؟“

”اور ایسے ہی لوٹ آنے سے چھٹکارا مل جاتا ہے؟“ مسعود نے کہا۔ ”فوٹو پرنٹ مل جاتا ہے!“

”تم لوگوں کی دوڑ فوٹو پرنٹ سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔“ مفتی نے چلا کر کہا۔ ”تم لوگوں کے ذہنوں پر فوٹو سٹیٹ کا قبضہ ہو گیا ہے، اور فوٹو سٹیٹ مشین نے ہم سب پر کشف کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ اس نے ہمیں حق الیقین کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ جتنی جتنی ایک شہر میں فوٹو سٹیٹ مشینیں بڑھتی ہیں اُسی قدر وہاں مس ٹرسٹ بڑھتا ہے۔ بے اعتمادی بے تیزی اور بے اعتمادی بڑھتی ہے۔ لوگوں کے اندر شک پیدا ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کی مصدقہ نقل مانگتے

ہیں اور جہاں شک پیدا ہو جائے وہاں خوف کے پنجے اور گہرے گڑ جاتے ہیں۔ کیوں تم ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر تسلی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیوں یہ سمجھتے ہو کہ... اگر کسی وجہ سے...“

مسعود نے منشی کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔ اس کو بھی غصہ آ گیا اور غصے کے ساتھ اس کی زبان بھی کھل گئی۔ اس نے لڑک کر کہا:

”اس لیے کہ امپیریکل میتھڈ کا تقاضا یہی ہے۔ سائنٹیفک طریق ہے یہی۔ آنکھوں سے دیکھے بنا اور قریب سے دیکھے بنا اور غور سے دیکھے بنا کوئی کس طرح سے مان سکتا ہے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔“

”اوئے گدھو! کتو! اوئے بے حیاؤ!!! شرم کرو“ منشی نے کہا: ”جب تم کوئی چیز آنکھ سے دیکھتے ہو، تو کہنے لگتے ہو، یہ تو نظر کا دھوکا ہے۔ اشتباہِ نظر ہے۔ یہ چوبیس ساکن فریم فی سیکنڈ گزر رہے ہیں، تو پردہ سیمیں پر تصویر متحرک دکھائی دیتی ہے، نہیں تو ساکن ہے۔ یہ جو ٹی وی سکرین پر رنگ دار لڑکی بیٹھی ہے، لڑکی تو نہیں، چھ سو پچیس لائنیں ہیں، بہت سے نقطے ہیں، چھوٹے چھوٹے نکتے، لڑکی تو نہیں۔ آسمان میں دن کے وقت تارے نظر نہیں آتے، تو تارے ہیں ہی نہیں... لعنت ہو تم پر... گویا جس چیز کا تمہیں مشاہدہ نہیں وہ ہے ہی نہیں۔“

منشی کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ بڈھے بیل کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے غصے اور کرب کو دیکھ کر کوہستانی منشی کے قریب آ گیا اور انگلی اٹھا کر کہنے لگا:

”بالکل ٹھیک سیب! شاباش... آپ بالکل ٹھیک کہتا ہے، سولہ آنے... شاباش!!“

منشی نے چڑ کر کہا:

”اچھا اچھا خان! ٹھیک ہے، مہربانی، شکریہ۔“

لیڈر نے سوٹی اوپر اٹھا کر کہا:

”واپسی پر ہر ہر ممبر کو سالوبل اسپرین کی ایک ایک گولی، ملٹی وٹامن کا ایک کیپسول اور وٹامن سی کی ایک ایک گولی کھانی ہو گی۔ یہ ڈرل ابھی سے سن لو۔ کھانا کھانے کے بعد بتائی گئی گولیاں۔ گولیوں کے بعد نمک اور سرکہ ملے گرم پانی میں پنڈلیوں تک ٹانگیں ڈبو کر بیٹھنا اور اس

کے آدھ گھنٹہ بعد رضائی لپیٹ کر اور منہ باہر نکال کر سو جانا۔ اور صبح جب تک میں نہ اٹھاؤں لیٹے رہنا۔“

ہم میں سے ہر ایک نے لیڈر کی ہدایات کو بغور سنا۔ لیکن اسے یہی امپریشن دیا کہ کسی نے اس کی بات نہیں سنی اور کسی نے اس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔

مسعود عماد کی کہنی پکڑے اس کے ساتھ گھسر پھسر کرتا جا رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا:

”جو شخص بغیر کسی ایڈ کے یا آلے کے یا فنی سہارے کے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کر لے، اور اس کو آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جائے وہ صاحب حال ہوتا ہے۔ وہی زمانے کی آنکھ کا تارا بن کر چمکتا ہے اور اسی کو اقبال نے رموزِ بے خودی میں کہا ہے... کہ... اگر...“

لیکن اس بے چارے کا فقرہ بیچ میں رہ گیا جب منشی نے کڑک کر کہا:

”کیا بک رہا ہے، کیا سمجھا رہا ہے اور کس کو سمجھا رہا ہے اور کیوں غلط سمجھا رہا ہے؟“

”میں صاحب حال کی بابت بتا رہا ہوں منشی!“ مسعود نے خفت ٹالتے ہوئے کہا: ”وہی جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے...“

لیکن منشی نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی اور گرج کر کہا:

”تجھے کیا پتہ صاحب حال کیا ہوتا ہے۔ تجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا بیٹا کدھر ہوتا ہے اور چلا ہے صاحب حال کی بابت سمجھانے۔“

”شاباش!“ اعظمی نے چہک کر کہا۔ ”سالا لوگ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ایک صاحب حال ساتھ جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے راستہ روشن ہے۔ مگر یہ خواہ مخواہ میں جھگڑ رہا ہے بدبخت لوگ... دیکھو تو“ اس نے منشی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”دیکھو کون جا رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ذرا غور تو کرو۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔“

”تم بھی بکواس بند کرو اعظمی“ منشی نے جھڑک کر کہا: ”اور اس میراث گیری سے ہم کو نجات دو۔ بہت کچھ سن لیا ہم نے تم سے۔ ناؤ شٹ اپ۔“

لیڈر بونے کی طرح سوٹی سے اپنی کمر کھجا رہا تھا اور بے چین تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے

قدرے بلند آواز سے کہا:

"تم بتاؤ شاہ جی! تم تو بزرگانِ دین کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کے دعوے کرتے رہے ہو۔ تم سمجھاؤ۔"

"اس کو کیا پتہ دست بستیے مُلاکو" مفتی نے کہا۔ "یہ تو بھیڑ چال کا ایک لیلا ہے جو تبلیغی لگوانے کے لیے اپنی پشم پال رہا ہے اور بزرگوں سے گیٹ پاس لے کر اٹرول کے بعد جنت میں جانے کے پلان بنا رہا ہے۔"

"مستو!" مفتی کڑک کر بولا۔ "صاحب حال کوئی بزرگ نہیں ہوتا۔ کوئی پہنچا ہوا ولی یا کوئی صاحب کرامت پیر نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ کسی خاص مقام پر ہوتا ہے۔ بیٹھ کر اور آسن جما کر۔ بلکہ وہ ہونے اور نہ ہونے کے مقام سے یکساں طور پر گزر رہا ہوتا ہے۔ صاحب حال میرے ساتھیو! صاحب مشاہدہ نہیں ہوتا کہ تم اسے بزرگ سمجھنے لگو۔ نہ ہی اس پر کوئی واردات گزر رہی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی وہ کسی خاص تجربے کا نمونہ ہوتا ہے۔"

مفتی کی یہ بات سُن کر ہم سب کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ہم اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"صاحب حال کوئی مٹی کا مادھو نہیں ہوتا۔ جذبات سے عاری بے ضرر یا بے آزار، لنڈورا سا انسان! وہ ایک بیدار شخص ہوتا ہے! چوکس، خبردار، ہر وقت موجود، ہر آن حاضر! اس کی راہ میں نام و نمود، عزت و شہرت، حیثیت و منصب۔ کچھ بھی حائل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ سب چیزیں تو اس کے راستے کی دھول ہوتی ہیں جن پر چل کر وہ حال تک پہنچا ہوتا ہے۔ وہ تو بڑا گرم مزاج، تند خو اور کٹیلا ہوتا ہے۔ پنجہ مار کر دھکیلنے پلٹنے والا نیروبی کا شیر۔ تیسری آنکھ سے دیکھنے والا اینٹا سنت زرافہ۔ یہی تو وجہ ہے کہ صاحب حال پہنچے ہوئے لوگوں اور صاحب کرامت بزرگوں کو ہمیشہ ناگوار گزرتا ہے۔"

ہم اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت ہو گئے اور ہمیں یاد بھی نہ رہا کہ ہم کون سی جگہ پر کھڑے تھے اور اس وقت کیسا سماں تھا۔

مفتی کہہ رہا تھا:

"صاحب حال صرف ان لوگوں کو نظر آتا ہے جو بکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جنھوں نے گل سمجھ لی ہوتی ہے اور جن کے اندر کا رولا مٹ چکا ہوتا ہے۔ صاحب حال کسی دوسرے آدمی سے مختلف نہیں ہوتا اور ہو بھی کیوں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ دوسروں سے مختلف نظر آنے کے لیے کچھ نمایاں خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی خصوصیات جن پر کٹ سے نظر پڑے۔ جھٹ سے چونکائیں اور اپنی طرف متوجہ کریں، لیکن صاحب حال میں نظر آنے والی تو کوئی خوبی ہوتی ہی نہیں اور چونکہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی، اسی لیے وہ صاحب حال ہوتا ہے۔"

ہم سب نے نظریں گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، تو مفتی نے کہا:

"وہ تو ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے اس نے زندگی سے کچھ سیکھا ہی نہ ہو۔ اس سے ہر طرح کی حماقت سرزد ہو سکتی ہے۔ وہ ہر طرح کی ناتجربہ کاری کا، نادانی کا مستحق ہو۔ بے شعور، سادہ لوح اور سادہ خاطر ہو۔ ہر کمی اور ہر کوتاہی کا شکار نظر آتا ہو اور معمولی بے معنی اور لایعنی کا صحیح ادراک رکھتا ہو۔ اصل بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو کہ معمولی، ادنیٰ، لاشے اور لا امکان ہی حقیقت ہے اور بے حقیقتی ہی اصل اور لبِ واقعہ ہے۔ جس چیز کا تت نکالو گے اور جس قدر گہرے جاؤ گے، آخر میں اُس کے معمولی، ادنیٰ اور حادث ہونے کا یقین ہی حاصل ہوگا۔ جس قدر گمبھیر آواز میں اعلان کرو گے، اُسی قدر ناپائیدار، سرسراتی، آنی جانی اور منمنی آواز میں ہی جواب ملے گا۔ اور میرے پیارے دوستو! حقیقتیں کوئی آسمان کے تارے نہیں ہیں، وہ بھی معمول اور حادث کی حاصل ضرب ہی ہیں۔ بے حقیقتی کی جمع تفریقیں ہی ہیں۔" مفتی بتا رہا تھا۔ "حقیقت کا کوئی خصوصی منصب نہیں ہوتا۔ کوئی شاندار کلغی نہیں سجا ہوتا اس کے سر پر۔ چپکے کے آگے کسی قسم کا "باادب باملاحظہ ہوشیار!" نہیں ہوتا۔ سیدھا تو بس معمول اور لایعنی اور آنی جانی کی گونج ہوتا ہے اور یہی آگہی رکھنے والا شخص صاحب حال ہوتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ صاحب حال کی تلاش مشکل ہے۔ یہ کیسا ملتا نہیں اور جب پتا نہیں تو اس کے ہاتھ پر بیعت کس طرح سے کی جا سکتی ہے۔ اس کے نقش قدم پر چلتے جا سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے استفادہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟"

ہم سب نے چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہمیں پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان کوئی صاحبِ حال موجود ہے جس کا علم ہونا مشکل ہے۔ میرے دل کے قطب نما نے اپنی سُوئی عابد، زاہد، نمازی، تہجد گزار عمّار کی طرف پھیر دی اور مجھے وہاں سے سگنل کی ایک 'ٹوئیٹ' مل بھی، لیکن مفتی نے پھر کہنا شروع کر دیا:

"مسٹر نصیبو! صاحبِ حال کوئی رُوحانی آدمی نہیں ہوتا۔ نیک، نمازی، پرہیزگار، کوئی مذہبی پیشوا یا مجدد پرستش۔ نہ وہ فلسفی ہوتا ہے نہ معلمِ اخلاق۔ نہ تو تارک ایک چڑھا مرشد ہوتا ہے۔ نہ اصول، قانون اور ضابطے کا پابند مولانا! اس کے ہاں کوئی شے طے شدہ نہیں ہوتی۔ وہ کسی ایک محور پر قائم نہیں ہوتا۔ اس کی سُوئی کسی جگہ اٹکی ہوئی نہیں ہوتی۔ کبھی تو وہ اس بات کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے جسے اُس نے دھونس دھاندلی سے ہر ایک کو منوایا ہوتا ہے اور کبھی اس بات کو ماننا شروع کر دیتا ہے جس سے وہ عمر بھر منحرف رہا ہوتا ہے۔ صاحبِ حال ہماری تمہاری طرح سے کوئی مفید اور کار آمد شخص نہیں ہوتا۔ بس ایک شخص ہوتا ہے جو ہونے کے ناطے سے ہوتا چلا جاتا ہے۔"

عمّار اور مسعود دونوں شک کی نظروں سے انگلی کی طرف دیکھ رہے تھے اور مفتی کہہ رہا تھا:

"صاحبِ حال کی تعلیم میں ہر طرح کا کوڑا کرکٹ اور گند پس بھرا ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم میں وہ دانش ہوتی ہے جو حادثے ہو ختم ہو چکی ہو۔ ہر فانی اور بے بنیاد اور گزراں شے ہی اس کی دانش ہوتی ہے اور چونکہ وہ سچ کی نمائندگی نہیں کرتا۔ حق بات نہیں کہتا، سچ کی تعلیم نہیں سکھاتا۔ اس لیے اُس کا وجود ہر شخص کو آگہی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اس کو گل سمجھنے پر لگتا ہے اس کے اندر کا رولا مٹاتا ہے۔ اس کا وجود ہر اس راستے کو جھٹلاتا ہے جس پر لوگ حق، حقیقت، اصول، اُدرش اور نظریات کے جھنڈے لے کر چل رہے ہوتے ہیں۔"

پھر مفتی نے سر سے پاؤں تک لیڈر کو دیکھا اور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ ہم سب نے بھی اسی طرح لیڈر کو دیکھا اور ہمارے اندر ایک نئی دریافت نے جنم لیا۔ مفتی بڑے بامعنی انداز میں ہنسا اور کہنے لگا:

"صاحبِ حال ایک راہزن ہوتا ہے، ایک لٹیرا، ایک ورغلاؤ چھلیا، مجذوب، دغا باز، باصفا مردِ حق آگاہ، سادھو، جوندرو، ٹھڈھو، تجربات کا نچوڑ، راست قدم ڈاکو، رحم دل قاتل، نو عمر شہزادہ، پنگھوڑے کا لال، ایک عابد، زاہد، جوگی، راہب، بھوکا، یاتری، بنجارا، دیوتا روپ، دیوتا سمان، ایسا دیوتا جو ہر گھڑی ہر شے کی بے اختیاری، لاچاری اور بے اثری اور بے مقدوری کا الکھ جگاتا ہے اور تمہاری نابھی پوچھتا ہے کہ تم کل کیوں نہیں سمجھتے۔ آگہی کیوں نہیں حاصل کرتے۔ تم نے اس قدر دیکھا، اس قدر بھالا۔ ایسے ایسے مشاہدے کیے پھر بھی کورے کے کورے رہے۔ پھر بھی آگہی حاصل نہ کر سکے...... افسوس... صد افسوس... ہائے... ہائے... ہائے!"

اس وقت میرے ساتھیوں اپنی سوالیہ نظروں سے مجھے گھیر لیا اور میرے اُوپر ایکس ریز پھینکنے لگے۔

مفتی نے ان کے عمل کو پہچان کر کہا:

"صاحبِ حال ہر کسی کا دل رکھتا ہے۔ ہر ایک کے نخرے اُٹھاتا ہے، ہر ایک کا رانجھا راضی کرتا ہے، لیکن بڑائی نہیں دیتا۔ کسی کو ڈاہی نہیں دیتا۔ اور جو کسی کو بڑائی نہ دے، ڈاہی نہ دے، وہی محبوب ہوتا ہے اور چونکہ صرف اس کو آگہی ہوتی ہے، اس لیے اس سے بڑا محبوب اور کون ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ وہ بہت ہی بڑا محبوب ہوتا ہے اس لیے کسی کو اس کے دیکھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی اور چونکہ ذات کا سارا معاملہ خبر کا ہے اس لیے اس کے مشہور ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ خلق کا سارا معاملہ راحت کا ہے، اس لیے وہ نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ لیکن دوستو!" مفتی نے انگلی اُوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا۔ "صاحبِ حال جب بھی تمہارے سامنے آئے گا، سلام کرنے سے پہلے مسکرائے گا ضرور! تم زندگی میں پہلی مرتبہ اس مسکراہٹ کا نوٹس لو گے۔ تمہیں یُوں لگے گا۔ جیسے پہلے کی سب چیزیں فنا ہو چکی ہیں۔ ہر شے مسمار ہو گئی ہے اور ایک نئی دُنیا جنم لے رہی ہے۔ ایک دُوسری دُنیا۔ نئی خوشبو اور نئے رنگ کی دُنیا۔ ایسی دُنیا جسے سمجھنے کے لیے ایک گرو، ایک ہادی، ایک صاحبِ حال کی ضرورت ہے۔ اشد ضرورت... ! اور چونکہ سارے معاملات ضرورت بنتے ہیں

اس لیے ہر طرف تاریک ہے۔ جہاں ضرورت ہے وہاں اندھیرا ہے۔ جہاں احتیاج ہے وہاں اندھیرا ہے اور جہاں تاریکی ہے وہاں آگہی نہیں اور جب آگہی نہیں، تو صورتِ حال واضح نہیں اور جب کوئی صورت نہیں تو حال کیا ہونا ہے اور جب حال نہیں، تو صاحبِ حال کہاں سے ہو۔ صاحبِ حال نہ ہو تو اس سے ملاقات کس طرح سے ہو۔

پھر منشی نے بڑے تلخ لہجے میں کہا:

"خبردار! جو تم میں سے کسی نے صاحبِ حال کو بزرگ کہا یا صاحبِ کرامت، صاحبِ نظر و پیر، اولیا کہا... خبردار!"

پھر بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی اور ہم سب کو اپنے درمیان کسی صاحبِ حال کی موجودگی کا یقین ہو گیا۔ ایک دوسرے کے چہروں کو جانچ کر اور اُس کے اندر کی گہرائیوں کو دیکھ کر ہم کو ایک اندازہ سا ہونے لگا تھا کہ "وہ" ہم میں سے کون ہے۔ ایک عجیب طرح کا کرب ہمارے درمیان پھیلا ہوا تھا جیسے دردِ زہ شروع ہونے سے پہلے خوفزدہ لڑکی اُڑی چارپائی پر لیٹ گئی ہو اور اُس کی پنڈلیاں پھیل گئی ہوں۔ labou pai

ہم سب بے حس و حرکت خالی خولی زمین پر بیٹھے تھے اور ہمارے سامنے چھ سات قدم کے فاصلے پر کوہستانی ایک پتھر سے ٹیک لگائے جنگلی جھاڑیوں کے پتوں سے پٹاخے چلا رہا تھا۔ وہ جھاڑی سے ایک پتہ توڑتا، اُس کو اپنے بائیں ہاتھ کی کھڑی مٹھ پر رکھ کر اُوپر سے زور سے دوسرے ہاتھ کا دھپا مارتا۔ چٹاخ سے پتہ ٹوٹتا اور کھڑی مٹھی کے پاس سے گُٹک کی چھوٹی سی آواز نکلتی۔ کوہستانی خوش ہوتا اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھتا۔

ہم سب ایک دُوسرے کے اندر بہت گہرے اُتر کر ایک دُوسرے کے اندھیروں میں یہ تلاش کر رہے تھے کہ ہم میں سے صاحبِ حال ہے کون؟ ہے ضرور لیکن پتہ نہیں چلتا۔ اور ہے بھی موجود، لیکن پکڑائی نہیں دے رہا... ڈاہی نہیں دے رہا... گرفت میں نہیں آ رہا...

لیکن ہے ضرور...

آدسچ!
جگادسچ!
ہے بھی سچ!
نانک ہوسی بھی سچ!

بانو قدسیہ

ناول ○ ایک دن ○ پروا ○ شہرِ بے مثال ○ موم کی گلیاں ○ راجہ گدھ

افسانے ○ دوسرا دروازہ ○ ناقابلِ ذکر ○ بازگشت ○ امربیل

○ کچھ اور نہیں ○ آتش زیرپا

ڈرامے ○ آدھی بات ○ دوسرا قدم ○ حوا کے نام ○ سورج مکھی ○ تماثیل

○ فٹ پاتھ کی گھاس ○ سدراں

تاثرات ○ مردِ ابریشم (قدرت اللہ شہاب)

اشفاق احمد

افسانے ○ صبحانے افسانے ○ پھلکاری ○ ایک محبت سو افسانے ○ اجلے پھول ○ سفر مینا

ڈرامے ○ بند گلی ○ طوطا کہانی ○ ایک محبت سو ڈرامے ○ اور ڈرامے ○ حیرت کدہ

○ ننگے پاؤں ○ ٹاہلی تھلے ○ اُچے برج لہور دے

سفرنامہ ○ سفر در سفر

www.sang-e-meel.com

RS: 225.00

ISBN: 969-35-0823-8

9789693 508239